چند انتظامی دشواریوں کے پیشِ نظر ایقاظ کی اشاعت موقوف کی جارہی ہے، قارئین نوٹ فرمالیں

ماہنامہ

ایقاظ

لاہور

ربیع الثانی تا رمضان 1437ھ
الموافق فروری تا جولائی 2016

عالم اسلام پر مسلط اِس جنگ کو سمجھنے کی ضرورت

کسی مضبوط مسلم مملکت کو پنپتا چھوڑنا استعمار کے لیے ناقابلِ برداشت کیوں؟

ہمارے مشائخ نے اِس 'پوسٹ کولڈ وار' جنگ کو بہت جلد سمجھ لیا تھا

کوئی وجہ ہے کہ مشائخ ''جہاد'' کو مسلم مقبوضہ خطوں کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں

شدّت پسند اور جدّت پسند.. دو خوفناک بیانیے

کیا تکفیری طے کریں گے، مرجئہ کون ہیں؟

اسلامی تحریکی عمل میں بہتری.. چند سفارشات

حامد کمال الدین

یکے از نشریات جاوید فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) (رجسٹریشن نمبر RP/189)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مطیع الرحمن نظامی کی شہادت... ظلم اور بربریت کی ایک صریح داستان۔ اِس حق پرست امت کی تاریخ میں گو یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ خونِ مسلم کی ارزانی کے بیان کو کسی کے پاس آج الفاظ نہیں رہ گئے۔

مسلم بے بسی ہی نہیں، مسلم بے حسی بھی آج آپ اپنی زبان ہے۔ حلب سے لے کر بنگلہ دیش تک.. مسلمانوں کا خون ہی خون۔ ناحق۔ سراسر ناحق۔

ظالموں اور بدکاروں کا کوئی آج دندناناد دیکھے.. عالمی رائے عامہ کے زیر تماشا، جو کُتوں اور بِلیوں کے حقوق کے لیے تو چیخ پڑتی ہے، لیکن مسلم خون کی ندیاں گویا کوئی واقعہ ہی نہیں!

عالمی رائے عامہ ہی کیا، مسلم رائے عامہ کیا کم ہے! پاکستان کی سالمیت کے لیے قربانیاں دینے والے مظلوم و مقہور 'سابقہ پاکستانیوں' کے حق میں اپنی اِس پاکستانی رائے عامہ ہی کو دیکھ لیں، جو اس بھاڑے کے میڈیا کے ہاتھوں یرغمال ہو چلی۔

متاعِ کارواں ہی نہیں، احساسِ زیاں پر بھی ڈاکہ پڑ چکا!

برادرانِ اسلام۔ گڑ گڑا کر خدا کا دروازہ کھٹکھٹانے کا وقت ہے۔

ایک شہید کا جانا پوری امت کو زندگی دے سکتا ہے، اگر احساس سلامت ہو۔ لیکن یہاں اتنا خون دیکھ کر بھی معمولات میں شاید ہی کوئی فرق آتا ہو۔ عزائم کو شاید ہی کوئی مہمیز ملتی ہو۔ خدا کی جانب توجہ میں شاید ہی کچھ اضافہ ہوتا ہو۔ اپنے کردار کو امت کے حق میں مفید اور مؤثر بنانے کی شاید ہی کوئی سنجیدہ اسکیم بنتی ہو۔ اپنے روز و شب جیسے تھے ویسے رہے، اگرچہ روز اتنے بڑے بڑے سانحے ہوتے رہیں۔ ہم میں سے اکثر کا حال شاید یہی ہے۔ خدا کے ساتھ معاملات کو بہتر کر لینا امت کے دن پھرنے کا ایک یقینی موجب ہو سکتا ہے۔

بھائیو اور بہنو! امت، میں اور آپ ہیں۔ اِس کا حشر جو ہو رہا ہے وہ ہم دیکھ چکے، اور دو صدیوں سے دیکھتے آرہے ہیں۔ خدائی میزان میں امت کی اِس حالت کے لیے تو شاید یہی ہے، جب تک کہ اس کو بدل نہ دیا جائے.. ایک ایسی امت کے ساتھ جو جہان میں مار کھانے کے لیے نہیں بلکہ جہان پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھے۔ بخدا ہم میں سے ہر شخص امت کو، اس مطلوبہ حالت میں آجانے کے لیے، کم از کم ایک فرد دے سکتا ہے۔ مطیع الرحمن نظامی کی شہادت پر اور کچھ نہیں تو چلیے امت کو یہی دیں۔ جاتے شہید پر رونا طبعی عمل، مگر اُس سے زندگی مستعار لینا کہیں ضروری ہے۔

سید قطبؒ کے وہ زندہ اشعار مطیع الرحمٰنؒ کی شہادت پر بار بار ذہن میں گونجنے لگے:

أخي إن ذَرَفتَ عليّ الدموع ، وبلَّلتَ قبري بها في خشوع

فأوقِد لهم من رُفاتي الشموع ، وسيروا بها نَحوَ مجدِ تليد.

”میرے بھائی! تم اگر مجھ پر آنسو بہاؤ، اور میری قبر کو اشکوں سے تر کر دو (تو بھی میرا کہنا یہ ہے کہ) میری ہڈیوں کے ریزے سے تم ان کے لیے وہ مشعلیں بنا دو جن کی روشنی میں تم (تمام امت) اپنی آبائی عظمت کی سمت جادہ پیما ہو سکو“۔

خدایا! ایک شہید جاتا ہے تو سارے ہی شہید یاد آ جاتے ہیں!

اللهم تقبَّلْهُم، وارحمهم، واجمعنا بهم في فسيحِ جَنَّاتِك۔

*****

قارئینِ کرام!

چند انتظامی دشواریوں کی بنا پر ایقاظ کی اشاعت فی الحال موقوف کی جا رہی ہے۔ حالیہ شمارہ فروری تا جولائی کے لیے ہے۔ جن حضرات کا پورے سال کا زرِ اشتراک ہمارے پاس آ چکا، وہ اگر پسند فرمائیں تو ان کے بقیہ پانچ ماہ کے زرِ اشتراک کے مقابل ان کو ہماری عنقریب آنے والی تالیف ”مختصر اقتضاء الصراط المستقیم“ بھیجی جا سکتی ہے۔ یا اس کے مقابل وہ ہم سے مطبوعاتِ ایقاظ کی کوئی اور تالیف طلب فرما سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر ہم انہیں ان کا پانچ ماہ کا زرِ اشتراک واپس کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ آپ بذریعہ ڈاک یا ای میل ہمیں اپنے ارادے سے مطلع فرما سکتے ہیں۔ براہِ کرم نوٹ فرمالیجئے: فون یا ایس ایم ایس کے ذریعے آپ کا آرڈر لینے میں بعض انتظامی دشواریاں ہمیں پیش آ سکتی ہیں، لہٰذا ہم سے رابطہ کے لیے ای میل یا سادہ ڈاک کا ذریعہ ہی استعمال کیجئے۔ رابطے کے سرنامے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

رابطہ بذریعہ ای میل: matbooateeqaz@gmail.com

رابطہ بذریعہ فیس بک: https://www.facebook.com/matbooat.eeqaz

رابطہ بذریعہ ڈاک: Post Box No. 10262. Lahore

سوشل میڈیا پر ہماری تحریرات و دیگر اپ ڈیٹس دیکھتے رہنے کے لیے:

https://www.facebook.com/MudeerEeqaz/

https://twitter.com/Hamidkamaluddin/

https://www.facebook.com/eeqaz/

نہیں ہو سکتا

اسلام کے پاس تو ہو صرف مسجد

جبکہ سیکولرزم کے پاس سکول، یونیورسٹی، عدالت، ریڈیو، ٹی وی، صحافت، تھیٹر، سینما، معیشت، سٹریٹ، ایوان، غرض پوری انسانی زندگی کی کنجیاں !!!

(شیخ یوسف القرضاوی)

موضوعات

ربیع الثانی تا رمضان 1437 –الموافق– فروری تا جولائی 2016

کتاب کا سبق : قرآنی مجالس

٣ نبوت اور کتاب کا چیلنج ٦

مشکاۃ : مجالس حدیث

٤ بھلی بات، ورنہ خاموش ١٦

اما بعد : اہلِ دین کی صف بندی.. چند اوجھل پہلو ادار یہ ١٧

٥ عالم اسلام پر مسلط اِس جنگ کو سمجھنے کی ضرورت ٢٠

٦ کافر کی جنگ کا پہلا محور: مسلمان کو جغرافیائی اکائی کے طور پر ختم کر ڈالنا ٢٢

جن دینداروں کو معاملے کی اس جہت پر تعجب ہے ٢٤

صلیبی آپ کے صرف ’آج‘ کو نہیں دیکھتا ٢٦

چند مسلم ممالک اتنی سی طاقت بھی کیسے حاصل کرسکے؟ ٢٩

ہمارے مشائخ نے اس ’مابعد سرد جنگ‘ کو بہت جلد بھانپ لیا تھا ٣٣

اصل مقصد ’انیسویں صدی‘ کے سینار یو کی جانب ایک جزوی واپسی! ٣٨

کسی مضبوط مسلم مملکت کو پنپتا چھوڑنا استعمار کے لیے ناقابل برداشت کیوں؟ ٤٠

حالیہ صلیبی مہم: مسلم اکائیوں کا چُورا کرنا ٤٢

کوئی وجہ ہے کہ مشائخ ’’جہاد‘‘ کو مسلم مقبوضہ خطوں کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں ٤٧

پاکستان کے دینی حلقے اپنی تاریخ کے بدترین بحران میں ٥٠

قادیانی اور جدت پسند ’انکارِ جہاد‘ انیسوں صدی والے پنجرے کا ’شرعی‘ دروازہ ٥٣

٧ کافر کی جنگ کا دوسرا محور: مسلمان کو تہذیبی واقعے کے طور پر ختم کرنا ٦١

٨ ’’قوموں‘‘ کو لے کر چلنا ’تحریکوں‘ کو لے کر چلنے سے مختلف ہے ٧٦

٩ اسلامی تحریکی عمل میں چند جذری ترمیمات۔ سفارشات ٨٥

نظریۂ انقلاب پر ایک نظر ثانی کی ضرورت ٨٦

’’دعوت‘‘ اور ’’سیاسی سرگرمی‘‘ کو الگ الگ کردیں۔ ٩٤

شعبہ ہائے حیات میں جڑیں بنانے کا عمل فی الوقت سیاست سے بھی اہم ٩٨

’’دعوت‘‘ کو سامنے لانے کا طریقہ یہ ہوگا کہ.. ١٠١

شدت پسند ڈسکورس کو اسلامی پیراڈائم سے بیگانہ ٹھہرانا ١١٨

مسئلہ ایک جماعت کو ’دوشعبے‘ کر دینے سے بڑھ کر ہے ١٢٣

مالک بن نبیؒ کا دیا ہوا ایک مبحث "معاشرتی جہت" تحریکی فکر میں شامل مضمون کرانا ١٢٦

مضامین :

۱۰	کیوں وہ کہتے ہو جو کرتے نہیں؟	مریم عزیز	۱۴۲
۱۱	تکفیر اور عدم تیسیر کا یہ ڈسکورس ظلم بھی اور جہالت بھی	حامد کمال الدین	۱۴۶
۱۲	کیا تکفیری طے کریں گے، مرجئہ کون ہیں؟	حامد کمال الدین	۱۶۱
۱۳	تاریخ کو آگے بڑھانے کیلئے ذہبیؒ اور ابن کثیرؒ کا ڈسکورس	مدیر ایقاظ	۱۹۵
۱۴	کلاسیکل منہج اور انقلابی منہج کا فرق	حامد کمال الدین	۱۹۹
۱۵	مار دھاڑ اور جدت پسند بیانیے.. اور انقلابی منہج کی فرسٹریشن	حامد کمال الدین	۲۱۸
۱۶	کیا معاشرے کو 'اوپر' سے ٹھیک کرنا تھا یا 'نیچے' سے؟!	حامد کمال الدین	۲۳۳
۱۷	جدیدیت و مابعد جدیدیت	امتیاز عبد القادر	۲۴۷

احوال و تعلیقات :

۱۸	یہ کس کی بیٹی ہے؟	ابن علی	۲۶۲
۱۹	23 مارچ "مسلمان" کے طور پر اپنی شناخت کرانے کا دن	مدیر ایقاظ	۲۶٤
۲۰	23 مارچ (قراردادِ پاکستان) پر لبرلز کی خوشی بنتی ہے؟	مدیر ایقاظ	۲۷۲
۲۱	اسلامک ری پبلک آف گیمبیا	محمد زکریا خان	۲۷٤
۲۲	'میری کرسمس'.. مقاصدِ شریعت یا قربِ قیامت؟	مدیر ایقاظ	۲۸۰
۲۳	سماجی مومنٹم اٹھانے کی فکر کیجئے، آپکے پاس بڑی قوت ہے 1	مدیر ایقاظ	۲۸۵
۲٤	سماجی مومنٹم اٹھانے کی فکر کیجئے، آپکے پاس بڑی قوت ہے 2	مدیر ایقاظ	۲۸۸
۲۵	یہ سب کچھ.. اور ابھی فتویٰ نہیں لگایا!	مدیر ایقاظ	۲۹۱

تنقیحات : از مدیر ایقاظ

۲٦	مفتی تقی عثمانی کی ایک عبارت پر اعتراض کا جائزہ	۲۹٦
۲۷	مفتی کاکاخیل کے ایک شاگردِ رشید کی فرمائش پر	۳۰٤
۲۸	اپنے زمانے کے فتنوں سے آگاہ ہونے کا کیا طریقہ ہے؟	۳۱۰
۲۹	عقیدۂ سلف تک رسائی؟	۳۱۲
۳۰	عقیدۂ سلف سے اعراض.. دہشتگردی و جدت پسندی	۳۱۷
۳۱	لفظ "عقیدہ" سے الرجک.. یا فکری رعونت؟	۳۲۰
۳۲	"دعوت کا منہج" کتاب سیاستہ شرعیہ کو ڈیل نہیں کرتی	۳۳۰
۳۳	اسلامی جمعیت طلبہ پر کڑی تنقید؟	۳۳۳
۳٤	ایماندار افسر اور ناجائز مقامات کی سیکورٹی - ایک اشکال	۳۹
۳۵	امام شافعیؒ کا ایک قول، درست سیاق میں رکھنے کی ضرورت	۳٤٦
۳٦	ہمارے حدی خواں حالی، اقبال اور نسیم حجازی	۳٤۸

فرقے :

۳۷	ہیومن ازم اپنی برہنہ صورت میں	ابن علی	۳۵٤
۳۸	"مستورات" ایک سماجی جبر.. سوشیالوجسٹ کی وحی	مدیر ایقاظ	۳۵۵
۳۹	عدتِ شرعی 'ڈی این اے' کے سنک میں!	حامد کمال الدین	۳٦۲
٤۰	رائٹ ونگ کے نوجوان لکھاریوں کو 11 مشورے	بشکریہ عامر خاکوانی	۳٦۵
٤۱	جدید فتنۂ انکارِ حدیث.. خدشات، اسباب اور تدارک	علی عمران	۳۷۱
٤۲	علاماتِ قیامت.. علمائے سلف کو چھوڑ کو بونوں سے علم لینا	حامد کمال الدین	۳۷۹
٤۳	قادیانیت کا دوسرا رخ	حامد کمال الدین	۳۸٤

نئی تالیف : اقتِضَاءُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْم مولفہ امام ابن تیمیہ۔ اردو استفادہ: حامد کمال الدین

٤٤	حصہ چہارم	**مسلمانوں میں در آنے والے اہل کتاب کے بعض خصائل**	۳۸٦
٤۵	فصل 24	علم اور ہدایت ایسی نعمتوں پر دوسروں سے حسد	۳۸۷
٤٦	فصل 25	علم کا بخل اور حق کا کتمان	۳۸۸
٤۷	فصل 26	شخصیت پرستی میں انکارِ حق	۳۸۹
۳۸	فصل 27	وحیِ خداوندی میں تحریف	۳۹۱
٤۹	فصل 28	مخلوق ہستیوں کو خالق کے ساتھ جا ملانا	۳۹۲
۵۰	فصل 29	پیشوا شخصیات کی اطاعت میں غلو	۳۹۳
۵۱	فصل 30	رہبانیت	۳۹۵
۵۲	فصل 31	قبروں پر عبادت گاہیں اور تعمیرات	۳۹٦
۵۲	فصل 32	صداکاری اور صورت پرستی ہی دین ٹھہرا	۳۹۸
۵٤	فص 33	اپنے گروہ کے سوا ہر کسی کو ہیچ جاننا	۳۹۹
۵۵	فصل 34	کتاب کے ایک حصے کا دوسرے سے رد کرنا	٤۰۱
۵٦	فصل 35	اختلاف و تفرقہ	٤۰٤
۵۷	فصل 36	فتنۂ زن و زر؛ جس کے ہاتھوں پہلی امتیں ہلاک ہوئیں	٤۰۹
۵۸	فصل 37	دلوں پر کلامِ خداوندی کی ہیبت جاتی رہنا	٤۱۱
۵۹	فصل 38	کفار سے یارانے۔ نیز امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑ بیٹھنا	٤۱۵
٦۰	فصل 39	حدود قائم کرنے میں، کمزور اور طاقتور کی تفریق	٤۱۷

ایمان کا سبق : حامد کمال الدین

٦۱	زہد کی بابت ایک غلط فہمی کا ازالہ	٤۲۱
٦۲	'دنیا' کی مذمت' سلف کے ہاں کس معنیٰ میں؟	٤۲٦

نبوت اور کتاب کا چیلنج

مجالس قرآنی

کتاب کا سبق

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (البقرة : 23، 24)

اور اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ اور اللہ کے سوا جس قدر تمہارے حمایتی ہوں بلالو اگر تم سچے ہو۔

لیکن اگر (ایسا) نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور جو) تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ :

(پچھلی دو آیات میں) لا الٰہ الا اللہ کی تقریر فرمادینے کے بعد اب (اِن دو آیات میں) اللہ رب العزت نبوتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر فرما رہا ہے۔ عَلَىٰ عَبْدِنَا سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن کی سورتوں جیسی ایک سورت تم لا کر دکھا دو؛ اور اس کے لیے جن جن کو مدد کے لیے بلانا چاہو بلالو۔ کھلا چیلنج ہے۔

یہ چیلنج مکی قرآن میں بھی کئی مقامات پر دیا گیا (یہاں ابن کثیر کچھ ایسے مقامات کا ذکر کرتے ہیں)۔ یہاں مدینہ آنے کے بعد (کہ جب یہود بھی معاندین کے طور پر سامنے آ چکے تھے) ایک بار پھر یہ چیلنج دیا گیا۔

(قرآن مجید نبی ﷺ کا خصوصی معجزہ ہونے کے حوالے سے) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ نَبِيٍّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ إِلَّا قَدْ أُعْطِيَ مِنَ الْآيَاتِ مَا مِثْلُهُ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ، وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللَّهُ إِلَيَّ، فَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

انبیاء میں سے کوئی نبی ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی معجزہ ایسا نہ دیا گیا ہو جسے دیکھ کر بشر ایمان لے آیا کریں۔ تاہم مجھے جو (معجزہ) دیا گیا وہ ایک وحی ہے جو اللہ نے میری طرف فرمائی۔ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ میرے پیروکار قیامت کے روز سب سے زیادہ ہوں۔

سعدی رحمۃ اللہ علیہ:

رسول اللہ ﷺ کے سچا ہونے پر ایک عقلی دلیل۔ آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کے حق ہونے کی ایک واضح برہان۔ چنانچہ فرمایا: اے وہ لوگو جو رسول ؐ کی مخالفت پر کمربستہ اور اس کی دعوت کو رد کرنے اور اس کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہو! ہم نے اپنے اِس بندے پر جو دین اتارا اس کو مشکوک ٹھہرانا اگر تمہاری اتنی بڑی ترجیح ہے تو آؤ ایک انصاف کی بات کر لیتے ہیں اور اسی پر تمہارا اور اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ وہ بھی تم جیسا ایک بشر ہے؛ کسی اور مٹی کا تو بنا ہوا نہیں ہے۔ تمہارے سامنے پلا بڑھا اور جوان ہوا۔ یہیں ساری زندگی گزاری۔ تمہاری اِسی برادری میں اس کا رہن سہن۔ یہ تمام عرصہ نہ کبھی اس نے لکھا اور نہ پڑھا۔ یکلخت یہ علم و حکمت سے لبریز ایک

کتاب تمہارے پاس لے آیا ہے اور اس کو مالکِ کائنات کی تنزیل ایک الہامی کلام کے طور پر تمہارے سامنے پیش کرنے لگا ہے؛ جس پر تم نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ تو یہ اپنے پاس سے گھڑ لایا اور محض خدا پر جھوٹ باندھ ڈالا ہے۔ تو بات اگر ایسی ہی ہے جیسا کہ تمیں زعم ہے تو ایسا کرو: اس جیسے الہامی کلام پر مبنی ایک سورت تم بھی گھڑ کر دکھا دو؛ اور اس کے لیے تم اپنے جتنے اعوان و انصار سے مدد لینا چاہو وہ بھی لے لو۔ پھر یہ کام تمہارے لیے تو اور بھی آسان ہونا چاہئے؛ کیونکہ تم تو ادب اور فصاحت کے آسمان پر ہو اور رسولؐ کو جھوٹا کر دکھانا تمہاری ایک اتنی بڑی خواہش بھی ہے! لہٰذا اس جیسی اگر ایک بھی سورت تم لے آؤ تو تم اپنے زعم میں سچے۔ ہاں اگر تم اس بات سے اپنے آپ کو عاجز پاؤ ___ اور یقیناً تم اس سے عاجز ہی رہو گے، یہ بھی ہم پہلے ہی بتائے دیتے ہیں، یہ تو ہم نے محض ازراہِ انصاف اور چھُوٹ دینے کی ایک بات کے طور پر تمہیں پیش کش کی ہے ___ تو پھر یہ ایک عظیم نشانی ہوئی اور ایک واضح دلیل کہ یہ شخص جسے کبھی پڑھنے لکھنے سے سروکار نہیں رہا واقعتاً سچا ہے اور یہ جو بات پیش کر رہا ہے اور جن باتوں سے تمہیں ڈرا رہا ہے وہ بھی سچ ہیں۔ اِس صورت میں واجب یہ ٹھہرا کہ تم اس کی پیروی کر لو۔ تمہارے حق میں تب بہتر یہی ہو گا کہ اس کے پیچھے چل کر اپنے آپ کو اُس دہکتی آگ سے بچا لو جس میں جلتے ہی انسان اور پتھر ہیں: تمہاری آگ کی طرح وہ کوئی عام لکڑیوں سے جلائی جانے والی آگ نہیں۔ دیکھو وہ آگ تپا تپا کر رکھی گئی ہے انسانوں کی اُس صنف کے لیے جو خدا اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرنے تک چلی جاتی ہو۔ لہٰذا اِس نبیؐ سے تصادم چھوڑ کر بہتر یہ ہے کہ تم اپنے بچنے کا بندوبست کرو؛ جبکہ تم پر یہ واضح ہو چکا کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہی ہے۔

یہ اور اس قبیل کی آیات کو آیاتِ تحدّی کہا جاتا ہے۔ یعنی چیلنج پر مبنی آیات۔ اِعجاز یا تعجیز (عاجز ٹھہرانا) اس بات سے کہ کوئی مائی کا لال اِس قرآن جیسا کوئی قرآن لا کر دکھا دے۔ اِسی کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ فرمایا: قُل لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡإِنسُ وَالۡجِنُّ عَلَىٰٓ أَن يَأۡتُوا

بِمِثْلِ هَـٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (الاسراء: 88)

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنالائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کو مددگار ہوں"۔ ہر وہ شخص جو کلام کی اصناف سے ادنیٰ واقفیت اور ذوق رکھتا ہو جب وہ بلاغت کے دیگر مرقعوں کا موازنہ اِس کلامِ قرآنی سے کرتا ہے، تو وہ کبھی ان کا فرق محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔

نسفی رحمۃ اللہ علیہ:

یعنی پچھلی دو آیات میں خدا نے اپنے بے مثال تخلیق دکھلائی اور اِن دو آیات میں اپنی بے مثال تنزیل۔ اُدھر معبوداتِ باطلہ کا عاجز ہونا؛ ایسی تخلیقات کر سکنے سے۔ اِدھر ان معبودات کے پوجنے والوں کا عاجز ہونا؛ ایسا الہامی کلام اور ایسی کتابِ ہدایت پیش کرنے سے۔ اُن کائناتی نشانیوں میں خصوصی ذکر بارانِ رحمت کا ہوا تھا جو زمین پر زندگی کا منبع بنتی ہے اور برگ وبار لانے کا واحد ذریعہ۔ اِدھر اس آسمانی بارش کا ذکر ہوا جو قلوب میں زندگی اور ہریالی لے آنے کا موجب ہے۔

*****

شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّـهِ

ابن کثیر: ابن عباسؓ سے: یعنی اپنے تمام مددگاروں کو۔ سدیؒ عن ابی مالکؒ: یعنی اپنے ان شریکوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ مجاہدؒ سے: یعنی اپنے ان منصفوں کو جو تمہارے حق میں فصاحت کا مقابلہ جیت لینے کا فیصلہ کریں۔

بیضاوی: شہید کا مطلب حاضر: یعنی جسے پیش کیا جا سکتا ہو۔ یا گواہی دینے والا۔ یا نصرت کنندہ۔ یا امام ورہبر۔ یہ سب شہید کے مطالب ہیں۔

إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ

قرطبی: اگر تم سچے ہو اپنے دعویٰ میں، جو قرآن میں ایک دوسرے مقام (الانفال:31)

پر بیان بھی ہوا: قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَـٰذَا ''کہتے ہیں یہ کلام ہم نے سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی کہہ دیں''۔

وَلَن تَفْعَلُوا

قرطبی: یہ ایک مزید چیلنج ہوا۔ ان کی ہمتوں کو ایک بار مزید جھنجھوڑا گیا کہ وہ ایک ایسا الہامی کلام لاکر دکھائیں۔ پھر پیشگی بتا بھی دیا کہ ایسا کوئی کام وہ کر ہی نہیں پائیں گے۔ صاف غیب کی ایک خبر؛ ایک پیشین گوئی؛ جو ہُو بہُو پوری ہوئی۔ پس یہ ایک نہیں دو معجزے ہوئے۔ اس سے ان کی عاجزی اور بے بسی اور بھی نمایاں ہوئی۔

فَاتَّقُوا النَّارَ

بغوی: یعنی ایمان لے آکر اپنے آپ کو دوزخ سے بچالو۔ ایسی زبردست ڈھال ہے یہ قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لانا۔

قرطبی: یعنی نبیؐ کی تصدیق اور خدا کی اطاعت اختیار کرکے۔ سلامتی کی واحد صورت۔

وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

یعنی اس میں انسان اور پتھر جلتے ہیں۔ اس کی خوفناکی کا بس اندازہ کرلو۔

بغوی: ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین کا کہنا ہے: یہ گندھک کے پتھر ہیں جو بھڑکنے میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ ایک اور تفسیر: یعنی دنیا جہان کے پتھر اس کے اندر بھڑک اٹھیں گے؛ جس سے اس کے ہولناک ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک اور تفسیر: مراد ہے مشرکین کے بت جو زیادہ تر پتھروں کے ہی بنے ہوئے تھے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا: إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) ''تم اور تمہارے معبود جہنم ہی کا ایندھن ہو''۔

طبری: عبداللہ بن مسعودؓ سے: سیاہ گندھک کے پتھر۔

قرطبی: گندھک کے پتھر جن میں پانچ خصوصی وصف ہیں: بھڑک اٹھنے میں تیز، بدبو

میں ناقابل برداشت، دھواں دینے میں سخت، بدن سے چپک جانے میں شدید، اور جب ایک بار تپ جائے تو کسی بھی دوسرے ایندھن سے بڑھ کر گرمی دینے والا۔

قرطبی مزید کہتے ہیں: اس آیت میں ایک تخویف ہے: کہ اُس آگ کے لیے انسان کیا چیز ہے جو پتھروں کو بھسم کر جائے۔ اُس سے تو بس اللہ کی پناہ۔

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ

طبری: یعنی پچھلی آیات میں جو بات گزری اس کو نہ ماننے والوں کے لیے ایسی دوزخ ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ: تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کرنے والا تنہا و یکتا اللہ ہے اور تمہیں اُس ایک کی عبادت کرنی ہے۔ تنہا اُسی نے زمین کو تمہارا بچھونا اور آسمان کو تمہارے کے لیے چھت بنایا اور تنہا اُسی نے آسمان سے باران اتار کر اور اس سے میوے اور اناج اگا کر یہاں زندگی کا سامان کیا (تاکہ تم اُس کی عبادت کرو)۔ اور یہ لگے اُس کے ساتھ شرک کرنے اُس کی عبادت میں؛ زمین میں اُس کے ہمسر کھڑے کر کے۔

طبری و ابن کثیر: عبد اللہ بن عباسؓ سے: یعنی ایسے کافروں کے لیے جو تمہارے کفر جیسے کفر پر ہوں۔ یہ دہکائی گئی ہے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کر کے آنے والوں کے لیے۔

ابن کثیر: یہ دلیل ہے اہل سنت کے اِس اعتقاد پر کہ دوزخ کی تخلیق انجام پا چکی ہے۔ اس پر ابن کثیر کچھ احادیث بھی لے کر آتے ہیں۔

اعجازِ قرآن کی بابت چند مزید باتیں:

صحیحین کی حدیث پیچھے گزر چکی۔ رسول اللہ ﷺ کا سدا بہار معجزہ یہی قرآن ہے۔ یہ ان شاء اللہ اس بات کا موجب ہو گا کہ نبی ﷺ کے پیروکار سب سے زیادہ ہوں۔

کچھ لوگوں نے یہاں اعتراض جڑا کہ یہ تو غالب اور شیکسپیئر بھی کہہ سکتا ہے کہ میری نقل کر کے دکھاؤ، لہٰذا یہ کیسا چیلنج ہوا!

بات 'نقل' کی ہو ہی نہیں رہی۔ بلکہ اگر کوئی 'چربہ' کرے گا تو وہ قرآن کی مثل نہیں ہو گا، کیونکہ قرآن کسی کا چربہ نہیں۔ یہ ایک بے نظیر کلام ہے۔ چیلنج ہو رہا ہے دراصل ایک الہامی کلام لانے کا جو عمدگی میں اِس پائے کا ہو۔ عرب لوگ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے، اِس کلام کے آگے بڑے بڑے اربابِ سخن ڈھ جاتے ہیں۔ 'حقیقت'، 'وجود' اور 'تخلیق' ایسے موضوعات پر حیران و سرگرداں طبقے اسے سنتے رہ جاتے ہیں۔ 'خدا' کے متلاشی اِسے سنیں تو آنکھوں سے ایک جھڑی لگ جاتی ہے۔ وہ سب بڑے بڑے سوال جو کہیں سے جواب نہ پاتے تھے، یہاں اپنی منزل پر آ لگتے ہیں۔ اس کے اثر سے لوگوں کی حالت غیر اور ان کی زندگیاں سر تا پیر تبدیل ہو جاتی ہیں۔ پاپ کے رسیاؤں کو اِس کلام کے اثر سے تائب ہو کر فرشتوں ایسی سیرت اختیار کرتے وہ اپنی آنکھوں دیکھ رہے تھے۔ غرض "الہامی کلام" کا جو کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ تصور انسانوں کے یہاں پایا جا سکتا ہے، یہ اس کی چوٹی پر ہے، اور وہ بچشمِ سر اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

قرطبی نے اعجازِ قرآن کے بیان میں اس جانب اشارہ کیا کہ بات اصل میں الہامی کلام کی ہو رہی ہے۔ جبکہ قرآن سے یہ بات صراحتاً واضح ہے: سورۃ ھود میں فرمایا: قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ "کہو: تو پھر دس سورتیں گھڑی ہوئی تم لا کر دکھا دو"۔ دراصل "خدا" کی حیثیت میں بات کرنا، ایک انسان کے لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک ہلکا سا نفسیاتی تجزیہ کلام کی سب حقیقت کھول دیتا ہے اور جھوٹ کھل کر آ جاتا ہے۔ لہٰذا یہ قرآن تو آپ اپنا ثبوت ہے۔ الہامی کلام والی کوئی ایک بھی تو بات ایسی ہو جس میں قرآن سب سے اوپر نہ ہو۔ پھر یہ ادب اور بلاغت میں بھی تم سب کو مات دے رہا ہے۔ باوجود اس کے — جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا — کہ قرآن نے اپنے لیے جو میدان چنا ہے وہ طبعاً تقاضا کرتا ہے کہ ادب کی چاشنی لانا یہاں بے انتہا مشکل ہو۔ امرؤ القیس یا نابغہ یا اعشیٰ وغیرہ کے کلام میں اگر عربوں کے لیے لطف ہے تو وہ اس لیے کہ ان کے موضوعات

ہی عربوں کے پسندیدہ مشغلوں پر کھڑے ہیں۔ مگر یہاں تو موضوع ایسے ہیں کہ 'طبیعت' اِدھر آتی ہی نہیں؛ کہ بالعموم یہ بڑے خشک موضوعات سمجھے جاتے ہیں۔ پھر ادب کی قوت کا بہت بڑا راز قلابے ملانے میں ہے۔ زمین کو جب تک آسمان پر نہ پہنچاؤ، کلام میں رنگ آتا ہی نہیں۔ تو پھر ایسا کلام جس میں یہ پابندی اختیار کر رکھی گئی ہے کہ صرف حقیقت بیان کرنی ہے وہ تو 'رنگ باندھنے' کے امکانات اپنے اوپر طبعی طور پر ختم کر چکا ہوتا ہے۔

پس ہونا وہ الہامی کلام کے طور پر چاہئے (مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ)، جس کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ اور عمدگی اس کے اندر وہ ہونی چاہئے جس کے آگے تمہارے شاعری کے دیوان جواب دے جاتے ہیں۔ جبکہ یہ شخص جو قرآن پیش کر رہا ہے، نرا اُمی ہے اور کبھی شعر کہنا تو دور کی بات، شاعری کی مجلس کے آس پاس کبھی نہیں دیکھا گیا۔

چنانچہ عربوں نے صاف جان لیا، یہ بات ان کے بس میں نہیں۔ الہامی کلام یا تو دنیا میں ہو نہ۔ لیکن اگر ہے، اور ہوتا ہے، تو اُس کلام کو ٹھکرانے کی کیا وجہ جو الہامی کلام کے خصائص رکھنے میں سب سے بڑھ کر ہے؟

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں قرآنی کلام کے اعجاز کے دس پہلو بیان کیے ہیں۔ یہاں ہم ان کو نہایت اختصار سے ذکر کرتے ہیں:

1. اس میں کلام کی بُنتی ایسی ہے کہ کلامِ عرب میں ایسی اعلیٰ بُنتی پائی ہی نہیں جاتی۔ اس میں وزن ہے تاہم شعر کی طرح قافیہ نہیں ہے۔ اتنا موزون ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اس کو شعر سے تشبیہ دیتے تھے۔ لیکن خود انہی کے اربابِ ادب مانتے کہ شعر وہ چیز نہیں جو اس کا مقابلہ کرے۔ ولید بن ربیعہ نے ندوۂ قریش کی بھری مجلس میں یہ کہا کہ وہ ان میں سب سے بڑھ کر شاعری اور اس کی اصناف سے واقف ہے، لیکن محمد ﷺ جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ کوئی اور ہی چیز ہے۔ آخر جب قوم کی طرف سے اصرار ہی ہوا کہ حج پر آنے والے قبائل کے آگے کچھ تو کہنا ہے۔ تو ولید نے کہا:

بس یہی کہا جا سکتا ہے یہ کوئی جادو اثر چیز ہے۔

2. اس کا اسلوب اچھوتا ہے۔ عرب کے لیے بالکل نیا۔ عرب شعراء و ادباء کے مابین بے شک ایک درجے کا تنوع تھا، اور ایک درجہ تنوع ہوتا ہی ہے، پھر بھی اُن کے کلام میں خاصا کچھ ایک دوسرے سے ملتا جلتا ضرور تھا۔ مگر ایک کلام اپنے اسلوب میں ان سے اتنا زیادہ ہٹ کر ہو کہ کوئی مشابہت ہی دور دور تک نہ پائی جائے، یہ بات وہ صرف قرآن میں دیکھ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار عتبہ کو سورۃ حم السجدۃ کی کچھ آیات سنائیں تو اُس نے تسلیم کیا کہ ایسا کلام اس نے زندگی میں کبھی نہیں سنا۔

3. جزالت۔ اس کا الٹ ہے رکاکت یعنی کچا پن۔ جزالت کا مطلب: کلام میں کمال پختگی اور پُر کاری؛ جس سے سننے والا جھوم اٹھے۔ پڑھنے والا اپنے منہ کو پُر محسوس کرے؛ اور خالی پن نہ پائے۔ لذت کی گھونٹیں سی آتی محسوس ہوں۔

قرطبی کہتے ہیں: یہ (اوپر مذکورہ) تینوں باتیں بلاغت میں آتی ہیں۔ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جس شخص کو کلامِ عرب کے رموز اور اسالیب آتے ہوں وہ قرآن میں لامحالہ اس بات کا اندازہ کرے گا۔

4. ہر ہر مقام کے لیے ایسی مناسب تعبیرات کہ کوئی نقاد زبان دان کبھی یہ تجویز نہ کر سکا کہ فلاں بات یوں نہیں یوں ہوتی تو اور بھی سجتا۔ حالانکہ ہر شاعر اور ادیب کے کلام میں کہیں نہ کہیں ضرور ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو نقد کے دائرے میں آسکیں۔

5. غیب کی وہ خبریں جو ماضی میں گزر چکیں، اس میں پورے جزم اور یقین کے ساتھ بتائی گئی ہیں۔ جبکہ وہ ازمنہ ٗقدیم کے ایسے مقامات ہیں کہ گزشتہ صحیفوں کے علماء ان کی بابت سر گرداں اور محتاجِ تحقیق رہے تھے۔ اہل کتاب نے جو پوچھا، پورے اعتماد کے ساتھ قرآن میں اس کا جواب دیا گیا، باوجود اس کے کہ وہ چن چن کر ایسی باتیں پوچھتے جو ان کے بڑے بڑے عالموں کو نہ آئیں۔

6. مستقبل کی پیشین گوئیاں اس میں پورے اعتماد کے ساتھ تلاوت کی گئیں۔ حالانکہ کوئی عقل مند آنے والے وقت کی بابت غیر ذمہ داری سے بات نہیں کرتا کہ اگر غلط نکل آئیں تو سب پول ہی کھل جائے گا۔ لیکن قرآن نے دعوے کے ساتھ خبریں سنائیں۔

7. پھر قرآن کی بہت سی پیش گوئیاں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔

8. پھر اس کی تشریعات کے اندر ایسی ایسی گہرائیاں ہیں کہ اس کے سامنے بڑے بڑے قانون ساز اور اصلاح کار دنگ رہتے دیکھے گئے۔ ایک ایسی منظم اور باہم مربوط شریعت کہ احکام کا اتنا بڑا اکاؤنٹ، نیز زندگی کے ہر ہر مسئلے اور ہر ہر شعبے میں احکام کی اتنی تفصیل، اور ربط ایسا کہ بے جوڑ، کسی کتاب میں پائی ہی نہیں گئی۔

9. حکمت اور دانائی کا اتنا بڑا ذخیرہ کہ دنیا میں کسی شخص کا کلام اخلاق اور دانائی کا اتنا بڑا اکاؤنٹ پیش نہیں کر سکا۔

10. پھر اس میں تضاد کا شائبہ تک نہیں۔ انسانی ذہن مسلسل ایک حالتِ سفر میں رہتا ہے؛ جس سے اس کے افکار میں ارتقاء آتا ہے۔ ضرور ایک آدمی کسی وقت ایک ایسی بات کرتا ہے کہ بعد میں اس پر کچھ نئے در وا ہوتے ہیں، جس سے اس کے پیش کردہ نظریات میں وقت گزرنے کے ساتھ فرق آتا چلا جاتا ہے۔ ایسے کسی اختلاف سے پاک کلام اُسی ہستی کا ہو سکتا ہے جو مطلق علیم و خبیر ہے۔ اِس (کسی قسم کا تضاد نہ پائے جانے کی) شرط پر صرف قرآن مجید پورا اترتا ہے۔

واضح رہے، معتزلہ اعجازِ قرآن کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو قرآن کا توڑ لانے سے بے بس کر دیا تھا۔ اس کو وہ ”صرفہ“ کا نام دیتے ہیں۔ گویا قرآن کے اپنے اندر کوئی ایسی بات نہیں کہ اس کی مثل نہ لائی جا سکے، بس ایک خارجی قوت نے عربوں کو ایسا کرنے سے روکے رکھا۔ اہل سنت اس نظریہ کو قبول نہیں کرتے۔ اہل سنت کا اعتقاد ہے کہ قرآن کا اصل اعجاز اس کے اپنے اندر ہے، نہ کہ اس کے خارج میں۔

بھلی بات، ورنہ خاموش

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : **وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ۔** (متفق علیہ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت، کہا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: **جو شخص ایمان رکھنے والا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر اسے چاہئے بھلی بات بولے ورنہ خاموش رہے۔**

محض زبان کی حرکت، جس کا پتہ تک نہیں چلتا، یہاں دو عظیم ترین حقیقتوں کے ساتھ جوڑ دی جاتی ہے: اللہ کو ماننا اور آخرت پر یقین ہونا۔ جس کا اثر زبان اور قلم پر آنا لازم ہے۔ اور اس کی حد یہ کہ یہاں سے بھلی باتیں ہی نشر ہو رہی ہوں؛ اور اگر نشرِ خیر کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو کم از کم یہاں خاموشی دیکھی جائے۔

غرض ان دو حقیقتوں کو ماننے کا اثر انسان کے انگ انگ پر نظر آتا ہے۔ اِس حدیث میں ایمان کی وہ جہت بیان ہوئی جس کا تعلق آلۂ زبان سے ہے۔

اللہ پر ایمان جو انسان کی سوچوں، تصورات، اور اہداف کو حسین ترین جہت دیتا ہے۔ کیسے ممکن ہے پھر یہاں خوب سے خوب تر نشر نہ ہو۔

آخرت پر ایمان، جو خدا کے آگے انسان کی ذمہ داری اور جوابدہی کا عنوان ہے۔ کیسے ممکن ہے پھر یہاں ذمہ دار ترین رویے ظاہر نہ ہوں۔

سلف میں سے کسی کا قول ہے: تمہارے منہ سے نکلے الفاظ قابو کرنے کے لیے فرشتے قلم سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس بات کا اندازہ کر لو تو کبھی بے تکان نہ بولو۔ اخروی جوابدہی تو بہت عظیم بات ہے، ان فرشتوں کے لکھنے کو صرف کاغذ اگر تمہیں اپنی جیب سے دینا پڑتا تو بخدا بڑا احساب کا بولتے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمد للہ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ

أمَّا بَعْدُ

اہلِ دین کی صف بندی

چند اوجھل پہلو

اداریہ

حامد کمال الدین

قارئین سے معذرت کے ساتھ.. چند انتظامی دشواریوں کے زیرِ اثر، ایقاظ کی اشاعت وقتی طور پر موقوف کی جارہی ہے۔ اللہ کو منظور ہوا تو، ضروری انتظامات میسر آجانے کے بعد، اس کی بحالی کسی وقت ہوسکے گی۔

تاحال کی اِس آخری نشست میں، ہم ملک اور عالمی منظرنامے پر جاری صورتحال کو چند ایسے پہلوؤں سے زیربحث لائیں گے، جو ہماری تحریروں میں اب تک موخر ہوتے آرہے تھے۔ ان موضوعات کو اِس ایک نشست میں جتنا بھی کھول لیں، ظاہر ہے ناکافی ہے۔ بعض ذہنوں میں یہ کچھ مزید سوالات کھڑے کریں گے۔ پھر بھی ان موضوعات کو سامنے لے آنا ہمارے خیال میں ضروری ہے۔ یہاں کی تحریکی دنیا کی یہ ایک امانت ہمارے پاس ہے۔ اس پر اٹھنے والے اشکالات، اللہ نے چاہا تو آئندہ کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی صورت ہمارے زیربحث آجائیں گے۔ فی الحال ایک معاملے کی سرسری تصویر سامنے لائی جا رہی ہے۔ اس کے بغیر آپ سے رخصت لینا ہمیں بہرحال کھلتا رہے گا۔

ایقاظ کے اِسی شمارہ میں ہماری چند ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جنھیں بعض اندیشوں کے تحت اس سے پہلے ایقاظ میں نہ دینے کا فیصلہ کیا جاتا رہاہے۔ کیونکہ ان تحریروں میں

یہاں کے بعض تحریکی مناہج پر ایک نقد تھی۔ قلوب کی شیرازہ بندی ہماری ایک بڑی ترجیح رہی ہے۔ چونکہ اندیشہ تھا یہ تحریریں ہمارے ان حلقوں میں کوئی منفی اثر پیدا نہ کر دیں، لہٰذا سوچا گیا کہ کچھ فکری بنیادیں ڈالنے کا کام ایقاظ میں اتنا کر لیا جائے کہ یہ باتیں اپنے صحیح سیاق میں سمجھی جا سکیں۔ یہ امانت بھی یہاں کی تحریکی دنیا کے سپرد کر دی جانا، اپنے پاس پڑی رہنے کی نسبت، ہمیں بہتر نظر آتا ہے۔ کوئی بات ناگوار ہو تو اپنے تمام بھائیوں سے ہم اس پر پیشگی معذرت خواہ ہیں۔ ہمارا مقصد سوائے کچھ فکری جہتوں کو پختگی کی جانب بڑھانے کے، واللہ کچھ نہیں۔

*****

یہاں کی فکری دنیا میں ایقاظ نے کس کمی کو پورا کیا اور اس کی کوششیں کہاں تک بارآور رہیں، یہ بات ہمارا قاری بہتر سوچ سکتا ہے۔ اپنی طرف سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، تحریکی دنیا کے کچھ الجھے ہوئے موضوعات کو واضح کرنا ایقاظ کی ایک بڑی ترجیح رہی ہے۔ تاہم جہاں ہمیں محسوس ہوا کہ ایک بات کی علمی بنیادیں ذرا تفصیل طلب ہیں اور وہاں سرسری گزرنا کچھ مزید پیچیدگیوں کا موجب ہو سکتا ہے وہاں ایک موضوع کو نمٹانے میں ہم نے کبھی جلدی نہیں کی۔ اور اُسے کھولنے کے لیے جتنا وقت ہمیں لگانا پڑا، لگایا۔ یہ وجہ ہے کہ کچھ باتوں کے بیان میں ہمیں لمبا چلنا پڑا؛ اور بہت سے موضوعات ابھی تشنہ پڑے ہیں۔ قارئین کو معلوم ہے، بعض مسائل کی علمی بنیادیں ہمیں کئی کئی جہتوں سے اٹھانا پڑیں۔ ہاں جیسے جیسے وہ بنیادیں واضح ہوتی چلی گئیں ویسے ویسے ہم نے دیکھا، ہمارے بہت سے قارئین کے اشکالات آپ سے آپ رفع ہوتے چلے گئے۔

چنانچہ ایک تو اس وجہ سے بعض چیزیں اپنی ترتیب سے آنا تھیں۔ دوسرا، کچھ موضوعات خاص ایسے بھی رہے ہیں کہ ہمارے بعض دوست خیر خواہ ہمیں برابر مشورہ

دیتے رہے کہ دہشتگردی اور مار دھاڑ کی یہاں جو ایک رِیت چل گئی ہوئی ہے، اور بات بے بات لوگ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والے کے خلاف تشدد پر اتر آتے ہیں، اُس کے مدّ ِنظر کچھ ایسی باتیں جو ملک کی صورتحال کے حوالے سے ہم اپنی نجی مجالس میں بڑے سالوں سے کہتے آئے ہیں، تحریری صورت میں دینے سے گریز کیا جائے۔

تاہم اب جب ہمارے لیے ایقاظ کی اشاعت کو جاری رکھنا وقتی طور پر ممکن نہیں رہا، اوپر مذکورہ دونوں باتوں کو رکاوٹ بننے دیے بغیر، ہم نے قاری کی ایک امانت اس تک پہنچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا جو بھی نتیجہ ہو، ہم اسے خدائے بزرگ و برتر کی تقدیر جانتے ہوئے قبول کریں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی اسلام کے مفاد سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

إِنْ أُرِيدُ إِلاَّ الإِصْلاَحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلاَّ بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

عالم اسلام پر مسلط اِس جنگ کو سمجھنے کی ضرورت

اداریہ

حامد کمال الدین

جنگ تو یہ ایک طویل عرصہ سے ہے۔ گو اب شدت کے ساتھ محسوس بھی ہونے لگی ہے۔ لیکن ضروری یہ ہے کہ ہم اس کا نقشہ سمجھ لیں۔ ورنہ اندیشہ ہے، کافر کو شکست دینے کے جذبہ کے تحت ہم اپنے ہی خلاف یہ جنگ لڑ رہے ہوں۔ یا اس جنگ کا ایک بڑا حصہ اپنے خلاف لڑ رہے ہوں۔ اور تب ہم اس میں جتنا زور لگائیں، جتنی محنت اور قربانیاں پیش کریں، اتنا ہی اپنا مزید نقصان کریں۔ اور دشمن کو جو صورت یہاں مطلوب ہے اسے پیدا کرنے کے امکانات خود اپنے ہی ہاتھوں کچھ اور بڑھا دیں۔ اپنی ذہانت سے زیادہ، ہماری سادگی اور لاعلمی سے کام لیتے ہوئے... دشمن نے واقعتاً معاملہ اس طریقے سے ترتیب دے لیا ہوا ہے کہ ہمارے بظاہر 'آگے بڑھنے' کی بہت سی جہتیں فی الوقت اُسی کے نقشے کو پورا کروا رہی ہیں۔ ہوشمندی یہاں ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہو گا۔ جذباتیت، بے جا تصادم اور آہ و زاری ایسے رویّے چھوڑ کر سمجھداری اور گہرائی کے ساتھ معاملے کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

غلط جگہ پر زور لگانا یا واویلا کرنا اور غلط جگہ پر راستہ کھلوانے کی کوشش کرنا راستے کو مزید بند کر دینے اور دشمن کے کچھ مزید نرغے میں آنے کا باعث ہو گا۔ یہ راستہ خاصی حد تک ہم پر بند ہو چکا، اگر ہم آنکھیں کھول کر دیکھنے پر آمادہ ہوں۔ آیئے ذرا اس پوائنٹ کی نشاندہی اور اس کی پیچیدگی کا اندازہ کر لیں؛ بعید نہیں اب بھی صورتحال کو بہتری کی طرف بڑھانے کی کوئی صورت بر آمد ہو سکے۔ اللہ کی مدد سے مایوس ہونا اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔

دنیا سے "مسلمان" کو مٹانے کی کوششیں اِس وقت دو محوروں پر ہو رہی ہیں:

1. پہلا محور یہ کہ "مسلمان" کو کسی بڑی جغرافیائی اکائی کے طور پر روئے زمین سے ختم کر ڈالا جائے۔
2. دوسرا محور یہ کہ "مسلمان" کو ایک تہذیبی واقعے کے طور پر ختم کر ڈالا جائے۔

یہ دونوں محور علیحدہ علیحدہ فصل میں بیان کیے جاتے ہیں...

کافر کی ہمارے خلاف جنگ کا پہلا محور:

"مسلمان" کو کسی بڑی جغرافیائی اکائی کے طور پر روئے زمین سے ختم کر ڈالنا

اداریہ

حامد کمال الدین

حتیٰ کہ چند بڑی بڑی جغرافیائی اکائیوں کے طور پر بھی "مسلمان" کو روئے زمین پر نہ رہنے دینا۔

یہ ہے کافر کی ہمارے خلاف جنگ کا پہلا محور۔

صاف پروگرام اس بار یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی بڑا خطہ متحد و مستحکم نہ چھوڑا جائے۔ کوئی گھر مسلمانوں کا ایسا نہ ہو جس میں مسلمان 'کروڑوں' کی تعداد میں اپنی قوت اور وسائل مجتمع کر سکتے اور اپنی قسمت کے آپ مالک ہو سکتے ہوں۔

مسلمانوں کا کوئی طاقتور خطہ جو کافروں کے ساتھ برابری کی سطح پر آ سکتا ہو۔ بلکہ (گلوب پر اپنی مرکزی پوزیشن، اپنے بے تحاشا وسائل، خصوصاً اپنی ایک ہوش ربا ڈیموگرافی کے بل پر) کسی دن کافر پر فوقیت پا سکتا ہو، جس کے امکانات کچھ ایسے معدوم بھی نہیں رہ گئے اگر بعض مسلم ممالک یونہی پنپتے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ صلیبی اپنے ان بھاری بھر کم امکانات کے ساتھ جو اُسے آج حاصل ہیں، عالم اسلام کے ایسے کسی خوفناک مستقبل کا سدباب کر جانا چاہتا ہے۔

مسلمانوں کا ایسا کوئی گھر 'اسلامی نظام' پر بے شک آج نہ بھی کھڑا ہو، اور چاہے وہاں دین سے دُوری کے ان گنت مظاہر بھی دیکھنے میں آتے ہوں، اور بے شک قرآن بھی وہاں

بے سوچے سمجھے ہی فی الحال پڑھا جا رہا ہو، اذان اور نماز کے کلمات بھی فی الحال ان کی زندگیوں میں کوئی خاص مضمون ادا نہ کر پا رہے ہوں[1]... اس کے باوجود اذانوں کا کوئی دیس ایسا نہ چھوڑا جائے جو 'کروڑوں' پر مشتمل ہو۔ 'لاکھوں مربع میل' پر کھڑا ہو۔ 'وسائل' کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتا ہو۔ کسی 'بڑی فوج' کا مالک ہو۔ کوئی 'ایٹمی طاقت' رکھتا ہو۔ کسی 'بڑی عسکری قوت' کا مخزن ہو۔ کسی علاقائی یا عالمی توازن کے اندر کوئی اہم 'ایکویشن' equation بنا سکتا ہو۔ **مسلمان بے دین سے بے دین بھی اِس حیثیت میں قبول نہیں**۔ اور وہ بھی فی الحال۔ ورنہ؛ مسلمان کسی بھی حیثیت میں قبول نہیں۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ پاکستان اور ترکی دنیا کی چند بڑی فوجی طاقتوں میں آتے ہیں۔ (صدام کا عراق بھی دنیا کی کچھ قابل ذکر فوجی طاقتوں میں آنے لگا تھا، جو اَب صلیب کی ڈاڑھ تلے آچکا، اور وہ عراق اِس وقت عبرت نگاہ ہے)۔ پاکستانی انٹیلی جنس دنیا کی پہلی چار یا پانچ انٹیلی جنسوں میں آتی ہے اور گلوب کا ایک قابل ذکر کھلاڑی۔ ترکی یورپ کی ابھرتی ہوئی ایک اقتصادی طاقت ہے، اس وقت جب یورپ کی کئی معیشتیں بیٹھ رہی ہیں۔ نیز مشرقِ وسطیٰ کی ابھرتی ہوئی ایک سیاسی طاقت۔ ادھر افغانستان میں ایک "پاکستان دوست" حکومت کے آتے ہی وسط ایشیا تک جو ایک سُنی بلاک بنتا ہے وہ 'بھارت' سے بڑی ایک ایمپائر ہے۔ مسلمانوں کے یہ دو سُنی پول two sunni poles at the heart of the globe (ایک ابھرتا ہوا ترکی اور پاکستان) کسی 'دورِ عثمانی' کی یاددہانی نہ بھی ہو، 'دورِ ممالیک' ایسا ایک داخلی استحکام تو مسلم دنیا کو پھر بھی دلوا تا ہے؛ جہاں مسلم پانیوں میں ہر کسی کو پوچھ کر گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی زمین کے مرکز میں مسلمانوں کی چلتی ہے۔ کوئی 'بڑی مجبوری' نہ ہو تو ملتِ صلیب ایسی کسی صورت کو واپس آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔

---

[1] مطالعہ فرمائیے ہمارے اِس اداریہ کی چھٹی فصل، ساتواں مبحث۔

جن دینداروں کو معاملے کی اِس جہت پر تعجب ہے

مجھے معلوم ہے کچھ دینداروں کے لیے معاملے کو دیکھنے کی یہ جہت خاصی انہونی ہے۔ یہ بڑے ہی زبردست شرعی معیارات سے کم کسی چیز پر مسلمانوں کی ان جغرافی اکائیوں کو ماپنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ شرعی معیارات سر آنکھوں پر۔ مگر میں ان حضرات سے عرض کروں گا، معاملے کا نقشہ اگر آپ دشمن کی جہت سے سمجھنا چاہتے ہیں تو حالیہ عالمی اکھاڑ پچھاڑ میں مسلمانوں کی اِن جغرافیائی اکائیوں کی پوزیشن جانچتے وقت اپنے معیار مت رکھیے۔ اس کی وجہ ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ معاملے کی حالیہ پوزیشن کو اگر آپ جانچنا چاہتے ہیں تو اس وقت کے 'پاکستان'، 'ترکی'، 'عراق'، 'سعودی عرب'، 'مصر'، 'سوڈان'، 'انڈونیشیا' اور 'الجزائر' وغیرہ کو تھوڑی دیر کے لیے دشمن کی ہی نظر سے دیکھنے کی زحمت فرما لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا، ایسی بڑی بڑی مسلم اکائیوں کی گنجائش ایک صلیبی 'نیوورلڈ' کے اندر کہاں ہے۔ "شرعی معیاروں" کا معاذ اللہ ہمیں انکار نہیں۔ لیکن ان کو لاگو کرنے کا سیاق بالکل اور ہے۔ (اس پر ذرا آگے چل کر ایک قاعدہ ذکر ہو رہا ہے)۔ اِس چیز کو اگر آپ نظر انداز کریں گے تو معاملے کو الجھا بیٹھیں گے (بلکہ ایک طبقہ اسے الجھا بیٹھا ہے، جس کا خیال ہے وہ معاملے کو شرعی معیاروں پر دیکھ رہا ہے)۔ **ہم ان حضرات سے کہتے ہیں، اپنے ان 'شرعی معیاروں' پر آپ کا بوسنیا اور کوسووا بھی یقیناً فیل fail ہی ہوتا تھا۔** اسلام کی کوئی ایک بھی بات اغلباً آپ کو بوسنیا اور کوسووا میں نوّے کی دہائی کے آغاز میں نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اُسی 'دین سے دور' بوسنیا اور کوسووا کو آپ ایک نظر صلیبی کی آنکھ سے دیکھیں تو وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جانے کے قابل ٹھہرتا تھا!

یہ ہے وہ فرق جس پر ہم آپ سے توجہ لینا چاہتے ہیں تاکہ اِس جنگ کے نقشے کو سمجھنے میں غلطی نہ ہو (اور اپنے ہی پیر پر کلہاڑی نہ مار بیٹھیں)۔ آپ نے نوٹ فرمایا: وہی 'اسلام سے کوسوں دور مسلمان' بوسنیا اور کوسووا کے اندر گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جانے کے

لائق ٹھہرتا ہے۔ وہی 'مغربی میم' دکھائی دینے والی آپ کی بوسنوی اور کوسووی خاتون، صلیبی گماشتے کے ہاتھوں غارت کر دی جانے کے قابل ٹھہرتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے رحم میں پلنے والے نطفے کسی دن اِسی لا الٰہ الا اللہ کو 'سوچ سمجھ کر' بھی پڑھ سکتے ہیں؛ جس سے فرعون کی کسی 'مجوزہ' دنیا کی جان جاتی ہے۔ ورنہ کافروں جیسا ہونے میں کیا کسر چھوڑی تھی بوسنیا اور کوسووا کی ہماری اس بیٹی نے؟

تو پھر یہاں سے اندازہ کر لیجئے، کافر کتنی دُور تک دیکھتا ہے، پیچھے بھی اور آگے بھی۔ دوسری جانب ہمارا یہ مسلمان 'شرعی عینک' لگا رکھنے کے باوجود کیسا کوتاہ نظر ہے۔ کافر اِس 'بے دین' مسلمان کی پشت میں پڑی نسلوں کو لا الہ الا اللہ پڑھتا اور چشم تصور میں یورپ کو فتح کرتا دیکھتا ہے تو آج اِسے کسی بڑی جغرافیائی اکائی کے طور پر دیکھنے کا روادار نہیں رہتا۔ ادھر ہمارا تنگ نظر دیندار اِس کی ٹخنوں سے نیچی شلوار یا اس کی ڈاڑھی مُنڈی صورت سے گزرنے پر آمادہ نہیں! یہ اس کی کچھ غیر شرعی حرکتیں دیکھتا یا اسے عقیدہ و عمل کی خرابیوں میں پڑا ہوا پاتا ہے تو اپنی کسی ہمدردی یا مدد و نصرت و اعانت کے قابل نہیں جانتا... اور کیا بعید خود بھی کسی وقت اس کا کام تمام کرنے کی سوچے؛ اور نادانستہ اُس خرانٹ دشمن ہی کا کام آسان کر آئے!

مقصد یہ کہ: اس جنگ کا نقشہ سمجھنے کے لیے آپ یہاں پر مطلوبہ "تبدیلی" و "اصلاح" کے معیارات نہیں، بلکہ ذرا دیر معاملہ دشمن کی نگاہ سے دیکھ لیجئے۔ بہت ممکن ہے صورتحال اُس سے مختلف نظر آئے جو آپ اِس جنگ کے کسی ایک ہی فیکٹر کو سامنے رکھتے ہوئے معاملہ کی اسیسمنٹ assessment کرتے رہے تھے۔

یہ بات ایک قاعدے کے طور پر نوٹ ہونی چاہیے کہ:

- اپنے شرعی معیارات آپ زیر بحث لائیے یہاں پر درکار اصلاح اور تبدیلی کے مباحث کے دوران۔ اور اس اصلاح اور تبدیلی کا اپنا ایک طریقہ ہے،

جس پر ہم آگے چل کر کچھ بات کریں گے۔[2]

البتہ اِس عالمی اکھاڑے کا نقشہ جانچنا ہو تو... اپنی اِن جغرافیائی اکائیوں کو اِن کے وسائل، معدنیات، عسکری امکانات اور ڈیموگرافی وغیرہ ایسے عوامل کے ساتھ جو 'مستقبل' کے کسی نقشے کو تشکیل دینے میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہوں، ذرا دیر کے لیے "صلیبی" کی نظر سے دیکھ لیجیے۔ خاص اِس پہلو سے "صلیبی" عالم اسلام کو جس گھیرے میں لے رہا ہے، اسے اپنے سامنے رکھ لیجیے۔ اور پھر یہاں پر چلی جانے والی چالوں کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

صلیبی آپ کے صرف 'آج' کو نہیں دیکھتا

واضح کرتے چلیں، ہماری ان سب باتوں کا مقصد صرف ایک ہے: دعوتی عمل کو ایک پختگی کی طرف لانا۔ لہٰذا ہمیں پروا نہیں، فی الحال ہماری ان باتوں کو کس قدر تعجب اور حیرانی سے لیا جاتا ہے۔ بس دعاء ہے کہ ان باتوں کو سمجھنے میں ہم بہت دیر نہ کرلیں۔ سن 2007 میں ہم جو باتیں کررہے تھے اور 'لال مسجد' سے ملحقہ پورے ایک منظرنامے سے خبردار کررہے تھے، (جس پر ہماری تالیف 'روبہ زوال امیریکن ایمپائر' شاہد ہے)، اُن باتوں کی صداقت سے آج وہ لوگ بھی شاید انکار نہ کرپائیں جو اُس وقت ہماری اُن باتوں کو حیرانی سے سن رہے تھے اور شاید سننا بھی گوارا نہیں کررہے تھے۔ ہم نے جو لکھا یہ ضروری جان کر نہیں لکھا کہ وہ لازماً آج ہی کی تاریخ میں ہمارے سب لوگوں کی سمجھ میں آجائیں گی۔ یا فی الفور مان ہی لی جائیں گی۔ ہم نے جو لکھا یہ سوچ کر لکھا کہ اپنے لوگوں کی یہ امانت ہمیں بہر حال ادا کرنی ہے۔ پس یہاں جو بات ہم دینی طبقوں کی خدمت میں عرض کررہے ہیں اسے غور

---

[2] اداریہ کی چھٹی فصل (چارہ گروں کی خدمت میں چند سفارشات) اِسی موضوع سے بحث کرتی ہے۔

سے سنیے؛ ہمیں نہیں معلوم قسمت ہمیں مزید کتنا وقت دیتی ہے:

مسلمانوں کی ہر بڑی جغرافیائی اکائی — خواہ وہ اپنے یہاں قائم 'نظام' یا اپنی بستیوں کے اندر نظر آنے والے تہذیبی مظاہر کے معاملہ میں سن 1992ء کے بوسنیا، کوسووا یا البانیہ سے زیادہ 'غیر اسلامی' کیوں نہ ہو — اِس وقت صلیبی منصوبہ ساز اور اُس کے بھارتی / صیہونی اتحادی کی ہِٹ لسٹ پر ہے۔ اور ایسی ہر بڑی مسلم اکائی کے 'کویت'، 'قطر' اور 'برونائی' جتنے یا اس سے بھی چھوٹے ٹکڑے کر دینا ایک 'نیا جہان' تشکیل کرنے والوں کی ترجیحات میں اِس وقت باقاعدہ شامل ہے۔ اِس خواب کو عملی تعبیر پہنانا آج بے شک اُن کے لیے آسان نہیں (اور ان شاءاللہ کبھی آسان نہ ہو گا)؛ اور فوراً تو شاید ممکن ہی نہیں (کیونکہ معاملہ اچھا خاصا اُن کے ہاتھ سے نکلا ہوا ہے، جس کی کچھ وضاحت 'سرد جنگ' کے حوالے سے آگے آرہی ہے)۔ لہٰذا اس کے لیے اب انہیں کچھ الجھی ہوئی اور لمبی چالیں چلنا پڑ رہی ہیں۔ جس کے تحت یہاں کے بہت سے اندرونی وبیرونی عوامل کو بیک وقت وہ راہ دکھائی جارہی ہے جو مسلم دنیا کو چھوٹے چھوٹے لقمے کر دینے پر منتج ہو سکے۔

چونکہ شرط یہ نہیں ہے کہ ہماری سب باتیں آج ہی سمجھی اور مانی جائیں لہٰذا کچھ حرج نہیں، ہم ایسی 'جغرافیائی اکائیوں' کو مثال سے بھی آپ کے لیے واضح کر دیں، اور اپنی بات میں کسی قسم کا غموض نہ رہنے دیں، بے شک آپ کا تعجب کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے!

یہ مت سمجھئے کہ وہ جغرافیائی اکائیاں جو شیاطین عالم کے کسی مطلوبہ 'پوسٹ-یو-این-ورلڈ' a desired post-UN-world میں فٹ نہیں بیٹھتیں... وہ خاص کوئی 'اردگان کے ترکی' یا 'ضیاء الحق کے پاکستان' یا 'فیصل کے سعودیہ' یا 'عزت بیگووچ کے بوسنیا' ایسی مسلم اکائیاں ہی ہوں گی۔ یعنی اردگان یا ضیاء الحق یا فیصل یا بیگووچ ایسی قیادتیں اگر نہ ہوں تو مسلمانوں کی یہ جغرافیائی اکائیاں تو اپنی تمام تر ڈیموگرافک جہتوں کے ساتھ اُن کو ہضم ہی ہضم ہیں! یہ سوچنا بالکل غلط ہو گا۔ حق یہ ہے کہ ترکی کو کوئی 'اردگان' یا پاکستان کو کوئی 'ضیاء الحق' یا

سعودیہ کو کوئی 'فیصل' یا بوسنیا کو کوئی 'بیگووچ' میسر آنا دشمن کو ہم پر بے رحم ہو جانے کے کچھ اضافی اسباب فراہم کرتا ہے۔ ورنہ قبول ان کو 'اتاترک' کاترکی بھی بہر حال نہیں ہے۔ ابھی ہم اس کی وجہ بتائیں گے، کیوں۔ ('اتاترک کاترکی' ہم نے اِس ضمن کی بدترین مثال دینے کے لیے ذکر کیا ہے تاکہ کوئی غموض رہ ہی نہ جائے، بقیہ مثالیں اسی پر قیاس کر لیجئے)۔

'اتاترک کاترکی' ''خلافت'' کے مقابلے پر ایک نعمتِ غیر مترقبہ ضرور ہو گا۔ (ہم یہاں دشمن کی نظر سے بات کر رہے ہیں)۔ تاہم ''خلافت'' جب ایک بار ختم کی جا چکی تو ضروری نہیں 'اتاترک کاترکی' اپنے اُسی سائز، اُنہی وسائل اور اُنہی عسکری امکانات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پسندیدگی کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا رہے۔ لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَال، وَلِكُلِّ حَادِثٍ حَدِيثٌ! وجہ اس کی واضح ہے۔ 'اتاترک کے ترکی' کو 'اردگان کاترکی' بننے میں آخر دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ چند عشرے؟ تو پھر ایک مضبوط ترکی 'اتاترک' کے پاس بھی کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ الا یہ کہ کوئی مجبوری ہو۔ اور ہاں مجبوری ہو (سوویت عفریت کی گرم پانیوں کی طرف پیش قدمی) تو 'ضیاء الحق کے پاکستان' کے ساتھ بھی معاملہ کر لینا پڑتا ہے!

پس مسئلہ مجبوریوں کا ہے۔ کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو عالم اسلام میں کوئی ملحد سے ملحد ''قیادت'' کیوں نہ ہو، بے دین سے بے دین ''نظام'' کیوں نہ ہو، صلیبی یہاں ایک مسلم ملک کو مضبوط اور توانا چھوڑنے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا۔ اتاترک بھی ہو، وہ صرف اپنے کفر کی گارنٹی دے سکتا ہے اپنی نسلوں کی نہیں! اس 'مسئلے' کا کوئی کرے تو کیا کرے؟ مسلم دنیا کی 'گارنٹی' اللہ کے فضل سے کوئی نہیں دے سکتا؛ یہاں تک کہ خود ملحد بھی نہیں! خود اِس (ملحد) کے گھر میں کب کوئی دیندار پیدا ہو جائے، کچھ ضمانت ہے؟ (صلیبی کو ہماری مسجد اور ہماری اذان، یہاں تک کہ اب تو ہماری تبلیغی جماعت اور الہدیٰ ایسی بے ضرر چیزیں بری لگتی ہیں کیونکہ یہ مسلم بیداری کے لیے ایک 'نرسری' کا درجہ رکھتی ہیں! بڑے بڑے ملحد افسروں کے گھروں میں آپ نے بڑے بڑے دیندار بچے دیکھ رکھے ہوں گے؛ عالم اسلام کا یہ

ایک ’جینوئن‘ مسئلہ ہے؛ آخر اسے کیسے نظر انداز کر دیا جائے!)۔ یہ ملحد اپنی آئندہ نسلوں کی تو کیا ضمانت دے گا، اس بات ہی کی کیا ضمانت کہ خود یہی کل کو تائب نہیں ہو جائے گا اور مرنے سے پہلے خدا کے ساتھ اپنا معاملہ درست کرنے کے لیے فکر مند نہیں ہو جائے گا! مسلمان ماں کے دودھ میں خدا نے کچھ رکھا ضرور ہے!

اس لحاظ سے؛ خدا نے عالم اسلام کے معاملے کو کچھ لاک lock لگوا دیے ہیں۔ یہ قدرتی لاک lock ہیں۔ کوئی مائی کا لال انہیں اَن لاک unlock نہیں کر سکتا۔ کوئی ضمانتیں یہاں پائی ہی نہیں جاتیں۔ ضمانتیں کہیں ہوں تو دی جائیں! ملتِ صلیب پس یہاں ’شخصیات‘ کو نواز سکتی ہے ”ملکوں“ کو نہیں؛ خواہ یہ شخصیات اُس کے لیے سونے کی کیوں نہ ہو جائیں!!! لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والے ملکوں کو ”بڑی طاقتیں“ بنتا چھوڑنا صلیبی کی لغت میں نہیں، سوائے یہ کہ مجبوری ہو!

پس کُل کھیل آپ کو اُس کی مجبوریوں کے ساتھ کھیلنا ہوتا ہے۔ اس بات کو ایک کُلی قاعدے کے طور پر لکھ لیجئے۔

چند مسلم ممالک اتنی سی طاقت بھی کیسے حاصل کر سکے؟

دیکھئے ان بڑے سائز کے مسلم ملکوں کے ساتھ دشمن کی بے رحمی اِس تمام عرصہ ایک حد سے نہیں بڑھ پائی تو اس کی وجہ دشمن کی ایک مجبوری تھی جس کا نام ہے ’سرد جنگ‘۔ یہ وہ مجبوری ہے جس نے نصف صدی تک مغربی بلاک کو خطرے کی سولی پر لٹکائے رکھا اور جس کے باعث مغربی بلاک آپ کے پاکستان، ترکی، مصر اور سعودی عرب ہی کیا آپ کے افغان جہاد تک کی بلائیں لینے پر مجبور ہوا رہا تھا بلکہ ان میں اپنی بقاء دیکھنے لگا تھا۔ سو اس کے لیے تو دعائیں دیجئے ’سرد جنگ‘ کو! البتہ یہ مت سمجھئے کہ یہ بڑی بڑی مسلم اکائیاں اپنی اِس ’اسلام سے دُور‘ حالت میں تو چلیں ان کو قبول ہیں۔ کَلَّا۔

تیسری دنیا میں "آزادیوں" کا جو ایک فنامنا بیسویں صدی کے وسط میں دیکھا گیا اور بعدازاں چند مسلم ممالک کے کچھ ترقی کر جانے کی بھی جو ایک صورت بنتی چلی گئی، اس کا ایک خاص پس منظر ہے جو ہماری تحریروں میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اپنی بات آگے بڑھانے کے لیے یہاں مختصر طور پر ہمیں وہ ایک بار پھر بیان کرنا ہوگا:

بیسویں صدی کا نصفِ اول دو "عالمی جنگیں" اور بیسویں صدی کا نصفِ دوم پانچ عشروں پر محیط ایک خونخوار گلوبل "سرد جنگ" دراصل استعمار کے شکنجے میں پوری طرح آچکے اور اب بظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قابو عالم اسلام کی گردن چھڑوانے اور مسلمانوں کو سنبھلنے کا بھرپور موقع دینے کے لیے ایک خدائی تدبیر تھی...

مغربی قوتوں کی عالم اسلام پر ایک خونخوار چڑھائی جو انیسویں صدی میں ہوئی، بیسویں صدی میں یکلخت پسپا ہوتی ہے، بلکہ 'آزادیوں' کی ریل پیل دکھائی دیتی ہے، تو اس سے ان قوتوں کی 'شرافت' سے متعلق کوئی دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔ وہ شکار جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مارا گیا تھا، اُس کو تو ایسے مزے لے لے کر کھایا جانا تھا کہ الامان والحفیظ۔ 'کالج یونیورسٹیاں' بناتے اور ملکہ وکٹوریہ کے در کو پہنچانے والی 'ریل' بچھاتے کچھ دیر لگ گئی تو اس لیے کہ جلدی ہی کسی بات کی نہیں تھی! جس شکار کو مارنے کے لیے صدیاں لگیں اس کو کھانے کے لیے بھی صدیاں چاہئیں تھیں! لیکن کیا دیکھتے ہیں، چند ہی عشروں میں (بیسویں صدی کا آغاز) "عالمی جنگوں" کا ایک ہولناک کمرتوڑ عذاب (مَن عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالحَرْبِ[3] کے مصداق) مسلمانوں کے سینے پر چڑھی بیٹھی استعماری قوتوں کے عین سر پر آپہنچا (قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ

---

[3] حدیثِ قدسی: "جو شخص میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کرلے، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا کرتا ہوں"۔

عَذَابًا مِّن فَوۡقِكُمۡ أَوۡ مِن تَحۡتِ أَرۡجُلِكُمۡ أَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعۡضَكُم بَأۡسَ بَعۡضٍ)[4] اور تھوڑے عرصے میں غاصبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اتنی سیانی قوتیں خدائی تدبیر کے آگے یوں بے بس: اپنے ہاتھ سے (تیسری دنیا کے کم عقل جذباتی 'فرقوں' کی طرح) ایک دوسرے کا یوں گلا کاٹتی چلی گئیں کہ سارا عالمی سیناریو ہی بدل کر رہ گیا اور وہ ٹوٹی کمر کے ساتھ 'فی الوقت کے لیے' شکار کی جان چھوڑ، شرافت و انسانیت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے گھر کو سدھار گئیں؛ اور اپنے بڑھاپے کا اندازہ کر کے 'حقوقِ انسانی' کا وِرد کرنے لگیں۔ دنوں میں 'یو۔این' کھڑی کی گئی۔ بقیہ کہانی پھر سرد جنگ نے پُر کی، جس کی تفصیلات ہمارے سامنے ہیں، اور جس کے بطن سے خدا نے ہمارا عالمی جہاد بر آمد کرا ڈالا، جو کہ ابھی سرے نہ لگا تھا کہ شمال مغربی برصغیر کی ایک غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک مسلم قوم کو دنیا "نیوکلیئر پاور" کے طور پر دیکھ رہی تھی!

اتنا ڈراؤنا خواب تو عالمِ صلیب کے یہاں پچھلی تین صدیوں سے کبھی نہ دیکھا گیا ہوگا! مسلمانوں کا "عالمی جہاد" اور مسلمانوں کا "نیوکلیئر پاکستان" خدائی تقدیر کے کچھ خصوصی نشان ہیں، جن کو محض 'اسباب' کے تحت بیان کرنا ہم اپنے لیے خاصا مشکل پاتے ہیں۔ (دونوں، اپنی الگ الگ حیثیت میں —— ایک دُوررَس طور پر —— 'عالمی توازن' کو اس کی اوقات پر لانے کا نقطۂ ابتداء، ان شاء اللہ وبفضلہٖ تعالیٰ)۔

ان دونوں کی تفسیر explanation 'سرد جنگ کے فراہم کردہ مواقع' کے سوا کسی چیز سے ممکن نہیں؛ اور 'سرد جنگ' اپنی پیش رَو 'عالمی جنگوں' کی طرح ایک خاص خدائی تدبیر؛ جس نے 'سیانی' قوموں کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

---

[4] (الأنعام: 64) "کہو، وہ اِس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے، یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے، یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے"۔

حق یہ ہے کہ ہمارا ”عالمی جہاد“ اور ہمارا ”نیوکلئیر پاکستان“ (مجموعی طور پر) سرد جنگ کے بطن سے برآمد ہونے والا اتنا ہی بڑا ایک واقعہ ہے جتنا کہ عالمی جنگوں کے بطن سے برآمد ہونے والا عالم اسلام کی 'آزادی' ایسا ایک بڑا تاریخی واقعہ۔

پھر اس سے کچھ ہی دیر بعد تقدیر کے بطن سے ایک اور واقعہ ایسا رونما ہوا جو کسی کے سان گمان میں تھا اور نہ آ سکتا تھا۔ اِس واقعہ کو بھی محض 'اسباب' کی بنیاد پر تفسیر نہیں کیا جاسکتا؛ اور یہ تھا 'اتاترک کے ترکی' کا منظر سے ہٹتے چلے جانا اور اس کی جگہ 'اردگان کے ترکی' کا نمودار ہوتے چلے جانا!

(کچھ بعید نہیں اسی فہرست میں 'فہد و عبداللہ کے دَم کشیدہ سعودی عرب' کی جگہ خطرات میں کود پڑنے والا 'سلمان کا سعودی عرب' بھی آئے، مگر یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ 'مرسی کا مصر' بھی اِس فہرست میں آتا آتا رہ گیا؛ ورنہ آنے والے دنوں کی صورت شاید کوئی اور ہوتی۔ گو پھر بھی ہم ناامید نہیں؛ آج نہیں تو کل ان شاءاللہ ایک واقعہ ہونا ہی ہے۔ **واللہ غالبٌ علیٰ امرہ**۔ پھر تیونس سے نمودار ہونے والی اور لیبیا و مصر سے گزرتی شام تک جا پہنچنے والی 'عرب سپرنگ' جو کہ آدھی پونی 'اسلامی سپرنگ' بھی تھی وقتی طور پر چاہے ناکام ہو گئی ہو لیکن خطے میں اسرائیل کے 'مستقبل' کے لیے پریشان طبقوں کو بہت کچھ بتا گئی: ان بڑے بڑے سائز کے مسلم ملکوں کے یہاں کوئی ٹھوس انفراسٹرکچر یا کوئی مضبوط اکانومی تیار حالت میں چھوڑنا جسے کبھی بھی کوئی عوامی رَو اٹھ کر اپنے زیرِ استعمال لے آئے اور آخر اس کے اندر اِن خطوں کے مسلمانوں کی امنگیں بولنے لگیں، ایک سنگین غلطی ہو گی۔ اِن خطوں کو تو مغرب کی دیوی 'جمہوریت' کے درشن کروانا تک غلط ٹھہرا! نیز جس 'اسلامی جذبہ' کو عرب دنیا میں اتنے عشرے اِس بے دردی کے ساتھ کچل کر دیکھ لیا گیا مگر وہ پھر اتنا زندہ ہے کہ یہاں کی کسی بھی عوامی رَو کے کاندھے پر سوار ہو لیتا ہے، اس کا تو کوئی اور ہی پائیدار علاج کرنا ہو گا)۔ 'سرد جنگ' کی مجبوری اب نہیں ہے!

جس کے بعد عالم اسلام کو 'پتھر کے دور' میں دھکیل جانے کے لیے ملتِ صلیب کے یہاں گھنٹیاں بجائی دی گئیں، الا یہ کہ کوئی اور مجبوری ان کے آڑے آ جائے۔ اس مقصد کے لیے روم و فارس کی دوریاں تک ختم کرائی جا چکیں۔ ہمیں فی الحال نہیں معلوم، روس کا بیچ میں آنا یہاں کس درجہ کا گیم چینجر game changer ہے۔

ہمارے مشائخ نے اس 'مابعد سرد جنگ' صورتحال کو بہت جلد بھانپ لیا تھا

"سرد جنگ" کے خاتمہ کے ساتھ ہی عالم اسلام پر مغرب کی فوج کشی کی جو ایک لہر آئی، جس کے ساتھ عالم اسلام کو یکلخت ایک نئی صورتحال کا سامنا تھا، اور اسی لحاظ سے یہاں پر اسلامی تحریکوں کو بھی اپنے خطاب میں کچھ نئی جہتیں لانا تھیں... ہمارا دیکھنا ہے، ہمارے مشائخ نے اس کا ادراک بہت جلد کر لیا تھا۔

بلادِ عرب میں شیخ سفر الحوالی اور کچھ دیگر تحریکی علماء نے نوّے کی دہائی کے آغاز میں امریکی افواج کے جزیرۂ عرب لنگر انداز ہونے کی بڑی کھل کر مخالفت کی تھی اور اس پر جیل کی ہوا بھی کھائی تو اس کا سیاق دراصل یہی تھا کہ صلیبی بوٹوں کا جزیرۂ عرب پر آ لگنا ان مشائخ کے ہاں ایک نئے آشوب ناک دور کا آغاز دیکھا جا رہا تھا اور اس کی سنگینی واضح کرنا ان کے نزدیک ضروری۔ لیکن جلد ہی ان مشائخ نے نوجوانوں میں شدت پسندی کے ممکنہ رجحانات کو بھی بھانپ لیا جس سے یہ معاملہ بے طرح الجھ سکتا تھا؛ اور اسی کے مطابق مشائخ نے اپنی حد تک ایک لائحۂ عمل بھی اختیار کیا۔ نوّے کی دہائی کے تقریباً وسط سے شیخ سفر الحوالی کا ایک جملہ داعیوں کی زبان پر سنا جانے لگا تھا: إننا بين يدي مواقف تحتاج الأمة فيها إلى التورية ضمن السياسة الشرعية "اس وقت ہمیں کچھ ایسے مواقف کا سامنا ہے، جہاں امت کو سیاستِ شرعیہ کے اندر توریہ کا ایک اسلوب اختیار کرنا ہو گا"۔ (توریہ: یعنی ایک ذو معنی اسلوب)۔ نوّے کی دہائی کے وسط تک سعودی عرب کے اندر شدت پسندی (بم دھماکے اور

مسلح کارروائیوں) کا فنامنا خاصا توانا ہو چکا تھا۔ (اُس دور کے ایک اہم واقعہ "خُبر دھماکہ" کے متعلق اب جا کر بات کھلی ہے کہ اس کے پیچھے فارسی عنصر کام کر رہا تھا اور وہ خوامخواہ "سُنی انتہاپسندی" کے کھاتے میں ڈالا جاتا رہا تھا)۔ یعنی دو تین طرف سے مسلمانوں کو ایک مار دینے کی صورت بن رہی تھی۔ یہاں ان مشائخ نے شدت پسندی کی جانب مائل نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو داخلی جنگ کی راہ سے واپس لانے میں ایک سرگرم کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ شدت پسندی کو چھوڑنے پر آمادہ نوجوانوں کے لیے سعودی حکومت سے عام معافی کا اعلان کروانے کی بھی کوششیں کیں، تاکہ اس موقع پر ایک قومی اتفاق رائے سامنے لایا جاسکے اور داخلی استحکام کو بروقت مضبوط کرلیا جائے۔

معاملہ جزیرۂ عرب کے ان مشائخ تک نہ رہا، گو پہل اِنہی کی ہے۔ دیگر عرب ممالک کے مشائخ بھی اس موقع پر آگے بڑھے اور مصر کی الجماعۃ الاسلامیۃ (جس کے امیر اس سے پہلے شیخ عمر عبدالرحمن رہے ہیں، اور جو کہ نوے کی دہائی کے آخر تک مصر میں مسلح کارروائیوں میں سرگرم تھی) کو بھی ایک فکری و منہجی مراجعہ (نظر ثانی) پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ اس مصری جماعت نے نوّے کی دہائی کے آخری سالوں میں اس 'مسلح عمل' کے منہج سے باقاعدہ رجوع کرتے ہوئے مصر میں جاری مسلح کارروائیوں کو موقوف کیا اور مشائخ کی علمی راہنمائی قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ فی الفور، اس سے فلسطینی جہاد نے ایک نئی کروٹ لی؛ اور سن ننانوے میں بیت المقدس کے اطراف واکناف "انتفاضہ ثانیہ" کا ظہور ہوا۔ علاوہ ازیں، شاید آنے والے سالوں (عراق پر امریکی حملہ کے بعد بننے والی صورتحال) کو بھانپتے ہوئے کچھ داخلی صف بندی کی صورت بھی ممکن ہوئی۔

تب سے؛ ہمارے یہ مشائخ سعودیہ و دیگر مسلم ممالک کے اندر "داخلی استحکام" کو اسلامی تحریکوں کی بڑی ترجیحات میں رکھتے ہیں۔ کیونکہ صلیبی کی عالم اسلام میں ایک نئی مہم کو ناکام کروانے کی ایک یہی ایک صورت ہے۔ بہت سے جذباتی لوگوں کو اُس وقت وہ باتیں سمجھ نہیں

آ رہی تھیں اور بعض تو ہمارے ان مشائخ کی بابت طرح طرح کی قیاس آرائیاں بھی کر رہے تھے کہ نوّے کی دہائی کے وسط تک جیلوں میں رہنے والے یہ مشائخ کیوں یکدم 'بدل' سے گئے اور حکومتوں پر تنقید کے معاملے میں ویسے 'شدید' نہیں رہے۔ لیکن موجودہ حالات کے تناظر میں، خصوصاً روم وفارس گٹھ جوڑ کی حقیقت طشت از بام ہو جانے کے بعد، اور خطے کی نئی 'انجینئرنگ' کی سازشیں کھل کر سامنے آجانے کے بعد، تقریباً ہر کسی کو داخلی استحکام کی یہ اہمیت اب سمجھ آ رہی ہے۔ یہاں تک کہ بظاہر بڑے بڑے دوراندیش جو اُس وقت ایران کی 'امریکہ مخالف' بڑھکوں کی داد دے رہے تھے آج 'ایران امریکہ گٹھ جوڑ' کے مقابلے پر انہی عرب ملکوں کے داخلی استحکام کے لیے دست بہ دعاء ہیں!

'سرد جنگ' سے فراغت پاتے ہی ایک نئی صلیبی مہم: عالم اسلام کے پَر تراشنا

سرد جنگ کے ختم ہوتے ہی کوئی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ملتِ صلیب اپنے لاؤ لشکر سمیت عالم اسلام پر چڑھ آتی ہے۔ اس کے درست پس منظر کو سمجھنے کے لیے، ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ "سرد جنگ" اور اس سے پہلے "عالمی جنگوں" سے بھی ذرا پیچھے جا کر اُس وقت اور موجودہ نقطے کو جوڑیں اور پھر اس تصویر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

میں معذرت خواہ ہوں جن حضرات کا خیال ہے کہ یہ جنگیں آپ کے کسی ممکنہ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے اور یہاں کے مسلم ملکوں اور ان میں قائم نظاموں کو بچانے کے لیے ملتِ صلیب کی جانب سے لڑی جا رہی ہیں اور خاص اس غرض سے وہ عالمِ اسلام کو تاراج کرتی پھر رہی ہیں! یہ اس معاملے کی ایک سطحی اور جذباتی تصویر ہے۔

بھائی آپ کا کونسا اسلامی انقلاب یہاں 'لبِ بام' پہنچا ہوا تھا جو اِن تمام جنگوں کی یہ توجیہ کی جائے؟ حق یہ ہے کہ 'اسلامی انقلاب' کی تمام کوششیں اس سے پہلے ہی عالم اسلام کے اندر ایک 'بھاری پتھر' ثابت ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ 'متبادل' کے سوال کھڑے

ہو چکے تھے (جس کا کچھ فائدہ بعد ازاں عسکریت پسند افکار نے بھی اٹھایا)۔ غرض اکیسویں صدی شروع ہونے تک ''اسلامی انقلاب'' کی تمام یا اکثر کوششیں دم توڑ چکی تھیں، کہ عالم اسلام پر صلیبی چڑھائی کا یہ نیا سلسلہ سامنے آیا۔

ہاں ایک مثال ذکر کی جاسکتی ہے: تحریکِ ملا عمر، جو افغانستان میں نمو پزیر تھی۔ لیکن اس کے پیچھے جو قوتیں اور جو عوامل اور جو اہداف کارفرما تھے اس کو نہ تو سرسری لینا درست ہے اور نہ اُس پورے عمل سے کاٹ کر دیکھنا (اگر آپ واقعتاً حالیہ صلیبی یورش سے پہلے کی صورتحال کا ایک واقعاتی تجزیہ کرنا چاہتے ہیں اور محض اپنی پسند کے نتائج پر پہنچنے کی جلدی نہیں رکھتے)۔ پس 2001 تک کی تحریکِ ملا عمر اور اس کے پشت پناہوں (اور ہر دو کے مابین اُس وقت پائی جانے والی ہم آہنگی) کو سامنے رکھیں تو یہ تصویر بنتی ہی نہیں کہ 'ملتِ صلیب آپ کے کسی ممکنہ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے اور یہاں کے مسلم ملکوں اور ان میں قائم نظاموں کو بچانے کے لیے مسلم سرزمینوں پر چڑھ آئی ہے'۔

غرض ''اسلامی انقلاب'' کی یہ ایک ہی مثال (تحریکِ ملا عمر) پورے عالم اسلام کے اندر آپ دے سکتے ہیں، مگر یہ ''انقلاب'' جن عوامل کا مرہونِ منت تھا وہ آپ کی ذکر کردہ بات کی بجائے کسی اور حقیقت پر دلالت زیادہ کرتے ہیں۔ سامنے کی بات ہے، افغانستان کا یہ ''اسلامی انقلاب'' اپنے جن دوستوں پر سہارا کر کے آ رہا تھا، اور ان کے ساتھ ایک سچی قابل اعتماد دوستی کے اصولوں پر کھڑا تھا (نہ کہ 'موقع پرستی' کی کوئی اپروچ، جیسا کہ ہمارے بعض اوہام پرستوں کا خیال ہے)، ان سے الگ کر کے آپ اس پورے معاملے کی توجیہ نہیں کر سکتے۔ اس ایک پیش رفت (تحریکِ ملا عمر) کے علاوہ آپ کا کونسا 'اسلامی انقلاب' تھا جس کا خطرہ بھانپ کر ملتِ صلیب آپ کے ان ملکوں پر چڑھ آئی تھی؟

بڑی دیر سے ہمارا یہ کہنا رہا ہے کہ عالم اسلام پر مسلط کی جانے والی اِن نئی جنگوں کا بڑا ہدف اُن قوتوں کو ہلکا اور اُن سوتوں کو خشک کرنا ہے جن سے عالمی جہاد دنیا میں مدد پاتا رہا، یا آئندہ

مراحل میں پاسکتا ہے؛ جہاد کا فنامنا اپنی کسی مستقل بالذات حیثیت میں البتہ اتنا بڑا (تاحال) نہیں ہے۔ پس عالم اسلام پر ملت صلیب کے چڑھ آنے کی تفسیر ہمارا یہ عالمی جہاد ضرور ہے تاہم استعمار کے اہداف اسی میں محصور نہیں ہیں۔ پس یہ عالمی جہاد دشمن کا ایک براہِ راست اور اعلانیہ ہدف ضرور ہے، زیر عنوان: 'دہشتگردی'۔ (جس کا اللہ کا شکر ہے دہشتگردی سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے)۔ لیکن اِس 'اعلانیہ ہدف' کے پیچھے فی الوقت کچھ 'غیر اعلانیہ ہدف' بھی اُنہیں کچھ کم نہیں کھٹک رہے؛ جو نہ صرف ملتِ صلیب کی نظر میں بلکہ حسین حقانی ایسے ہمارے ایک کثیر بکاؤمال کی نظر میں 'فساد کی اصل جڑ' ہے۔

اپنے تاثرات کی حد تک (جو کہ ناکافی معلومات کی غیر موجودگی میں تاثرات ہی ہو سکتے تھے) ہم یہ خیالات اپنی مجالس میں شروع دن سے شیئر کرتے آئے ہیں۔ اور تحریروں میں بھی کچھ اشارہ اِن امکانات کی جانب ہوتا آیا ہے۔ لیکن اب تو یہ بات خاصی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ صلیبی طاقتیں (مع ان کے صیہونی، فارسی اور بھارتی حلیف) اس وقت عالم اسلام کے کن کن ممالک کو غیر مستحکم destabilize کرنے، حتیٰ کہ بس چلے تو ٹوٹے کر دینے کے لیے دوڑ دھوپ فرما رہے ہیں۔ (بھارت اور ایران پر نوازشات کی حد ہوتی کسے نظر نہیں آرہی؟ اور جنوبی ایشیا میں 'دہشتگردی' کی بابت ایک خالص بھارتی نیریٹو A pure Indian narrative on terrorism in the South Asia کی تائید میں، اور من و عن انہی 'بھارتی' لائنز پر، امریکی بیانات اور دباؤ بلکہ صاف امریکی دھونس بھی اب کسے نظر نہیں آرہی؟ بلوچ لبریشن آرمی کی سرپرستی؟ پھر پاکستان میں دہشتگرد کارروائیوں کے لیے امریکی قبضہ کے زیر انتظام چلنے والے 'کابل' کا روٹ بھی آخر کسے نظر نہیں آرہا؟ اور کونسی بات اب ڈھکی رہ گئی ہے؟)۔ کیا یہ غور طلب نہیں کہ پاکستان، ترکی اور سعودی عرب کو تو دھماکوں کی زد پر رکھ لیا جاتا ہے جبکہ ایران اس سے پوری طرح محفوظ رہتا ہے؟ اور کوئی اندازہ کرے، اردگان کے الیکشن ہار جانے کے لیے مغربی پریس میں، خصوصاً صیہونی پریس کے

اندر، یہاں تک کہ ہمارے اپنے لبرلز کے یہاں، کیسی کیسی بے چینی پائی جاتی ہے! اور کوئی یہ بھی پوچھے کہ سعودی عرب نے، جسے چاروں طرف سے ایران کی وفادار 'مرگ بر امریکہ' نعرے لگاتی 'جہادی تنظیمیں' گھیر اڈالے ہوئے ہیں، مغربی میڈیا یہاں تک کہ ہمارے یہاں کے لبرل میڈیا کا آخر بگاڑا کیا ہے جو کسی بلکتے بچے کی طرح یہ بتائے بغیر کہ تکلیف کہاں ہے مسلسل شور مچاتا اور سعودی عرب کے لتّے لیے جاتا ہے؟ اور اب تو یہ بھی راز نہیں رہا کہ افغانستان اور شام میں جہاد جیسے کیسے مدد پاتا رہا تو اس کا سورس کیا رہا ہے۔

اصل مقصد: 'انیسویں صدی' کے سیناریو کی جانب ایک جزوی واپسی!

پس یہ غیر معمولی واقعات اور جنگوں کا یہ ایک لامتناہی سلسلہ جن کا اکھاڑا آج آپ کا عالمِ اسلام بنا ہوا ہے... 'سرد جنگ' سے نکلنے کی کچھ خوفناک علامات symptoms ہیں۔ اس وقت کی ایک بڑی ترجیح مغرب کے ہاں: عالم اسلام کے کچھ اونچے اونچے ٹیلوں کو 'زمین کے برابر' لانا ہے۔ یہاں کچھ بڑی بڑی اکائیوں کو چھوٹے چھوٹے ریزوں میں بدلنا ہے۔ 'انیسویں صدی' کے سیناریو کو ضروری حد تک واپس لانا اس کے بغیر ممکن نہیں۔

(واضح رہے، 'انیسویں صدی' کا سیناریو پورے کا پورا واپس لانا ایجنڈا میں نہیں۔ یوں بھی 'انجینئرنگ' کی مہارتیں دشمن کے یہاں اب پہلے سے بہت بڑھ گئی ہیں اور 'اداروں' کا تجربہ بہت کچھ رنگ لا چکا ہے۔ کوئی یو-این نما چیز ہی اپنی کسی ترقی یافتہ تر شکل میں آئندہ عشروں کے دوران ایک مفید دریافت ثابت ہو سکتی ہے، خدانخواستہ)۔

'انیسویں صدی کے سیناریو' سے ہماری مراد یہ کہ: عالمِ اسلام کے وسائل گورے کے قدموں میں ڈھیر ایک 'خام مال' ہو اور یہاں کے انسان اُس کے مخلص 'مزارعے' اور 'مزدور' اُس کی درازیِ عمر کے لیے دعاگو۔

انیسویں صدی کا یہ سینار یو بڑی کم لاگت کے ساتھ ایک اور طرح بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ عالم اسلام پر قبضہ کیوں کرو، اور یہاں پر 'جنگ ہائے آزادی' ایسی کچھ طویل و عریض آزمائشوں کا سامنا کیوں کرو۔ عالم اسلام کو اپنا 'خام مال' اور 'مزارعے' اور 'مزدور' بنا رکھنے کا اس سے ایک کم خرچ اور آسان تر طریقہ بھی ہے: یہاں ایک ایک ضلع یا ڈویژن کے سائز کا ایک ایک ملک بنا دو، جن کے مابین جگہ جگہ وسائل اور پانیوں کے جھگڑے ہوں اور بات بات پر ان کے مابین بندوقیں نکل آیا کریں، جبکہ تم خود ان کے مابین صلح کرانے آیا کرو! (چھوٹے کاشتکاروں کا پانی کبھی پورا نہیں ہوتا؛ اور ان کی لڑائیاں بھی گھر کے دانے پورے کرنے کے لیے ہوتی ہیں، یعنی کچھ بہت ہی 'حقیقی اور بنیادی ضرورت کی' لڑائیاں جنہیں آدمی اپنے بھائیوں کے ساتھ بڑے ہی سچے جذبے کے ساتھ لڑتا؛ اور یوں دشمن کے مقاصد اپنے گھروں کے اندر بڑی اعلیٰ سطح پر پورے کراتا ہے! خدا اس بے بسی اور بے کسی سے ہماری نسلوں کو محفوظ رکھے)۔ مفلوک الحالی بھائی کو بھائی کا دشمن کر ہی دیتی ہے، پھر جبکہ ساتھ میں بھائی کو بھائی سے لڑانے کے کچھ اور (مذہبی، لسانی، علاقائی، عصبیتی) اسباب بھی تلاش اور مہیا کر لیے جاتے رہیں۔ خدانخواستہ، خدانخواستہ، بحرِ ہند کے ٹھیکیدار 'سوا ارب کے نیوکلیئر بھارت' کے پڑوس میں درجنوں چھوٹے چھوٹے بے کس بے سہارا لینڈ لاکڈ land-locked مسلم ممالک جو قدم قدم پر بھارت سے اپنا جائز حق لینے کے لیے بھی مغرب کی طرف دیکھیں! ایک مضبوط نیوکلیئر اسرائیل کے گرد درجنوں 'مڈل ایسٹ ممالک' جن میں سے کسی ایک کا سائز بھی کویت اور امارات سے بڑا نہ ہو! ایک نیوکلیئر فرانس کے دست نگر درجنوں شمال افریقی ممالک، جو صبح شام اُس کی بلندیِ اقبال کے لیے دعائیں کریں! ایک مضبوط حبشہ (اتھیوپیا) کے زیر سایہ درجنوں شرق افریقی ممالک، اِفلاس کے مارے اور اندرونی جنگوں کے کھائے ہوئے! علیٰ ھذا القیاس۔ عالم اسلام کو 'خام مال' اور 'مزدور' و 'مزارعے' رکھنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے جس کو لکھت پڑھت میں لا رکھنے کے لیے یو۔این کی کوئی نئی 'ترقی یافتہ'

جُون سامنے لانے کے پروگرام بھی زیرِ غور ہیں!

اس بنا پر؛ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ استعماری لشکر عالم اسلام پر انیسویں صدی کے قبضوں جیسا کوئی قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہماری نظر میں، مسلم ملکوں کے اندر ان کی حالیہ فوجی کارروائیاں (اور زیادہ تر پراکسی جنگیں) صرف عالم اسلام کی ایک "تشکیلِ نو" a redesigning of the Muslim world کی خاطر ہیں۔ جس کے بعد ہر خطے میں کوئی مقامی ٹھیکیدار پیدا کر کے [مثلاً جنوبی ایشیا میں بھارت، مشرق وسطیٰ میں اسرائیل (کسی حد تک شاید ایران بھی)، شمال افریقی ممالک پر فرانس اور شرق افریقی ممالک پر اتھیوپیا وغیرہ]، باقی ماندہ کنٹرول 'عالمی اداروں' کے ذریعے کیا جائے گا۔ لَا قَدَّرَ اللهُ، اگر ان کا ہاتھ پڑ گیا۔ مگر بہت امید یہ ہے کہ ہمارا عالمی جہاد اور اس کے کچھ دوست اللہ کی توفیق سے اُن کا یہ منصوبہ سرے چڑھنے نہیں دیں گے۔ عالمِ استعمار کو اگر اس مقام پر ناکام کروا دیا جاتا ہے تو یہ ان شاء اللہ عالم اسلام کی حقیقی آزادی کے حوالے سے تاریخ کا ایک ٹرننگ پوائنٹ turning pointہو گا۔

کسی مضبوط مسلم مملکت کو پنپتا چھوڑنا استعمار کے لیے ناقابل برداشت کیوں؟

پیچھے ہم بات کر آئے، سرد جنگ کے سرے لگنے کے بعد استعمار کو خواہش ہوئی ہے کہ عالم اسلام میں انیسویں صدی والا سیناریو پورا نہ سہی، ایک حد تک بحال کیا جائے۔ یعنی مسلم دنیا اپنے وسائل اور باشندوں سمیت پھر سے گورے کے قدموں میں ڈھیر ایک خام مال ہو۔ یہاں کوئی مقامی قوت ایسی مضبوط اور شہ زور نہ پائی جائے کہ یہاں کے باشندے اپنے وسائل اور اپنے مفادات کے معاملے میں آپ اپنی قسمت کے مالک ہوں اور وسائل کے معاملے میں گورا یہاں سے بے دخل و بے اختیار کر دیا جائے۔

ایک اور چیز البتہ گورے کو اس سے بھی بڑھ کر پریشان کرتی ہے...

آج نہ سہی کل، کل نہ سہی پرسوں، کسی اندرونی اصلاح کے نتیجے میں اسلامی قیادتوں کے زیر اثر افراد کا اقتدار میں آنا یہاں خارج از امکان بہرحال نہیں ہے۔ (ترکی میں اسلامی ہوائیں چل پڑنا آخر کس کے گمان میں تھا؛ جہاں اقتدار کی سطح پر بھی معاملہ اب 'باعثِ تشویش' ہی ہے۔ مصر کی صورتحال 'باعثِ تشویش' ہوتی ہوتی رہ گئی۔ اور کئی مثالیں آگے پیچھے اسی قبیل کی 'باعثِ تشویش' آسکتی تھیں اگر عرب بہار لہورنگ نہ کر دی جاتی۔ عالمِ عرب کو تو اِسی خطرے کے پیش نظر 'جمہوریت بی' کی جھلک نصیب نہیں جب تک کہ کوئی لمبی چوڑی انجینئرنگ یہاں کی نہ کر دی جائے!)

مقصد یہ کہ ایک بنابنایا مضبوط ملک اپنے وسائل اور اپنے فیصلوں پر مکمل کنٹرول رکھنے والا اور کسی دوسرے کو پاس نہ پھٹکنے دینے والا، ایسے کسی خطرے کے لیے چھوڑیں ہی کیوں جہاں کسی احمد سرہندی کے گہرے و دُوررَس عمل کے نتیجے میں اسی اکبر کی مسند پر دنیا ایک روز کسی عالمگیر کو جلوہ افروز دیکھے! نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مسلمانوں کی کوئی ایسی مضبوط خود مختار (اپنے فیصلوں کی آپ مالک) اِکائی آخر ہو ہی کیوں؟

لہٰذا ایک غیر اسلامی نظام کے ساتھ بھی کوئی مضبوط مسلم اکائی چھوڑنا دُوررَس طور پر خطرے کا سودا ہے! آج جب یہ مسلم ممالک بحرانوں میں گِھرے ہیں، 'فیصل' اور 'ضیاء الحق' ایسے ناگہانی خطرات تو پھر بھی یہاں سر اٹھا لیتے ہیں! (جنہیں 'راہ سے ہٹانا' بالآخر مجبوری ہو جاتی ہے)! بھلا کوئی ایسا دور جب ان ملکوں کے ہاں دُور دُور تک کوئی بحران بھی نہ ہو اور یہ اپنے فیصلے آپ کرنے کی پوزیشن میں بھی ہوں (بیرونی مداخلت والی اِس پوری صورتحال سے باہر ہوں؛ اور آپ اپنی کر کے کھا رہے ہوں) تو تب اگر یہاں کوئی فیصل یا کوئی ضیاء الحق اٹھ کھڑا ہوا تو کیسا کیسا ڈراؤنا سیناریو نہیں ہو سکتا! یہاں تو کچھ پکے پکے انتظامات کر کے جانا ہو گا اس بار! بیڑہ غرق ہو دو عالمی جنگوں اور ان کے بعد چلنے والی ایک

طویل سرد جنگ کا جو 'انیسویں صدی' ہاتھ سے نکل گئی۔ اب یہ جو ایک موقع ہاتھ آیا ہے (سرد جنگ سے فراغت)، اس کو بھی ضائع کر دیں تو گورے کو عقلمند کون کہے! پکے انتظامات بھائی صاحب! یہاں کوئی مسلم اکائی، خواہ فی الحال وہ کیسے ہی غیر اسلامی نظام پر کیوں نہ کھڑی ہو، اور خواہ وہ اپنے نظام یا تہذیب کے معاملہ میں سن 92ء کے بوسنیا اور کوسووا کا نقشہ کیوں نہ پیش کر رہی ہو، ایک مضبوط مستحکم حالت میں چھوڑو ہی مت۔ یہ نہیں تو اِن کی نسلوں میں اس لا الٰہ الا اللہ کو سوچ سمجھ کر پڑھنے والے ضرور پیدا ہوں گے۔

حالیہ صلیبی مہم: مسلم اکائیوں کا چُورا کرنا

استعماری قوتوں کا مقصود دو پوائنٹوں میں آ جاتا ہے:

1. مسلم دنیا کے اندر جو بڑی بڑی اور مضبوط اکائیاں ہیں وہ کسی طرح ہلکی پھلکی کر دی جائیں تاکہ بیرون سے ان کی 'سرپرستی' مستقل بنیادوں پر جاری رہنا ممکن ہو۔
2. یہاں کے نہ صرف نظاموں کو بلکہ معاشروں ہی کو ارتداد کی راہ پر ڈال دیا جائے۔

(دوسری چیز ہماری آئندہ فصل میں ذکر ہو گی۔ یہاں پہلی کا کچھ بیان ہے)

انسانی وقائع اس پر شاہد ہیں، کوئی اکائی ایک بار توڑ دی جائے تو اس کی بحالی پھر جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش کے ساتھ آپ اکٹھے تھے سو تھے۔ لیکن اب اگر دونوں طرف بڑی ہی مخلص قیادتیں آ جائیں (فی الحال ایک مفروضہ) تو وہ بھی ان دو 'ٹکڑوں' کو ایک کر کے شاید ہی کبھی دکھا سکیں۔ یعنی ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ پورا 'مشرقِ وسطیٰ' چند عشرے پہلے (عثمانی دور میں) ایک ملک تھا۔ جی ہاں پورا 'مشرقِ وسطیٰ' ایک ملک، جس پر ابھی چند عشرے ہی گزرے ہیں۔ لیکن اب یہ ایک درجن سے زائد ملک ہیں اور یوں گویا ہمیشہ سے الگ الگ ملک! ان میں سے ہر کوئی 'الگ تھلگ قوم' جو دنیا جہان کی قوموں سے جوتے کھا سکتی ہے مگر اپنی 'الگ تھلگ' حیثیت پر آنچ آنے نہیں دینے والی! یعنی گورے نے (اپنے دورِ اول میں) یہاں

قبضہ کرنے اور یہاں کی قوموں کو غلام بنانے پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ وہ ایک ایسا دُوررَس کام بھی "مشرقِ وسطیٰ" میں عین اُسی ملبے کے اندر کر گیا ہے کہ کبھی یہ آزاد بھی ہولیں تو آپس کی یہ دراڑیں ختم نہ کر سکیں۔ بلکہ اِن دراڑوں کو اپنا وجود اور اپنی زندگی جان کر ان کے لیے لڑیں۔

غرض ایک اکائی جب ایک بار ٹوٹی تو پھر مشکل سے جڑنے کا نام لیتی ہے۔ آپ دیکھ لیں گے کبھی ان ملکوں میں شریعت کی حکمرانی واپس آئی تو بھی ان فاصلوں کو ختم کرانا آسان کام نہ ہوگا۔ (جن لوگوں کا خیال ہے ادھر 'خلافت' کا بٹن دبایا جائے گا ادھر عالم اسلام کے سب ٹکڑے برق کی تیزی کے ساتھ آن جمع ہوں گے، وہ کسی خوش فہموں کی جنت میں رہتے ہیں، ہمارے نوجوانوں کو لازماً ایسی خیالاتی دنیا سے نکلنا ہوگا)۔

آپ کو یاد ہے بنوعباس اور بنوامیہ کے مابین اندلس کا بقیہ عالم اسلام سے کٹنا ہمارے اسلامی دور میں ہی ہوا تھا، جسے پہلی پوزیشن پر واپس لانا پھر مسلسل دوبھر رہا۔ اس کے علاوہ بھی الگ الگ امارتوں کی جہاں کوئی صورت بنی انہیں پہلے والی پوزیشن پر واپس لانا کبھی آسان نہیں رہا، باوجود اس کے کہ اُس دور میں انکل سام عالم اسلام میں دندناتے بھی کہیں نہیں پھر رہے تھے۔ پھر جبکہ یہ الگ الگ امارتیں محض کچھ انتظامی اکائیاں تھیں نہ کہ دورِ حاضر کی طرح باقاعدہ 'قومیتیں'۔ پھر بھی ایک بار ٹوٹ چکی چیز کو جوڑنا اس قدر مشکل تھا۔ جوڑنے کے کچھ واقعات ہماری تاریخ میں ہوئے ضرور؛ مگر تلوار کے اچھے خاصے استعمال کے بعد۔ یعنی ایک ایسا مشکل آپشن کہ مسلمانوں کو ایک ممکنہ بڑی وحدت میں نہ لے کر آئیں تو مار کھائیں اور اگر وحدت میں لے کر آئیں تو مسلمانوں کے مابین خونریزی کے ایک ناگوارترین عمل اور عصبیتوں کے ایک دریا سے گزر کر؛ اور کسی کسی وقت تو معاملہ اسی خونریزی اور باہمی دشمنی میں دب کر رہ جائے۔ یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کا ٹکڑے ہونا سب سے بڑی نحوست جانا گیا ہے، کیونکہ یہ اپنے اندر صدیوں کے مضمرات رکھتا ہے؛ اس (شیرازہ بکھرنے) سے بچنے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دیناوارے کا جانا گیا ہے۔

یہاں چیزیں ٹوٹ آسانی سے جاتی ہیں، لیکن جڑنے کا نام پھر نہیں لیتیں خواہ کیسے ہی سورما اس کے لیے زور لگا لیں، الا ماشاء اللہ۔ یہ ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جغرافیائی اکائی چاہے ایک غیر شرعی نظام کے تحت بھی ہو، آج اگر لخت لخت کرائی جاتی ہے تو اس میں مسلمانوں کا ڈھیروں نقصان ہے۔ لہٰذا ایک غیر شرعی نظام ہے تو بھی ہم یہ قبول نہیں کر سکتے کہ وہ جیسے چاہیں ہمارے ٹکڑے کر جائیں کہ کیا فرق پڑتا ہے ایک غیر شرعی نظام ہی تو ہے! (وہی سوچ جس کا ہم نے اپنے اِس مضمون کے گزشتہ حصے میں جائزہ لیا ہے)۔ بھائی آپ کا جو حصہ ایک بار ریزہ ریزہ ہو گیا، وہاں کبھی دیندار لوگ اقتدار میں آ جائیں تو بھی ان کے لیے اس چُورے کو واپس وحدت میں لانا کوئی آسان کام نہ ہو گا۔ مع کچھ دیگر مفاسد۔ یہ شیرازہ جتنا منتشر ہو گا اتنا آپ کے لیے مسئلہ ہو گا۔ اور دشمن کا کام آپ کے خلاف اُس وقت بھی آسان کیے رکھے گا (اور اب تو رکھے گا ہی؛ بلکہ وہاں پہنچنے ہی آپ کو کیوں دے گا)۔ لہٰذا اپنے وجود پر دشمن کا اِس قسم کا کوئی وار ہم تو (اپنا بس چلنے کی حد تک) آج بھی نہیں ہونے دیں گے۔

ہمارا دشمن اس حقیقت کو خوب جانتا ہے اور عالم اسلام کی ایک نئی انجینئرنگ کرنے کے مشن پر کسی قدر کامیابی سے گامزن ہے:

⟸ عراق جو مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی فوجی قوت تھا، نیز عرب وحدت کا روحِ رواں ہونے کے باعث کسی وقت ایک مجوزہ 'عرب یونین' کا جرمنی کہلاتا تھا، بڑی ہی کامیابی کے ساتھ تین ٹکڑے کیا جا چکا، جو چار تک پہنچ سکتے ہیں۔ نیز وہ عراق اب نرا تین یا چار ٹکڑے نہیں۔ بلکہ ایسا 'تین چار ٹکڑے' ہے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ہزار سال تک آپس میں لڑ سکتے ہیں، سوائے یہ کہ ان میں صلح صفائی رکھنے والا کوئی 'عالمی' سیانا امنِ عالم کا ٹھیکیدار ان 'کھلنڈروں' کے سر پر دستِ شفقت رکھنے کو موجود اور ان پر مسلسل مہربان رہنے کو تیار ہو!

⟸ لیبیا عملاً کئی ٹکڑے ہو چکا؛ جو کہ متحارب بھی ہیں۔

⇐ سوڈان اس سے پہلے دولخت کیا جا چکا، اور مزید تقسیم کے لیے تیزی کے ساتھ مہرے ہلائے جا رہے ہیں۔

⇐ یمن کے ٹکڑے تقریباً ہو چکے، آگے ابھی کچھ معلوم نہیں کیا بنتا ہے، اور معاملات کا سلجھنا کچھ ایسا آسان نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ سعودیہ کا اپنا ہاتھ چکی میں آچکا ہوا ہے۔

⇐ خود سعودیہ کے لیے ایک بڑا 'سرجری پلان' زیر عمل ہے، جس پر سعودیہ کی پریشانی اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ سعودیہ اس وقت عملاً کئی جہت سے حالتِ جنگ میں ہے۔ ایک مضبوط ترکی اور ایک مضبوط پاکستان حالیہ سیناریو میں نہ ہوتے (نیز شاہ سلمان کا تُرک-سعودی تعلقات کے بگاڑ کو دنوں کے اندر کامیابی کے ساتھ دور کر لینا، بلکہ داخلی و خارجی سطح پر تعلقات و معاملات کو چشم زدن میں ایک نئی ترتیب دے لینا) تو دیکھتے امریکہ اس بار کہاں تک کام آتا ہے۔ سعودیہ کا دھڑن تختہ خدانخواستہ اب تک ہوا ہوتا۔ خطرہ اب بھی گیا کہیں نہیں ہے، اور اللہ سے اچھی ہی امید رکھنی چاہیئے۔

⇐ مصر کو عدم استحکام میں جھونکنے کے زوردار عوامل اندرونی و بیرونی سطح پر اس کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں، لیکن وہاں پر داخلی جنگجوئی militancy کے جن تجربات سے (اَسّی اور نوّے کی دہائی میں) وہاں کے دینی حلقوں کو خوب کان ہو چکے، اغلباً وہی اس میں مانع ہے کہ ایسی کوئی مہم جوئی وہاں از سر نو شروع ہو اور پھر ایک غیر اختتام پزیر خانہ جنگی کی ابتداء بن جائے، گو 'کوششیں' اس کے لیے ہر طرف سے جاری ہیں!

⇐ شام ایک خون آشام صورتحال میں سرتا سر گرفتار ہے، جس سے نکلنے کی کوئی صورت سامنے نہیں آرہی، بلکہ اور سے اور الجھتی جارہی ہے۔ (کچھ تسلی شام کے

حوالے سے ابھی ہے تو وہ اردگان ایسی قیادت کا پڑوس میں موجود ہونا ہے، جو شروع سے وہاں کے مظلوم اور بے بس عوام نیز ان کی مددگار مقامی قوتوں کے ساتھ تعاون کی کچھ مناسب صورتیں رکھتی ہے۔ بلکہ اردگان ایسی قیادت کے خطہ میں موجود ہونے کے باعث یہ تک امکان ہماری نظر میں موجود ہے (نیز دعاء ہے) کہ شام کا معاملہ اسلام کے حق میں بٹھانے کی کوئی ویسی یا اُس سے بھی بہتر صورت اللہ کی توفیق سے سامنے آجائے جیسی افغانستان کا مسئلہ پاکستان کے تعاون سے اسلام کے حق میں بٹھانے کے اندر کامیابی پائی گئی تھی)۔

⇐ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے 'رہائی' تو بڑی دیر پہلے دلوائی جاچکی، جس کے لیے 'بنگلہ دیش' آج تک کسی کا زیرِبار ہے! انڈونیشیا سے ایسٹ تیمور کو 'آزادی' بھی اِس 'نائن الیون' والے ہلے سے پہلے ہی دلائی جاچکی۔ مگر اب تو عالم اسلام کا ہر بڑا رقبہ یا زیادہ آبادی یا مضبوط فوج رکھنے والا ملک سیدھا سیدھا نشانے پر ہے۔ اس کے ایک ایک رخنے پر اہلِ کفر کی نظر ہے۔ یہاں 'علیحدگی' کی نوبت لے آسکنے والے کمزور سے کمزور عوامل اُن سے غیر معمولی توجہ پاتے ہیں۔ مذہبی یا سیاسی یا لسانی تفرقہ پیدا کرانے والے سب عناصر کو اُن کی پوری آشیرباد ملتی ہے۔ قومی یکجہتی کو ختم کرنے اور اجتماعی عزائم کو شل کرنے والی سب بغض کی ماری زبانیں اور اقلام اُن کے 'پے رول' پر رہتے ہیں۔ اور یہ سب باتیں اب کوئی راز نہیں۔ غرض ایسے کسی بھی مسلم ملک کو توڑنے کی امکانی صلاحیت رکھنے والے عوامل خاصی مکاری اور حیلہ جوئی کے ساتھ پیدا کرائے جارہے ہیں۔ اور حسب ضرورت دھونس سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

⇐ پاکستان اُن کا ایک بڑا ہدف ہے، جیسا کہ پیچھے گزر چکا۔ ہمارے حلقوں میں بیٹھنے والے اصحاب جانتے ہیں، ہم اپنی نجی مجالس میں بارہا کہہ چکے، عراق ایسی

مضبوط فوجی طاقت کا چند سالوں میں جو حشر کر دیا گیا، عالمی قوتوں کے تیور پاکستان کا اس سے برا حشر کرنے کے تھے؛ پاکستان بلاشبہ عراق سے زیادہ اُن کی نظر میں کھٹکتا رہا ہے۔ امکانی طور پر potentially ہمارے اِس ملک میں جو جو متحارب عناصر ہو سکتے تھے ان سب کو بھڑوانے، اور یہاں آگ بھڑکانے والے جو جو عوامل ہو سکتے تھے ان سب کو ہوا دینے کی پوری کوشش کر لی گئی۔ ہمارے پڑوس کی کچھ کینہ پرور انٹیلی جنسیں، نیز کچھ عالمی جاسوسی ادارے اور ان کی بغل بچہ تخریب کار تنظیمیں (مانند بلیک واٹر وغیرہ) پاکستان کو داخلی طور پر عدم استحکام کا شکار کرنے اور یہاں کے لوگوں سے ایک دوسرے کا گلا کٹوانے کے بے شمار جتن کر چکیں۔ بہت بہت ہوم ورک کیا گیا۔ لیکن ایک تو اللہ کی حفاظت۔ دوسرا یہاں پر ایک نہایت چوکس اور پیش بند پیشہ ورانہ دفاعی بندوبست کا موجود ہونا۔ کہ نہ صرف داخلی طور پر دشمن کا کہیں ہاتھ نہیں پڑنے دیا گیا۔ بلکہ افغانستان میں دشمن منہ کی کھا رہا ہے۔ بلکہ کشمیر میں مسلمان عنقریب ایک نئے سرے سے سر اٹھانے والا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کا مسلمان ایک نئی جرأت کے ساتھ کھڑا ہونے کے امکانات لا چکا ہے، بعد اس کے کہ اِس پورے خطے میں مسلم امیدوں پر تقریباً پانی پھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ بلکہ بعید نہیں بھارت کا سکھ ایک بار پھر اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ البتہ خطرہ ظاہر ہے ابھی پاکستان سے ٹلا نہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، دشمن ابھی کیا کیا حربے آزمانے والا ہے۔

کوئی وجہ ہے کہ ہمارے مشائخ ''جہاد'' کو مسلم مقبوضہ سرزمینوں کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں

یہ وجہ ہے کہ ہم اپنی تحریروں میں بار بار اس پر زور دیتے آئے ہیں کہ وہ چیز جسے آپ

”جہاد“ کہتے ہیں اس کا دائرہ متعین کر رکھنا اندریں حالات بے حد ضروری ہے:

”جہاد“ کا دائرہ فی زمانہ امت کی وہ سرزمینیں ہیں:

1. جہاں پر صلیبی یا صیہونی یا بھارتی وغیرہ افواج قابض ہیں۔ مانند فلسطین، افغانستان، عراق، کشمیر وغیرہ مقبوضہ مسلم خطے۔ تا کہ

أ. ہمارے قومی جذبے اور ہماری ملّی مزاحمت کی چوٹ براہِ راست استعماری دشمن پر پڑے؛ جو اِن مقبوضہ خطوں میں بیٹھ کر بقیہ عالم اسلام کو سبوتاژ کرنے اور مسلم دنیا میں اپنے کچھ لمبے چوڑے منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچانے میں مصروف ہے۔

ب. اور تا کہ ہماری قربانیاں مسلسل اس جہت میں بڑھیں کہ عالمِ اسلام میں اودھم مچاتے یہ بڑے بڑے ہاتھی اور ان کی معیشتیں جن پر انہیں بڑا مان ہے، ذرا خوب نُچڑ لیں (بلیڈ bleed کر لیں)۔ اور اِسی دوران مسلم طاقتیں کچھ مزید قوت، تجربہ اور اعتماد پید کر لیں۔

ج. نیز ایک ایسی غیر مبہم مزاحمت کے نتیجے میں امت اپنے دشمن کو بھی خوب پہچان لے۔

د. نیز اپنے دشمن سے برسرپیکار، اور اپنی زمینوں اور اپنی عزتوں کے رکھوالے مجاہدین کو بھی امت خوب پہچان لے، بلکہ حسبِ استطاعت انہیں اون own کرے۔ یوں کسی لمبی چوڑی الجھن کے بغیر، عملاً، یہ دوملتوں کی جنگ بنے۔

ھ. نیز اِس مرحلہ میں مقبوضہ مسلم خطوں کا یہ واضح، سادہ اور آسان کیس دنیا میں انسانی بنیادوں پر منوانے کے لیے، ایک مؤثر ابلاغی حکمتِ عملی کے ذریعہ سے، غیر مسلم دنیا کے غیر جانبدار ذہنوں تک

کو اپنی تائید پر ابھارا جائے۔ یوں فلسطین و کشمیر وغیرہ ایسے خطوں میں برسرِپیکار مجاہدین کی تنہائی کو ممکنہ حد تک کم کیا جائے۔

(یورپ اور امریکہ کا وہ طبقہ جو اپنی حکومتوں کی ظالمانہ پالیسیوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور کچھ منصفانہ ایشوز کے حق میں کھل کر بولتا ہے بشرطیکہ اس تک رابطے کے کچھ کامیاب پل تعمیر کیے جائیں... مسلم خطوں کے ایشو کو اٹھانے کے لیے اس فیکٹر کو ہرگز معمولی نہ جاننا چاہیئے۔ ان آخری سالوں میں حماس کی جانب سے معاملے کی اس جہت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں فرانس اور برطانیہ کی حقوقِ انسانی کے لیے کام کرنے والی بے شمار تنظیمیں اور شخصیات اسرائیلی مظالم کے خلاف آواز اٹھانے لگی ہیں۔ یہاں تک کہ غزہ کا حصار توڑنے کے لیے چلنے والے فلوٹیلا میں آزاد مغربی شخصیات اور تنظیمات بھاری تعداد میں شریک ہو کر پوری دنیا کو حیران کر گئیں۔ جس کے بعد یورپی رائے عامہ میں اسرائیل مخالف ہوائیں چلنے لگیں۔ اس کے نتیجے میں برطانوی اور امریکی 'جمہوریت' کی دورُخی تک آزاد ذرائع کا موضوع بننے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ مقبوضہ خطوں میں برسرِپیکار مجاہدین نے اِس جہت پر یا تو سوچا نہیں یا ابھی تک اِس جہت پر زیادہ سرگرم نہیں ہو پائے۔ ورنہ دشمن کی مشکل اِس ترکیب سے دوچند کی جا سکتی ہے)۔

2. ایسے مقبوضہ خطوں کے حوالے سے وہاں کے مقامی نیز عالمی اسلامی تحریکی طبقوں کی رائے عامہ تدبیری طور پر بھی وہاں پر جہاد کے حق میں ہو۔ کیونکہ کسی محاذ کو کھولنے یا نہ کھولنے کے معاملہ میں امت کی عقول کی جانب رجوع لازم ہے؛ اگرچہ شرعاً ایسے کسی مقبوضہ خطے میں قتال کی

گنجائش ہو بھی۔ امت کے بڑے دماغ اور سیانی تجربہ کار عقول کی جانب ان معاملات کو تدبیری طور پر لوٹانا اشد ضروری ہے۔ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ۔[5] استنباط (معاملے کی گہرائی میں جانے) کی صلاحیت نہ رکھنے والے لوگ ایسے سنگین اور دُوررَس تاثیر رکھنے والے معاملات میں امت کے مرجع نہیں ہونے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ: بوجوہ یہ ضروری تھا، اور ہے، کہ قتال (جنگ) کا معاملہ — اِس پورے سیناریو میں — اُن مسلم مقبوضہ خطوں کو آزاد کرانے تک ہی محدود رہے جو آج کسی صلیبی یا صیہونی یا بھارتی وغیرہ فوج کے بوٹوں تلے پامال ہو رہا ہے۔

پاکستان کے دینی حلقے.. اپنی تاریخ کے بدترین بحران میں

حق یہ ہے کہ ہمارے دینی تحریکی حلقوں کی مین سٹریم main-stream دورِ حاضر میں قتال کو مسلم مقبوضہ خطوں (مانند فلسطین، کشمیر، عراق، افغانستان وغیرہ) تک ہی محدود رکھنے کی قائل ہے۔ اس معاملہ میں قطعاً دورائے نہیں۔ (چند شاذ طبقوں کا معاملہ اور ہے، ہم یہاں دینی تحریکی حلقوں کی مین سٹریم کی بات کر رہے ہیں)۔ ***دوبارہ عرض کر دیں:*** ہمارے دینی تحریکی حلقوں کی مین سٹریم — نظریاتی سطح پر بھی اور عملی سطح پر بھی — "قتال" ایسی سرگرمی کو مسلم مقبوضہ خطوں تک ہی محدود رکھنے کی قائل ہے۔ اور یہ حقیقت ہمارے ان تحریکی حلقوں کی بابت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

البتہ ہمارے دینی طبقوں سے کسی درجے میں جو ایک کوتاہی ہوئی وہ یہ کہ: قتال کے عمل

---

[5] (النساء:83) جب اِنہیں امن یا خوف ایسا کوئی معاملہ پیش آیا، تو یہ لگے اسکو ہر طرف پھیلانے۔ حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنے ذمہ دار لوگوں کی طرف لوٹا دیتے تو معاملے کی تہہ تک پہنچنے والے اس پا لیتے۔

کو مسلم مقبوضہ خطوں کی بجائے عام مسلم سرزمینوں (مانند سعودیہ، پاکستان، ترکی وغیرہ) میں گھسیٹ لانے کے آگے جس درجہ کا فکری وسماجی بند باندھنے کی ضرورت تھی وہ شاید ہم سے نہیں باندھ پایا گیا۔ (ایسا کوئی فکری بند باندھنے کی استعداد بھی الاماشاءاللہ یہاں کم دیکھی گئی، جس پر ہم آگے چل کر کچھ بات کریں گے)۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلم ممالک میں قتال و خونریزی کو 'اسلام' کے ساتھ جوڑنے کا عمل تقویت پانے لگا۔ درست ہے کہ مسلم ملکوں میں قتال اور خونریزی کو اسلام سے جوڑنا دینداروں کے ایک انتہاپسند طبقے میں پایا گیا ہے، (اور اس کا خمیازہ جہاں پوری قوم نے بھگتا وہاں دینداروں نے اور دینداروں کے اسلامی کاز Islamic cause نے کہیں زیادہ بھگتا)۔ تاہم اس چیز کو ابلاغی سطح پر پھیلانے اور ہوا دینے پر زیادہ محنت یہاں کے لبرل بلاک کی ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے بڑی بڑی ذہین چالیں چلی گئیں۔ **دوبارہ واضح کردیں:** مسلم سرزمینوں میں عسکریت کو 'اسلام' کے ساتھ جوڑنے کے جو رجحانات یہاں پیدا ہو رہے تھے، دینداروں کو وہ رخنہ بڑی ابتداء میں ہی بند کرتے نظر آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ اس کا نقصان مسلم سرزمینوں کے داخلی استحکام کو تو ہوتا ہی ہوتا (اور یہ بھی دراصل دینداروں ہی کا نقصان تھا؛ اِن کی قربانیاں اِن مسلم سرزمینوں کے لیے آزادی سے پہلے بھی رہی ہیں اور بعد میں بھی، اور یہ بات ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہے) البتہ دینی کاز cause کو اِن ممالک میں اس سے جو نقصان ہونے والا تھا وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہاں اِس چیز کو بروقت بھانپنے میں ـــــ یا یوں کہیے کہ پوری طرح بھانپنے اور اس کے سنگین مضمرات کا پیشگی، دُوررَس اندازہ کرنے میں ـــــ ہمارے دینی سیکٹر سے ضرور کچھ کوتاہی یا تاخیر ہوئی ہے۔

یہاں سے ہمیں دہری مار ملی:

1. مسلم ملکوں کو غیر مستحکم کرنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ اس معاملے کی سنگینی اِس پوری فصل میں مختلف جہتوں سے ہم بیان کر آئے۔
2. چونکہ اسلام کو بھی اس چیز کے ساتھ جوڑا گیا، لہٰذا چشمِ تاریخ پہلی بار آج

دیکھ رہی ہے کہ:

i. یہاں کے لبرل بکاؤمال کو 'ملک کے ہمدرد و خیر خواہ' کے روپ میں آناملا۔

ii. جبکہ دینداروں کی ملک اور قوم سے وفاداری پر انگلی اٹھائی جانے لگی۔

دونوں چیزیں اِس ملک کی تاریخ میں پہلی بار!!!

اس سے زیادہ غیر حقیقی تصویر اِس ملک کے بدخواہ لبرلز کی کبھی دیکھی گئی تھی اور نہ ملک کے لیے قربانیوں کی پوری ایک تاریخ رکھنے والے اور اب بھی ملک کی سالمیت کے لیے بے چین رہنے والے دینداروں کی۔

غرض... باہر کے صلیبیوں اور اندر کے لبرلوں کی چاندی ہی چاندی:

1. مسلمانوں کی بڑی آبادیوں، وسیع رقبوں، طاقتور فوجوں اور مضبوط عسکری صلاحیت کی مالک اکائیوں کو (کہ جو یہاں انیسویں صدی والے سیناریو کی بحالی میں اس وقت ایک بڑی رکاوٹ ہیں) ایک گہری دُوررَس چوٹ بھی لگاؤ۔ جس سے 'انیسویں صدی سیناریو کی جانب جزوی واپسی' یہاں ممکن بنائی جا سکے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، اِس کی کوئی صورت بنے۔

3. اور مسلمانوں کو اتنی گہری دُوررَس چوٹ لگانے کے باوجود مسلمانوں کے خیر خواہ اور مددگار بھی نظر آؤ: [جو (بیچارے!) 'دہشتگردی' کے خلاف مسلمانوں کی مدد کو آئے ہوئے، اور 'مسلمانوں کے غم میں' قربانیاں دیتے، پہاڑوں کی خاک چھانتے (عالم اسلام کے کئی خطوں پر براہ راست قبضے کرتے اور باقیوں کو غیر مستحکم کرتے) پھر رہے ہیں!]۔

4. اور پھر یہ سارا ملبہ 'اسلام' پر بھی ڈال دو۔ کہ جس کے قرآن میں "جہاد" پر ایسی آیتیں ہوں اس کو پڑھانے والے مدارس سے 'دہشتگرد' ہی تو نکلیں گے۔ یہاں سے 'دہشتگردی' کے خلاف اِس جنگ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ

’قرآن پڑھنے پڑھانے والوں‘ کی طرف پھیر دو۔ ’مسجدوں اور داڑھیوں‘ کے پیچھے لگادو۔ یوں عالم اسلام میں اپنے بہت سے رُکے ہوئے کام خاص اِسی موقع پر کروالو: ایک پابندِ اسلام مسلمان ہونا یہاں باقاعدہ خطرے کی علامت ٹھہرا دو۔ یہاں تک کہ اسلامی شعائر کی پابندی کرتے ہوئے، کہیں یورپ میں نہیں، خود مسلم ملکوں میں لوگ اپنے آپ کو غیر محفوظ، جبکہ بے دین مظاہر اختیار کرتے ہوئے خود کو محفوظ ومامون جاننے لگیں۔ غرض میڈیا کے اس عفریت سے کام لے کر اس جنگ کو باقاعدہ نفسیاتی حربوں میں ڈھال دو۔

قادیانی اور جدت پسند ’انکارِ جہاد‘ .. انیسویں صدی والے پنجرے کا ’شرعی‘ دروازہ

جیسا کہ ہم نے کہا، وہ ایک رخنہ جو یہاں کے شدت پسندوں نے پیدا کر کے دیا، یہاں بہت سے طبقوں کے لیے ’جاب امکانات‘ job opportunities پیدا کرلایا۔ اسلام دشمنی کے بڑے بڑے پرانے پراجیکٹ ہرے ہوگئے۔

کسی فکر کے ’سامنے آنے‘ کی تاریخ ہی دیکھ لی جائے تو اس پر ’علمی‘ بحث کی ضرورت خاصی حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ ’انکارِ جہاد‘ کا پہلا نعرہ ایک بڑی سطح پر امت کی تاریخ میں انیسویں صدی کے اندر لگا تھا، جب استعمار کو اس نعرے کی اشد ضرورت تھی۔ استعمار کی اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قادیانی نے دلائل کا صغریٰ و کبریٰ ملا کر یہ نکتہ پیش کیا کہ ”جہاد“ کے نام پر استعماری طاقتوں کے خلاف اٹھنا خلافِ شریعت ہے۔ قادیانی کی یہ دوکان کوئی دن اور چلتی، مگر اللہ نے استعمار کو یہاں سے چلتا کیا اور مسلم قوموں کو آزادیاں دلوادیں کہ جاؤ اپنا ایک آزاد جہان پیدا کرو اور اُس غلامی کے اسباب دوبارہ پیدا کرنے سے احتراز کرو۔ یہاں؛ قادیانی ڈسکورس اپنی موت آپ مر گیا، بحثوں اور مناظروں کی ضرورت جاتی رہی۔ وہ

مسلم سرفروش جو دورِ استعمار میں اِن سرزمینوں کی آزادی کے لیے جہاد کرتے رہے تھے، پسِ آزادی اِن مسلم قوموں کے ہیرو ٹھہرے۔ اُس دور کا ہر بطلِ حریت یہاں کے جیسے کیسے نصابوں میں آج سراہا اور ہیرو ہی مانا جاتا ہے، وللہ الحمد۔ تب سے انکارِ جہاد کی 'دلیلیں' بوسیدہ ہو رہی تھیں؛ اور امید تو یہ تھی کہ اب یہ کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ جو بھی ان کا ذکر کرتا دورِ غلامی کی ایک یادگار کے طور پر کرتا۔ اور ہے بھی یہ دورِ غلامی کے ساتھ ہی مخصوص۔ ہمارے تاریخ نگار تک یہ لکھنے لگے تھے کہ دورِ استعمار ہم پر یہ نوبت لے آیا کہ مسلمانوں کے یہاں جہاد کا انکار ہونے لگا۔ روس کے خلاف جہاد کے سالوں میں بھی یہ 'دلیلیں' تھیلے سے باہر نہ آئیں؛ کیونکہ اُس وقت یہ مغربی بلاک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بلکہ تب مغربی بلاک کو الٹا جہاد کے حق میں فتوے درکار تھے۔ سو 'انکارِ جہاد' کا وہ قادیانی مقدمہ بوسیدہ پڑا رہا؛ کوئی اس کا خریدار نہ تھا۔ (اس کے 'خریدار' باہر سے ہی ہو سکتے ہیں؛ اور باہر والے اللہ کا شکر ہے جا چکے تھے)۔

تا آنکہ استعمار کو عالم اسلام میں پھر سے ایک مہم درپیش ہوئی، پورے سوا سو سال بعد۔ سن 2001ء۔ جہاد کو شریعت کے خلاف ثابت کرنے کی ایک بار پھر 'ضرورت'۔ زمانہ اب وہ نہیں؛ ہماری آزادی کے ساتھ قادیانی بھی دائرۂ اسلام سے خارج قرار پا چکے (یہ الگ سے ایک 'دُکھتی رگ' ہے!)۔ اب عالم اسلام پر قابض قوتوں کے خلاف جاری مزاحمت کے خلاف بولے تو کون؟ یہاں؛ استعماری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے 'جدت پسند' تحریک اٹھی۔ وہی پرانی شراب نئے جام میں: افغانستان، فلسطین، کشمیر وغیرہ میں مسلمانوں کا کافر حملہ آور کے خلاف ہتھیار اٹھانا خلافِ شریعت ہے! یعنی خدا کو ناراض کرنے کا سبب! دین اس کو فساد کہتا ہے! افغانی، فلسطینی، عراقی، کشمیری مجاہد نہیں درحقیقت فسادی ہیں! اب آپ خود اندازہ کر لیجئے، ایک مزاحمت جو اپنا تمام جذبہ "دین" اور "ایمان" سے لیتی اور غاصب کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے، اسے کچلنے کے لیے ایسی 'شرعی دلیلوں' سے بڑھ کر اور اُسے کیا چاہئے؟ 'بندوق' تو پہلے ہی اُس کے پاس ہے جس سے وہ ہمارے نوجوان

کی کھوپڑی چھلنی کر رہا ہے۔ 'دلیل' اب اس کو یہ جدت پسند عطا کر رہا ہے؛ کیونکہ قادیانی اب دنیا میں نہیں رہا۔ یا یہ کہ دائرۂ اسلام میں نہیں رہا۔

غرض یہ فتاویٰ اپنی حقیقت میں 'انیسویں صدی' والے سیناریو کا حصہ ہیں۔ یہ ہمیشہ اس وقت زندہ ہوں گے جب استعمار ہم پر حملہ آور ہو گا۔ (قرآن پر 'گہرے غور و خوض' کے پیچھے بسا اوقات کچھ نفسیاتی اور وجدانی عوامل بھی ہوتے ہیں!)

لیکن ان فتاویٰ کی دھڑا دھڑ فروخت کا یہ موقع بنا کیسے؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور اس پر ہمارے تحریکی حلقوں کو غور کرنا ہے۔ (پچھلے مبحث [6] سے اس کا تعلق جوڑتے ہوئے)۔ شدت پسند ڈسکورس کو اپنے آگے بڑھنے کے لیے یہاں جو کچھ زمین خالی ملی، اور جو کہ ماننا چاہیے ہماری اپنی کسی کوتاہی کا نتیجہ تھا، اور جسے میڈیا نے 'مذہبی' رنگ دے کر خوب نشر کیا، وہاں سے ایک 'جوابی بیانیہ' counter narrative کے لیے زبردست ویکیوم vacume بنا۔ (مائک بدستور میڈیا کے پاس!)۔ جسے پُر کرنے کے لیے وہی انیسویں صدی کا قادیانی والا بیانیہ بلکہ جناب نادر عقیل انصاری [7] کے الفاظ میں ایک استعماریہ 'دلائل' کی ایک اَپ ڈیٹ کے ساتھ لا حاضر کیا گیا۔ یعنی پہلے ایک 'مذہبی' نیریٹو نشر کروایا گیا، **جو کہ دینی حلقوں کی مین سٹریم کا نیریٹو ہرگز نہیں تھا** (ہماری اس مین سٹریم کو خدا جانے کیا سانپ سونگھ گیا جو کوئی مضبوط آوازیں ہی یہاں دستیاب نہیں رہیں؛ تاریخ کے ایسے نازک ترین موڑ پر۔ یہ اس سارے بحران کا مرکزی ترین نقطہ ہے، بلکہ ہماری نظر میں یہ اس سارے بحران کی واحد وجہ)۔ ظاہر ہے یہ ایک بھیانک نیریٹو تھا جو نہ دلیلِ شرعی پر قائم اور نہ کسی عقلی تجزیے پر (اس کے بھیانک پن میں 'ایفیکٹس'

---

6 پچھلا مبحث بعنوان: "پاکستان کے دینی حلقے اپنی تاریخ کے بدترین بحران میں"۔

7 نائب مدیر سہ ماہی "جی" لاہور۔ متعلقہ موضوع سے متعلق ان کے مضمون کے اقتباسات ایقاظ نومبر 2015ء میں شائع ہو چکے ہیں بعنوان: "جوابی بیانیہ نہیں استعماریہ"۔

effects ڈالنا تو میڈیا کا تخصص ٹھہرا)۔ اور پھر انیسویں صدی والے "استعماریہ" کو، یا اس سے بھی پیچھے جائیے تو ایک دینِ اکبری کو، 'جوابی بیانیہ' بنا کر ذہنوں میں پیوست کرایا جانے لگا۔ گویا پہلے ایک خوفناک شیر دکھایا گیا اور پھر جب پوری طرح دہل گئے تو ہمارے آگے ایک پنجرہ لا دھرا گیا جس میں جانا قبول کر کے آپ 'شیر' سے تو وقتی طور پر شاید 'محفوظ' ہو جائیں گے لیکن استعمار کے قیدی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بن جائیں گے، جو کہ اِس 'شیر' کے جانے کے ساتھ ہی پنجرے پر اپنا وہی انیسویں صدی والا پرانا بدبودار 'شٹر' ڈال دے گا اور تب اِس 'بھٹکے ہوئے آہو' کا حال پوچھے گا جو عالمی جنگوں اور سرد جنگ کی بھگدڑ کا فائدہ اٹھا کر اس پنجرے سے بھاگ نکلا تھا!

غرض معاملے کی ترتیب یوں رہی:

1. دینی طبقوں کی مین سٹریم کا اس سارے معاملے میں نہ ہونے کے برابر کوئی کردار ہونا۔ (نہ تو اس 'پوسٹ-کولڈ-وار' post-cold-war صورتحال کو بھانپ کر قوم کو بروقت راہنمائی دے پانا۔ اور نہ یہاں کے عمل پسند نوجوانوں میں کوئی ایسی فکری قلعہ بندی کر رکھنا کہ یہاں کچھ چھوٹے موٹے فکری جھٹکے آئیں تو سہے جا سکیں۔ یہاں تک کہ اس موقع پر کوئی اچھی ترجمانی spokesmanship تک نہ رکھنا۔ یوں متعدد پہلوؤں سے یہاں ایک خلا چھوڑنا)۔

2. استعمار کا سرد جنگ کے خاتمہ کے تاریخی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (اپنے صیہونی وبھارتی حلیف کو باقاعدہ ساتھ on board رکھتے ہوئے) ہماری سرزمینوں پر ایک نئی لشکر کشی کرنا، اور عالم اسلام کو 'انیسویں صدی' والے پوائنٹ پر (جزوی طور پر) واپس پہنچانے کے لیے کچھ فوری تو کچھ دُوررَس منصوبے لانچ کرنا۔ علاوہ ازیں، ضیاء الحق دَور کے جلاوطن یا یہیں پر دبک کر بیٹھے ہوئے قادیانی نیز 'سرخا' عناصر کے لیے ایک نئی نوکری تخلیق کرتے ہوئے یہاں پر ایک

’لبرل سویرے‘ کا ڈول ڈالنا جسے اس بار ’میڈیا ریوولیوشن‘ کی رَو پر سوار ہو کر آنا تھا اور پھر رفتہ رفتہ یہاں کی مادرہائے علمی پر بھی چھا جانا تھا (دونوں یو-ایس-ایڈ اور اسی جیسے ’پاکستان کی ترقی کے لیے بے چین‘ مالیاتی پروگراموں کے سپانسرڈ اور فنڈڈ sponsored and funded)۔ ایک لحاظ سے ہمارے بیرونی محاذ پر مغرب کے ادارہ استعمار Colonialist کی پیش قدمی تو ہمارے اندرونی محاذ پر ادارہ استشراق Orientalist کی پیش قدمی۔ دونوں نپی تلی well-studied، ہم آہنگ aligned، منسَّق coordinated اور دقیق sycronized۔ جسے یہاں کے سب فکری، سیاسی اور سماجی عوامل کے ساتھ پوری ذہانت کے ساتھ کھیلنا تھا۔ (ادھر ہمارے دینداروں کے پاس مل کر بھی منصوبہ بندی کا کوئی ایک ادارہ نہیں، شاید اس کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی ہو!)

3. عالم اسلام میں استعمار کے اودھم مچانے اور یہاں کی سرزمینوں پر قبضے جماتے چلے جانے کے لیے ’دہشتگردی‘ ایک بہت اچھی اوٹ تھی۔ اس کا نام لے کر جو مرضی کرتے چلے جاؤ! کچھ دیر تک یہ اصطلاح ہمارے اُس جائز جہادی عمل کے لیے مستعمل رہی جو مسلم سرزمینوں پر بیرونی جارحیت کے خلاف انجام پا رہا تھا مثلاً امریکی قبضہ کاروں کے خلاف ہمارے افغان بھائیوں کی جدوجہد، یا صیہونی غاصبوں کے خلاف ہماری فلسطینی بھائیوں یا بھارتی قبضہ کاروں کے خلاف ہماری کشمیری بھائیوں کی جدوجہد، وغیرہ۔ طبعی بات تھی کہ اسے ’دہشتگردی‘ کہنے کے خلاف ہماری قوم کا ایک طبقہ مزاحم ہوتا: بھئی یہ تو ہماری وہ جنگ آزادی ہے جو مسلم سرزمینوں پر چڑھ آنے والے کافروں کے خلاف ہم ہمیشہ لڑتے آئے ہیں۔ اپنی زمینوں کے دفاع کا حق ہمیں انسانی اصولوں نے بھی دیا ہے۔ اور اس سے پہلے ہمارے دین نے بھی ہم پر یہ فرض کر رکھا ہے۔ لہٰذا یہ تو ہماری قوم کے ہیرو ہوئے

جو ہم سب کی جانب سے فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

یہاں تک؛ ایک جنگ پوری طرح ہمارے لڑنے کی تھی۔ ہمارا دین تو ہماری پشت پر تھا ہی۔ ہم اگر منہ میں زبان رکھتے تو انسانی اصول بھی ہمارے مؤید تھے۔ اس سے ہم نہ صرف اپنی قوم پر بلکہ باہر کے انصاف پسند طبقوں پر بھی اپنے دشمن کو ایک برہنہ غاصب جارح قبضہ کار ثابت کر سکتے تھے۔ یوں اپنے دشمن کے پاس ہمارے اور پوری انسانیت کے 'نجات دہندہ' کے روپ میں آنے کا موقع ہی ہم نہ چھوڑتے اور وہ ایک صریح 'غاصب' کے طور پر ہی دنیا کے اندر دیکھا جاتا۔ مغرب کے بہت سے انصاف پسند اپنی حکومتوں پر تنقید کے لیے اس بنیاد کو اختیار کرتے بھی رہے ہیں تاوقتیکہ 'اسلام' اور 'جہاد' کے نام پر مار دھاڑ کا ایک خوفناک ناقابل توجیہ فنامناہر کسی کو خاموش کرانے لگا۔ پس اس جنگ کا اسی نقشے پر رہنا ہمارے حق میں بہت سے پوائنٹ لا رہا تھا۔ اس سے ہم کئی محاذوں پر جیت پانے والے تھے۔ کاش معاملہ اسی محور پر رکھا جاتا۔ اس پالیسی پر رہتے ہوئے: ہمارے نوجوان کا جذبۂ شہادت تو سب کا سب دین سے ہی پھوٹتا اور اپنے نوجوان کے لیے حوالہ ہمارا وہ خالص اسلامی پیراڈائم ہی ہوتا۔ البتہ عالمی سطح پر ہم دنیا کے مانے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر بھی اپنا کیس ثابت کر رہے ہوتے، کیونکہ یہ دنیا فی الحال ہمارا 'اسلامی' حوالہ نہیں مانتی۔ غرض یہاں تک معاملہ ہمارا ہی طرفدار تھا، کچھ کمی تھی تو ترجمانی spokesmanship کی۔ باقی عملی جنگ تو لڑنے سے لڑی جانی تھی، اور یہ ایک گوریلا وارفیئر تھا جو ہمیشہ وقت مانگتا ہے۔

4. تا آنکہ کچھ دینی طبقوں نے ایک ہیجان خیز صورتحال میں جذباتیت کی راہ چلتے ہوئے اِنہی مسلم سرزمینوں کے اندر محاذ کھول ڈالے۔ ادارہ استشراق orientalist بڑی دیر سے یہاں کے فکری رجحانات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے کیونکر

جانے دیتا۔ یہاں سے؛ مسلم سرزمینوں کو نہ صرف غیر مستحکم کر دینے بلکہ آگ اور خون میں نہلا دینے کی ایک صورت اُس کے ہاتھ لگی۔ کیا 'بلیک واٹر'، کیا 'را'، کیا 'خاد' اور نجانے کون کون سے سیکریٹ گروپ یہاں 'جہاد' کے پردے میں یوں سرگرم ہوئے کہ الامان والحفیظ۔ ہماری اِن قوموں کو جہاد سے 'توبہ' کروا دینے کی یہ صورت سب سے سوا تھی۔ مسلمانوں پر ایسا الٹا پڑنے والا 'جہاد' تو ان کی پوری تاریخ میں کبھی نہ ہوا ہو گا! اوپر سے لبرلز کے کورَس! کوڑوں والی فلموں ایسے چیختے دھاڑتے 'چشم کشا حقائق'! چنانچہ ایک شدت پسند ڈسکورس سے سامنے آنے والی عسکریت پسندی جس کا میدان پاکستان اور سعودی عرب وغیرہ ایسی مسلم سرزمینیں تھی، یہاں ایک ایسی غیر معمولی دریافت ثابت ہوئی کہ اس کے پردے میں آگے بڑھتے ہوئے معاملے کا سارا نقشہ بدل ڈالا گیا۔

5. 'دہشتگردی' کو جب یہ سب معانی پہنا لیے گئے اور پوری قوم اس سے نجات پانے کے لیے بلبلا اٹھی تو... یہاں سابقہ قادیانی اور حالیہ جدت پسند ڈسکورس میدان میں آیا: انکارِ جہاد، جس کو سمجھنے میں فقہاء مسلسل 'غلطی' کھاتے رہے تھے! 'دہشتگردی' سے اسلام کا چہرہ صاف کرنے کے لیے یہاں کچھ جدت پسند مفسرین آگے بڑھے جو اِس 'حقیقت' سے پردہ اٹھائیں کہ اصل فساد کی جڑ اِس دور میں "جہاد" کا نام لینا ہے۔ بھائی "جہاد" وغیرہ ایسے سب احکام تو اُسی دور کے ساتھ مخصوص ہیں جب قرآن مجید نازل ہوا؛ بعد کے ادوار کے لیے تو جہاد وغیرہ کی یہ آیات ہیں ہی نہیں۔ یہ ظلم اور فساد تو پونے چودہ سو سال سے امت کی تاریخ میں ہوتا آرہا ہے؛ لہٰذا یہ صفائی تو بڑی پیچھے سے ہونی چاہئے! یہ سب مدرسے اور ان کے اندر پڑھانے والے دماغ چونکہ اسلام کے اُسی تاریخی ڈسکورس کو لے کر چلتے ہیں لہٰذا 'دہشتگردی' ان کی گھٹی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ 'دہشتگردی' سے نمٹنا ہے تو

پہلے اس روایتی علمیت classical discourse سے چھٹکارا حاصل کرو جو یہاں کے علماء اور اساتذہ کے دماغوں میں بیٹھی ہے! آپ اسے 'حسنِ اتفاق' co-incidence کہیے یا 'توارُد' یا کچھ اور، ادارہ استشراق کا سب سے بڑا پراجیکٹ عالم اسلام کے لیے یہی تو ہے جو یہاں کی 'تحقیق پسند' زبانوں پر آپ سے آپ جاری ہے!... لہٰذا ایسے تفسیری 'انکشافات' اگر مسلمانوں پر آج ہو جائیں تو سونے پر سہاگہ! ایسا بروقت کام! دوبارہ کب موقع ہے! وہ جہاد جس نے بارہ صدیوں تک کافر کی ناک میں دم کیے رکھا اور 'دورِ نزولِ قرآن' کے صدیوں بعد بھی اللہ کے فضل سے براعظموں کے براعظم اسلام کے زیر نگیں لے آتا رہا (جن میں آپ کا یہ ہند بھی شامل ہے: ہند کے بتکدے میں مسجدوں اور اذانوں کی یہ دل آویز گونج میسر آئی تو ہمارے اسی جہاد کے دم سے جو 'دورِ نزولِ قرآن' کے صدیوں بعد ہوا) اس تاریخی "جہاد" سے کوئی 'نظمِ قرآن' کے نام پر اب ہمیشہ کے لیے آپ کی جان چھڑوا دے، اس سے بڑی کیا نعمت ہو سکتی ہے! آپ جانتے ہیں اس ایک مقصد کے لیے ہی تو یہاں مرزا قادیانی کو ہائر hire کیا گیا تھا جو ایک جعلی نبوت کی جھک مار بیٹھا! مسلمانوں کی لغت سے "جہاد" کو خارج کروا دینے کا مطلب مسلمانوں کی زندگی سے استعماری لشکروں کے خلاف مزاحمت ختم کروا دینا ہی تو ہے؛ جس میں نجانے ابھی کیسے کیسے موڑ آنے ہیں! لہٰذا مسلمانوں کو اِس طرف سے بھی مارو اور اُس طرف سے بھی۔ پہلے "جہاد" کے نام پر اِنہیں ایک مار مارو اور پھر "انکارِ جہاد" کی راہ سے اُس سے بھی بری ایک مار!

یہ ہے نتیجہ؛ جب "جہاد" کا مفہوم اور عمل اپنے محل پر نہ رہے۔ تب یہاں دو ہی ڈسکورس سنے جائیں گے: ایک شِدَّت پسند اور ایک جِدَّت پسند۔ جبکہ سنت کے حقیقی ترجمان غائب؛ میڈیا ان کی بھلا کیوں سنائے گا جو اِس پورے منصوبے میں کہیں فٹ ہی نہیں بیٹھتے!

کافر کی ہمارے خلاف جنگ کا دوسرا محور:

"مسلمان" کو ایک تہذیبی واقعے کے طور پر ختم کر ڈالنا

اداریہ

حامد کمال الدین

کافر کی جنگ کے اِس پہلو پر ہم بہت کچھ لکھتے رہے ہیں۔ اس کا اعادہ ہم یہاں نہیں کریں گے۔ ایک بوڑھی تہذیب جو اپنے آخری دموں پر ہے عالمی سطح پر ایک نوخیز تہذیبی واقعے "اسلام" سے شدید طور پر خائف ہے، جس کے شواہد شمار سے باہر ہیں۔ یہاں تک کہ سیموئیل ہنٹنگٹن Samuel Hintigton ایسے لوگ اس بات کو عالم اسلام پر مغرب کی از سر نو چڑھائی کا ایک فکری اور وجدانی مقدمہ بناتے ہیں۔

وہ دیکھ رہے ہیں، کئی مغربی ممالک میں اسلام آج اُن کی ڈیموگرافی بدل رہا ہے۔ جگہ جگہ اسلامی سنٹر کھل رہے ہیں اور لوگ اِس دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ مسلم ممالک میں پچھلے تین عشروں کے اندر "نماز" اور "حجاب" کا فنامنا مسلسل زور پکڑتا رہا ہے۔ 'اتاترک کا ترکی' تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہوتا چلا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا ترکی سامنے آنے لگا جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔ مغربی تہذیب کے ہاتھوں 'خاندان' جس طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، اور چرچ اس محاذ پر جس طرح ناکام دیکھا گیا ہے، یہ جنگ اب صرف اسلام کے لڑنے کی رہ گئی ہے، یہ تاثر ایک بڑی خلقت کے ذہنوں میں مضبوط ہوا ہے۔ مادیت نے انسان کا دل جس طریقے سے ویران کر ڈالا ہے، اس کا مداوا اسلام کے پاس ڈھونڈا جانے لگا ہے۔ ایک ایسی روحانیت جو عقل کی کامل تسکین کرتی ہے۔ اور ایک ایسی

عقل جو ہر گز روحانیت کے آڑے نہیں آتی بلکہ اس کی تکمیل اور افزائش کرتی ہے۔ چرچل اور چارلس تک اسلام کی اس مخفی صلاحیت کی داد دے چکے کہ یہاں عقل اور روح، دین اور دنیا ایک دوسرے کے سر آنے کی بجائے کس طرح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ گویا اسلام کے پاس آکر "انسان" مکمل ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ انسان "برآمد" ہو جاتا ہے۔ وہ انسان جو دوسری جگہوں پر بہت سارے خداؤں کے مابین کٹ پھٹ گیا تھا! اسلام ان کرچیوں کو جوڑ دیتا ہے! اسلام کی اِس فکری اور تہذیبی قوت نے صرف دورِ فتوحات ہی میں قلوب کو مفتوح اور عقول کو مسحور نہیں کیا، آج اِس دورِ مغلوبیت میں بھی ایک سطح پر اسلام اپنی اِس قوت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

البتہ انہیں بخوبی معلوم ہے، اسلام کی یہ تہذیبی قوت اس کے مظاہر میں نہیں بلکہ اس کے اندر متحرک ایک جان دار عقیدہ (ایمان بالغیب) میں ہے۔ اور وہ ایک ایسا واضح، ثابت، محکم عقیدہ ہے جسے قرآن ایسی حسین زبان ملی ہوئی ہے۔ پھر یہ ایک کامل شریعت پر قائم ہے جو حیاتِ انسانی کی پیچیدہ سے پیچیدہ گرہیں بڑی قدرت اور کامیابی سے کھولتی ہے، اور اپنے بیان کے لیے نہایت معلوم و ثابت مراجع رکھتی ہے۔ نیز انہیں معلوم ہے، اسلام نفسِ انسانی کو ایک جامعیت دیتا ہے۔ جس کے بعد نفس انسانی ایسا خدا رخ ہوتا ہے کہ نہ 'انسان' کے نام پر انسان کی پیشوائی باقی رہے اور نہ 'خدا' اور 'مذہب' کے نام پر۔ یہاں سب کچھ خدا رُو ہو جاتا ہے اور غیر اللہ سے انسان مکمل پھر جاتا ہے۔ زمین پر "خدا" کا ایسا تسلط جہاں واقعتاً انسان کی خدائی ختم ہو جائے، جہاں انسان خدا کو اپنا سب کچھ سونپ کر راحت اور سعادت کا ایک جل تھل آخرت سے پہلے اِسی دنیا میں پائے، نیز اپنے عقل و شعور، تسخیرِ کائنات کے لیے اپنی ایک ازلی تڑپ اور اپنے طبعی قِویٰ اور صلاحیتوں کے لیے ایک وسیع گنجائش پائے، اور اپنے یہ تمام شوق پورے کرتے ہوئے بھی در حقیقت "خدا کی عبادت" ہی کر رہا اور اُسی کے دیے ہوئے مقاصد زمین پر پورے کر رہا ہو... یہ "**حنیفیتِ**

سمحة" جو دینِ محمدؐ کا سب سے بڑا خاصہ ہے، انبیاء کے دشمنوں کو سب سے زیادہ خوفزدہ کرتی ہے، جو انسان سے انسان کی عبادت کروانا چاہتے ہیں؛ کبھی کسی نام پر تو کبھی کسی نام پر۔

"مسلمان" کو ایک تہذیبی واقعے کے طور پر جہان سے مٹا ڈالنے کے لیے آج وہ:

1. 'وار آف آئیڈیاز' 'war of ideas' لے آئے ہیں۔ جس کا صحیح نام war on ideas ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ سیدھا منہ پھاڑ کر اب یہ کہنے لگے ہیں کہ اُن افکار ہی کو اور ان کے حاملین کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دو جو لوگوں کو مغرب کے دیے ہوئے اُس فکری ڈسکورس کا باغی کرتے ہیں جو بڑی محنت کے بعد آج دنیا کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں سکۂ رائج الوقت بنا دیا گیا ہے۔ اِس رائج الوقت فکری ڈسکورس کے خلاف ذہنوں کے اندر جو ایک علمی بغاوت ہو گی وہی امنِ عالم کے لیے صاف ایک خطرہ ہے! ایسا الگ فکری ڈسکورس رکھنے والے لوگ چاہے بندوقیں نہ بھی اٹھائے ہوئے ہوں، اور چاہے ایسے لوگ بندوقیں اٹھانے والے کچھ ناپختہ لوگوں کو خود اپنے اس فکر اور دعوت کے حق میں ہی نقصان دہ کہہ کہہ کیوں نہ تھک گئے ہوں، پھر بھی یہ گردن زدنی ہیں! رائج الوقت (مغربی) فکری ڈسکورس کے خلاف علمی بغاوت بجائے خود ایک جرم اور بدامنی کی ایک سرعام دعوت ہے! ایک دو سو سالہ عمل کے نتیجے میں دنیا اب 'حقیقتوں' کے تعین کے معاملہ میں جس ڈسکورس پر لے آئی گئی ہے اس سے ذہنوں کو ہٹانا آج بجائے خود ایک 'فساد' ہے جسے آہنی ہاتھ سے ختم کر دینا چاہئے! وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ إِنِّي أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ۔ (غافر:26) "اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے رب کو پکارے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے گا یا یہ کہ زمین میں فساد پھیلائے گا"۔

2. مسلم دنیا کے کالجوں یونیورسٹیوں میں الحاد (خدا، نبی، قرآن کا سیدھا سیدھا انکار) اور لادینیت کے غول چھوڑ دیے گئے ہیں۔ بے شمار خفیہ گروپ اس پر کام کر رہے ہیں اور اپنی سرگرمی کے لیے ایک مضبوط پشت پناہی رکھتے ہیں۔

3. مسلمانوں کے شہروں میں بدکاری اور کنڈوم کلچر کو عام کرنے کے غیر معمولی انتظامات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ این جی اوز کی ایک فوج ظفر موج اندھے وسائل لے کر کچھ نہایت سائنٹیفک منصوبوں کے ساتھ یہاں کی پسماندگی اور معاشی بدحالی کا فائدہ اٹھانے کے لیے میدان میں اتر آئی ہے۔ یہاں کے بااثر طبقے اکثر و بیشتر یا اُن کے کانے ہیں یا سرے سے اندھے۔

4. تعلیم کے شعبے میں پرائمری کی سطح تک 'اصلاحات' کا جو ایک بھاری بھرکم پروگرام رُوبہ عمل ہے اور جس میں بہت کچھ نہایت مفید بھی ہے، اس شہد میں لادینیت کا ایک نہایت زوداَثر زہر بھی گھول دیا گیا ہے۔ اس کے نتائج دیکھ کر آپ عنقریب سر پکڑ کر رہ جائیں گے۔

5. مسلمانوں کے تمام مسلَّمات پر ''تشکیک'' کا حملہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقوں کی نظر میں ہماری ہر چیز 'نظرِ ثانی' کی ضرورتمند ٹھہرا دی گئی ہے۔ اسلام کی ایک 'تفسیرِ نو' کی ضرورت بجابجا منوائی جا رہی ہے۔ آپ خود جانتے ہیں مسلم معاشروں پر چھائی ہوئی جہالت، علم اور علماء کی کمی، مغربی ڈسکورس کے غلبے اور، اذہان کی غلامی اور ماتحتی کے اِس دور میں اسلام کی جو ایک 'تفسیرِ نو' ہو گی، اور پزیرائی پائے گی، وہ کیسی تباہ کن ہو گی۔

6. ناموسِ رسالت پر مسلم غیرت کا مذاق اڑانا ایک فیشن بنا دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں نفوس کے اندر پیدا ہونے والی مزاحمت ذہنوں کے اندر کچلی جا رہی ہے۔

7. ادیان کے فرق کو ملیامیٹ کرایا جا رہا ہے۔ باطل ملتوں کے شرک کو بربادی کا

موجب ٹھہرانا اور اس پر جہنم کی قرآنی وعیدیں منہ پر لانا تہذیب کے منافی ٹھہرا دیا گیا ہے اور کافر ملتوں سے قربت وہم آہنگی اختیار کرنا ایک نہایت قابل تحسین 'تہذیبی رویہ'۔ 'نماز روزہ' شاید ابھی کچھ دیر ہمارے پاس بچا رہے (ان لوگوں کے لیے جو بےحیائی کے اِس طوفان میں بھی نماز روزہ پر باقی رہنا چاہیں) البتہ "اسلام دنیا کا واحد سچا دین ہے اور اس کے ماسوا ہر دین باطل اور صاف جہنم کا موجب" یہ عقیدہ سمجھو مسلمان کے ہاتھ سے گیا کہ گیا(ألا هل بلَّغتُ؟)۔ 'گلوبلائزیشن' کو پہلا کام ہی یہاں پر یہ کرنا ہے۔

8. اس سے پہلے صرف 'سیاست' کو ہی دین پسندوں کے لیے شجرِ ممنوعہ ٹھہرایا جاتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ مسلمانوں کی ان جماعتوں کو آج ایک خطرہ اور خوف کی علامت بنایا جارہا ہے جو 'سیاست' تک سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں مانند تبلیغی جماعت اور الہدیٰ وغیرہ۔ ان جماعتوں کی کل محنت اور توجہ لوگوں کو گناہگاری کی زندگی سے نکال کر تقوی اور پاکیزگی کی زندگی پر لانا ہے۔ ان جماعتوں کو بھی بے رحمی کے ساتھ ہدف بنایا جاتا ہے تو اس کی ایک واضح دلالت ہے، جس سے صرفِ نظر کرنا درست نہیں: دراصل اُن کی ہمارے ساتھ جنگ اب 'سیاسی اسلام' سے بہت آگے گزر چکی ہے۔ اسلام کو فی الوقت وہ کسی 'سیاسی' نہیں بلکہ ایک "تہذیبی" چیلنج کے طور پر زیادہ دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی روحانیت اور پرامن دعوت بھی اب انہیں تکلیف دے رہی ہے۔

9. 'مدارس' کے خلاف ایک طریقے سے اعلانِ جنگ ہو چکا۔ ہمارے زیادہ لوگ اس مسئلہ کو محض 'دہشتگردی' کے سیاق میں دیکھ رہے ہیں۔ بے شک دہشتگردی کے کچھ واقعات میں مدارس میں پڑھنے یا پڑھانے والے بعض افراد ملوث ہوں گے۔ مگر ایسی کسی تشویش کا تعلق ہمارے سیکورٹی اداروں سے ہو گا۔

انکل سام اور اُس کے معتمد لبرلز کی پریشانی 'مدارس' کی بابت یہ نہیں ہے۔ 'مدارس' دراصل وہ ایک ایریا area ہے جہاں اِس اکیسویں صدی میں بھی انسانی عقل 'جدید' ڈسکورس سے ہٹ کر سوچتی ہے! اِس جزیرے کو لازماً اسی 'جدید' طوفان کے زیر آب آنا ہے؛ اور جلد از جلد آنا ہے۔ اصل بغاوت یہ ہے انکل سام اور اس کے مقامی معتمدین کے نزدیک۔ باوجود اس کے کہ ہمارے مدارس کی حالت آج بہت ہی پسماندہ اور دگرگوں ہے اور یہاں کسی جاندار فکر کی پرورش اور افزائش سرے سے نہیں ہو رہی، اس کے باوجود یہ (مدارس کی دنیا) جدید ڈسکورس کی بیعت شدہ بہرحال نہیں ہے۔ یہ بجائے خود کوئی چھوٹا جرم نہیں ہے۔ مدارس کو 'وجود' برقرار ہی رکھنا ہے تو اِسے ادارۂ استشراق کی بیعت کرنا ہوگی۔ اس 'بیعت' کے لیے ڈھیروں انتظامات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ خوف کی ایک بھیانک فضا بے وجہ قائم نہیں کرائی گئی۔ اور توقع کی جا رہی ہے کہ مدارس کی جانب سے جلد از جلد مغرب کے اس دینِ اکبری کے لیے ایک اظہارِ اطاعت سامنے آجائے۔ 'ہینڈز اَپ' ایک بار ہو جائے تو پھر دیکھیں گے مولوی کی 'جدید' تعلیم و تربیت کی کیا عملی صورتیں سامنے آتی ہیں۔

10. سب سے بڑا ہدف ہمارے اِس تہذیبی قتل کے لیے بڑھنے والی مہم کا: ہمارے وہ ادارے ہیں جو عالم اسلام میں ایک فکری خوداختیاری intellectual independence پیدا کرنے کا منبع ہیں۔ یہاں؛ خطرے کی سب سوئیاں سعودی جامعات کی طرف گھوم جاتی ہیں جہاں 'جدید' پڑھایا بھی خوب جاتا ہے مگر 'قدیم' کے تابع وماتحت رکھ کر۔ جہاں اللہ کا شکر ہے 'ریلٹوازم' relativism کے بخیے ادھیڑے جاتے ہیں اور ''مطلق حق'' کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو مانا اور منوایا جاتا ہے اور اس ''مطلق حق'' سے متصادم ہر

نظریے کو اور ہر فلسفے کو کھلی ضلالت؛ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔ آدمی کو یقین نہیں آتا کہ دنیا میں کوئی ایسا علمی جزیرہ بھی ابھی باقی ہے جہاں مسائلِ سماج میں دینِ حق کی یوں تقریر ہوتی ہے۔ جہاں سوشل سائنسز میں پی ایچ ڈی کے تھیسس اُسی ٹھیٹ ڈسکورس پہ کھڑے ہو کر کیے جاتے ہیں جس میں مغرب کے دیے ہوئے جدید افکار تو رہے ایک طرف، تاریخ اسلامی کے جہمیہ اور خوارج اور روافض اور معتزلہ تک باقاعدہ 'ضلالت' کے زیر عنوان ذکر ہوتے ہیں۔ جہاں "ملتوں کا فرق" محمد بن عبد الوهاب کی کتب سے پڑھایا جاتا ہے اور انبیاء سے اعراض کرنے والے مذاہب اور فلسفوں کا محاکمہ ابن تیمیہ کے اصول سے۔ جدید ڈسکورس کی اتنی بڑی بغاوت دنیا میں کہیں نہ ہو گی جتنی سعودی جامعات کے اندر دن دیہاڑے ہو رہی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں سعودی عرب اپنا بہت کچھ دے کر اپنا کونسا اثاثہ ابھی تک بچاتا آیا ہے اور جس کی وجہ سے وہ اِس 'عالم نو' کے لیے کتنا بڑا خطرہ پالتا رہا ہے۔

*****

آپ نے دیکھا، ہم نے "نفاذِ شریعت" کا ذکر فی الحال یہاں نہیں کیا۔ معاذ اللہ، اس لیے نہیں کہ "نفاذِ شریعت" کوئی کم اہم مسئلہ ہے۔ بلکہ اس لیے کہ معاملہ اس سے بہت آگے جا چکا۔ ایک معرکے کا نقشہ اگر آپ پر واضح نہیں تو اس کو لڑنا بھی آپ کے بس میں نہ ہو گا۔

جہاں تک "گرانے" کا تعلق ہے تو مغرب ہمارے یہاں "شریعت کی حکمرانی" کو بہت دیر پہلے گرا چکا۔ لہٰذا "گرانے" کے حوالے سے ہم جس چیز کا بار بار یہاں ذکر کر رہے ہیں اور قوم کو دشمن کے حملوں اور چالوں سے بار بار خبردار کر رہے ہیں وہ کوئی اور چیز ہے۔ اور وہ ہے ہمارے اِن معاشروں کا دینِ

اسلام پر یقین۔ شریعت کو اپنی زندگی کا دستور ماننے کا عقیدہ۔ انبیاء سے متصادم ادیان اور فلسفوں کو باطل اور جہنم کا سامان جاننے کا اعتقاد۔ وہ "شریعت" کو اِس وقت اقتدار کے ایوانوں سے نہیں نکال رہے؛ کیونکہ یہ کام وہ بہت پہلے کر چکے۔ وہ تو اب "شریعت" کو ذہنوں سے کھرچ رہے ہیں۔ دماغوں سے نکال رہے ہیں۔ شریعت کے رہے سہے اثرات اب وہ معاشروں سے ہٹا رہے ہیں۔ شریعت کو اب وہ ہمارے سماجی نقوش ہی سے محو کر رہے ہیں۔ اِس وقت تو ان کا صاف صاف ہدف ہمارے یہ عقائد ہیں۔ ہمارے تہذیبی خدوخال ہیں جن میں ہم ابھی تک کچھ نہ کچھ مسلمان تھے۔ سارا زور اب "مسلمان" کو اِس مقام پر مار دینے پر ہے۔ یہاں اگر انہوں نے خدانخواستہ "مسلمان" کو مار دیا تو باقی خطرات ان کی راہ سے خودبخود زائل ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں اگر ہم "مسلمان" کو بچانے میں کسی طرح کامیاب ہو گئے تو باقی میدان جیتنے کی بھی کسی نہ کسی دن کوئی آس ہو سکتی ہے۔ البتہ اصل توجہ اس مقام پر ہونی چاہئے جہاں وہ ہمیں "مارنے" کے لیے اپنا پورا زور لگا چکے اور جہاں ہمیں "بچنے" کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دینا ہے۔ "یہاں" سے توجہ ہٹا کر کسی اور طرف لے جانا، خواہ کسی اور سیاق میں وہ بات کتنی ہی اہم اور بابرکت ہو، اِس معرکہ میں دشمن کا وار ہم پر چل جانے کا ہی موجب ہو سکتی ہے۔

- اور جہاں تک شریعت کو "نافذ کرنے" کا تعلق ہے تو اس پوزیشن سے ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ بلکہ اور بھی پیچھے دھکیلے جا رہے ہیں۔ اور دھکیل دیے جائیں گے اگر ہم اپنی پوزیشن کا صحیح تعین کرتے ہوئے، اور صورتحال کی پیچیدگیوں کا درست اندازہ کرتے ہوئے، کوئی درست حکمت عملی اختیار نہیں کرتے۔

یعنی شریعت کی حکمرانی ہم سے لے بہت پہلے گئی ہے۔ جبکہ اس کے ہمارے ہاتھ آنے کی

کوئی فوری صورت بہرحال نہیں پائی جارہی۔ البتہ جو چیز ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے اُس پر اگر بھرپور توجہ نہ دی تو وہ ضرور ہمارے ہاتھ سے جاسکتی ہے، **لا قَدَّر اللہ**۔ اپنے ہاتھ کی چیز بچانا اس وقت کہیں ضروری ہے۔ اور وہ، جیسا کہ ہم نے کہا، ہمارا عقیدہ (رسول اللہ ﷺ کے دین سے متصادم ہر فلسفہ اور ہر تصورِ حیات کو صریح باطل و موجبِ جہنم جاننے، اور صرف ایک شرعِ محمد ﷺ کو حق اور واجب اتباع ماننے کا ہمارا وہ ٹھیٹ پیراڈائم) ہے جسے ذہنوں سے کھرچ دینے کے منصوبے اِس وقت زور و شور کے ساتھ رُوبہ عمل ہیں۔

پس وقت ہے یہاں دینِ مغرب کے خلاف ایک نظریاتی جنگ لڑنے کا۔ ایک تہذیبی معرکے میں جا اترنے کا۔ مسجدوں، منبروں اور محرابوں کو "مسلّمات" کی ایک لڑائی میں سرخرو کروانے کا۔

*****

یہاں اگر ہم اللہ کی توفیق سے کامیاب ہو جاتے ہیں... اور حالیہ سیناریو میں ان دو محاذوں پر دشمن کو پسپا کرلیتے ہیں:

1. صلیبی و بھارتی لشکروں کو عالم اسلام کو غیر مستحکم کر دینے کے مشن میں ناکام کرکے،[1] بے نیل و مرام یہاں سے واپس بھیجنا، جو کہ کوئی چھوٹا ہدف نہیں ہے،

---

[1] نوٹ کیا جائے، کافر کو فلسطین، افغانستان، عراق اور کشمیر وغیرہ سے محض نکال دینے کی بات یہاں نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ یہ معاملے کی ایک چھوٹی تصویر ہے، اگرچہ اپنی جگہ اہم و ضروری ہے۔ بات یہ ہے، کافر ان خطوں میں خاص ان خطوں کی خاطر نہیں ہے۔ اصل دیکھنا یہ ہے کہ وہ یہاں سے عالم اسلام کی ایک نئی انجینئرنگ کرنے [مسلم دنیا کے سب اونچے اونچے ٹیلوں کو 'ہموار' اور چھوٹے چھوٹے (متحارب) 'دیگھے' اور 'مرلے' بنادینے] میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ ہے ہماری مراد "صلیبی و بھارتی لشکروں کو عالم اسلام کو غیر مستحکم کر دینے کے مشن میں ناکام کرکے، بے نیل و مرام یہاں سے واپس بھیجنا" سے؛ کیونکہ اصل جنگ فی الوقت اِس کے گرد ہو رہی ہے۔

اور اس پر ابھی وہ بے پناہ زور لگانے اور نئے سے نئے پتے پھینکنے والا ہے۔

[حالیہ سیناریو میں مسلمانوں کی بڑی جغرافیائی اکائیوں (مسلمانوں کے وسیع رقبوں اور بڑی آبادیوں پر قائم یونٹ)، طاقتور اور اعلیٰ عسکری صلاحیت کی مالک فوجوں اور مضبوط معیشتوں کو بچا لیا جانا (خواہ مسلمانوں کی یہ اکائیاں فی الوقت کیسے ہی 'غیر اسلامی نظام' پر کیوں نہ کھڑی ہوں (اس نقطہ کی وضاحت کے لیے براہ کرم ملاحظہ فرمائیے ہمارے اداریہ کی پچھلی فصل) ملتِ صلیب کے ساتھ ہماری جنگ کے آئندہ مراحل میں نہایت اہم ہے۔ "قوموں" کے اِس ٹکراؤ میں چھوٹی (اور عملاً 'مزارع') اکائیوں کے ساتھ پایا جانا فی الوقت موت ہے]۔

2. ملتِ صلیب کے فکری ہراول (ہمارے یہاں کے لبرلز) کو اپنے معاشرتی محاذ سے بے نیل و مرام لوٹانا اور اپنی مادرہائے علمی میں شکست دینا۔ یہ بھی کوئی چھوٹا ہدف نہیں ہے اور اس کے لیے ہمیں یہاں کے تعلیمی اداروں میں ایک بالکل نئی تیاری اور حکمتِ عملی کے ساتھ اترنا ہو گا۔ نیز مدارس، مساجد اور منبر و محراب کو ایک نئے لہجے کے ساتھ میدان میں آنا ہو گا۔

[یہ ایک سماجی سطح کی نظریاتی جنگ ہے جو آپ کو آج ہی لڑنی ہے۔ اور اس کے لیے 'اقتدار' اور 'انقلاب' کی شرط لگانا، کہ وہ ہو تو یہاں پر ایک سماجی و تہذیبی کشمکش کھڑی کی جائے، دراصل ایک 'یوٹوپیا' میں رہنا ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ کسی 'مکی مرحلے' کے پابند بھی ہیں، تو ایک "عقائدی و تہذیبی کشمکش" فی الحال اپنے اِس 'مکی مرحلے' کا ہی ایک حصہ سمجھ لیجئے (جو مکہ میں کسی 'اقتدار' کے بغیر ہی لڑی گئی تھی) اور جو یہاں پر حملہ آور اُن عقائد (لبرلزم وغیرہ) کے ساتھ آج آپ کو لڑنا ہے جو آپ کے "**أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدًا رسول الله**" پر براہِ راست حملہ آور ہیں۔ باطل کے نظریاتی و تہذیبی حملہ کے خلاف ایک

نظریاتی و سماجی مزاحمت آپ کو آج ہی لے کر آنی ہے۔ ورنہ آپ کا 'انقلاب' یا ''نفاذِ شریعت'' تو رہی ایک طرف، یہاں خدانخواستہ خدانخواستہ ''ارتداد'' ہی کے سرعام مظاہر ہونے لگیں گے۔ پھر جس دن مسلم پبلک ہی اللہ و رسولؐ پر ایمان رکھنے والی اور اللہ و رسولؐ سے متصادم ادیان و افکار کو اپنے ایمان کے لیے خطرہ جاننے والی نہ رہے گی تو 'اسلامی حکومت' کا خواب آپ کس پر پورا کریں گے!؟ صاف سی بات ہے، جس طرح آپ نے بیرونی محاذ پر 'سوویت یونین' سے لڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندرونی محاذ پر (ایک نظریاتی و سماجی سطح پر) 'سرخوں' کو شکست دی تھی اور مادرہائے علمی اور ثقافتی مراکز کے اندر ''اسلام کی حقانیت'' کا معرکہ جیت کر دکھایا تھا ویسے ہی آج آپ کو... جس طرح بیرونی محاذ پر صلیب اور بھارت کی جارحیت کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے ہیں، اور اللہ کا شکر ہے آپ کر رہے ہیں، اُسی طرح اپنے اندرونی محاذ پر یہاں آپ کو مغرب اور بھارت کی بولی بولنے والے (لبرل) عنصر کو نہ صرف پہچاننا ہے بلکہ یہاں کی مادرہائے علمی اور ثقافتی مراکز کے اندر اس کے نظریاتی ڈسکورس کو ایک شکستِ فاش دینی ہے۔ اور اس کے مقابلے پر ''اسلام کے واحد حق ہونے'' اور ''اسلام سے متصادم ہر دین، ہر فلسفے، ہر نظریے، ہر نظام اور ہر تصورِ حیات کے باطل اور موجبِ جہنم ہونے'' کو منوانے اور اس کی دھاک بٹھانے پر پورا زور صرف کر دینا ہے۔ مسجدوں اور محرابوں کو اِس نظریاتی و سماجی مزاحمت کا بیس کیمپ بنانا ہو گا]۔ "اسلام کا عملی قیام" البتہ اس سے بھی زیادہ اعلیٰ صلاحیتوں کا متقاضی ہو گا؛ اور زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ کام آپ اِن دو محاذوں کو سرے لگانے کے بعد ہی کسی اعلیٰ قومی سطح پر کر سکیں گے (اس پر کچھ گفتگو آگے آ رہی ہے)۔ فی الحال ان دو گھس آئے دشمنوں سے نمٹنا (ہر دو سے الگ الگ میدان میں، اور الگ الگ طریقے سے)

آپ کی فوری ترجیح ٹھہرتا ہے۔ البتہ اگر آپ اِن دو محاذوں پر خدانخواستہ آج ہارتے ہیں تو پھر یہ پوری بساط ہی آپ پر الٹ جاتی ہے۔

ان دو محاذوں پر اگر ہم اللہ کی توفیق سے دشمن کو پسپا کر لیتے ہیں... تو ان شاء اللہ یہ عالم اسلام ہمارا ہے۔ یہ ملک ہمارے ہیں اور ہم اِن کے۔ عنقریب نہ یہاں صلیبی لشکر نظر آئیں گے اور نہ لبرلز کے یہ غول۔ دونوں 'سوویت یونین' اور اس کے پروردہ 'سرخوں' کی طرح ہمارے اِس جہان سے روپوش ہو جائیں گے۔

ہاں عالمِ اسلام کی ساخت اور تشکیلِ نو ہمارے علماء اور مفکرین اور داعیوں کا ایک امتحان پھر بھی ہو گا۔ یہ قرض یوں بیٹھے ادا نہ ہو گا۔ معاشرے میں اسلام کی واپسی کسی 'آرڈیننس' سے یا کسی 'دستوری ترمیم' سے یا کسی 'نوٹیفیکیشن' سے ہو جانے والی ہے جبکہ آپ کی اپنی مصروفیاتِ روز و شب اور آپ کے اپنے موضوعات و ترجیحات عین وہی رہیں جو آپ کے مدارس اور مساجد میں فی الوقت جاری و ساری ہیں، اس واہمے کو تو جس قدر جلد ذہن سے نکال سکیں براہِ کرم نکال دیں۔ "نفاذِ شریعت" ایسے بے شمار پراجیکٹ تب بھی (یعنی مسلم سرزمینوں سے بھارتی و صلیبی و صیہونی لشکروں کے یہاں سے ناکام اور ان کے پروردہ لبرل غولوں کے یہاں سے پسپا ہو جانے کے بعد بھی)... "نفاذِ شریعت" ایسے پراجیکٹ اسی بات پر انحصار کریں گے کہ آپ کے علماء اور مفکرین اور داعی معاشرے کے فکری و تہذیبی رجحانات پر چھانے کی صلاحیت کس درجے کی رکھتے ہیں اور 'الیکشن لڑنے' سے بڑھ کر "سیاسی عمل پر اثرانداز ہونے" کی وہ سائنس جو ائمۂ سلف کے ہاں پائی گئی تھی اس کا احیاء یہ یہاں پر کس درجہ میں کر سکتے ہیں۔ معاشرے میں شریعت کی حکمرانی کا عود کر آنا کوئی مفت میں ملنے والی چیز بہر حال نہیں ہے۔ ایک مختلف طرز کا مولوی (دینی رہنمائی دینے والا فگر figure) جب تک آپ معاشرے کو نہیں دیں گے، شریعت کی حکمرانی آپ کو یہاں نہیں ملنے والی۔ تقریروں اور وعظوں اور جلسوں اور نعروں سے اگر شریعت آجایا

کرتی تو اب تک شریعت کا دور دورہ ہو چکا ہونا چاہئے تھا! کچھ کمی تو نہیں رکھی ہم نے یہ 'ضرورت' پوری کرنے میں! یا اپنے اِس مولوی میں کوئی تبدیلی برپا کر دیجئے تاکہ معاشرے میں کوئی حقیقی تبدیلی برپا ہو (معاشرہ تو بے چارہ آپ کا منتظر ہی ہے، آپ ہی زحمت فرمانے کے لیے تیار نہیں)[2]۔ یا اگر اِس مولوی میں تبدیلی برپا نہیں کر سکتے تو کچھ وقت لگا کر آپ ایک مختلف طرز کا مولوی یہاں پیدا کر دیجئے۔ کچھ بڑے مشائخ کو مل کر ایسا ایک 'پلانٹ' بہرحال لگانا ہو گا۔ لیکن ایسی کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر ہی معاشرہ اسلام کا گہوارہ بن چکا ہو اور ہر طرف دینِ حق کا دور دورہ ہو، جبکہ آپ کے مشغلے وہی ہوں جو اِس وقت ہیں، نیز معاشرے پر اثرانداز ہونے اور یہاں پر جاری عوامل کے اندر ایک ذہین تصرف intelligent maneuvering کرنے کی صلاحیت آپ کے اندر یوں ہی مفقود ہو، خدارا اِس تصور سے باہر آجایئے۔

محض ہمارے جلسے جلوس اور تقریریں کرنے اور سرکار کے ایک 'آرڈی نینس' اور 'نوٹی فیکیشن' کے ذریعے یہاں شریعت آ جائے گی، یہ تصور ناقابلِ یقین حد تک عجیب ہے۔ اس سے زیادہ عجیب تصور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ گولی اور بم سے ہی یہاں شریعت لے آئی جائے گی!

بھائی "شریعت" آنا یہاں داعیوں کے ایک اعلیٰ سماجی صلاحیت سامنے لانے پر منحصر ہو گا، آج بھی، کل بھی اور پرسوں بھی۔ اس کے لیے 'شارٹ کٹ' لگانا اپنے مسائل میں اضافہ کرنا ہو گا۔

*****

---

[2] ملاحظہ فرمایئے ہمارا ایک اداریہ (معاشرہ اسلامی تحریکوں کا منتظر) جولائی 2010۔ خصوصاً اس کی فصل (راستے جو "عقیدہ" سے پھوٹیں اور "معاشروں" سے گزریں)۔ پھر اسی اداریہ کے کچھ حصوں کی تلخیص بعنوان (سماجی کردار رکھے بغیر؟) اپریل 2012

میری ان گزارشات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک معاشرتی محاذ پر جُتے اور یہاں ایک کامیاب پیش قدمی کیے بغیر فی الحال آپ شریعت کا مطالبہ تک نہ کریں۔ میرا مطلب صرف ان چیلنجوں کو واضح کرنا ہے جو اِس وقت آپ کو عملاً درپیش ہیں اور جن پر آپ کو فوری اور بھرپور توجہ دینا ہے۔ میرا موضوع یہاں ان اہداف اور ترجیحات کا تعین ہے جن پر ''نفاذِ شریعت'' سمیت آپ کی اور بہت سی نیک مرادوں کے بر آنے کا انحصار ہے۔

البتہ اس مسئلہ میں ایک پیچیدگی کی نشان دہی ضروری ہے: متعدد عوامل، نیز کچھ خرانٹ دماغوں کی تدبیر، کہ پچھلے کچھ عرصے میں ''شریعت'' کو ''ملیٹنسی'' militancy کے ساتھ ایک غیر معمولی حد تک جوڑ دیا گیا ہے۔ ''شریعت'' کے کیس کو دراصل یہ ایک غیر معمولی ضرب لگائی گئی ہے، کسی جانب سے دانستہ اور کسی جانب سے نادانستہ۔ قصہ کوتاہ میڈیا کے بَل پر اذہان میں ان دو لفظوں کو کچھ لازم وملزوم سا کر دیا گیا ہے: ''شریعت'' اور ''ملیٹنسی''۔ یہاں سے؛ مسئلہ کی حساسیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ نفاذِ شریعت کے لیے آواز بلند کرنے والے روایتی طبقے اس معاملے کو توجہ نہ دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ 'ملیٹنسی' سے الگ اپنا ایک تعارف کروانا ان کے لیے کوئی آسان کام نہ ہو گا۔ خدانخواستہ، زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ بولیں گے ''شریعت'' اُدھر ذہین میڈیا کو بار بار سنے گا ''عسکریت''! اس اندیشہ سے صرفِ نظر ممکن نہیں کہ مطالبۂ شریعت کے حوالے سے یہاں کے روایتی امن پسند طبقوں کی محنت عسکریت پسند طبقوں کے کھاتے میں جا پڑتی رہے۔ معاملہ واقعتاً اسی قدر پیچیدہ کر دیا گیا ہے۔

اور صرف ایک ''شریعت'' نہیں اسلام کی بہت سی باتیں اور اصطلاحیں اس وقت عسکریت کے ساتھ جوڑ کر 'خطرے' کا نشان بنا دی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے؛ ان اشیاء کا وہ سیاق ہی بدل ڈالا گیا ہے جو یہاں اسلام کے کسی داعی کا مقصود ہو سکتا ہے۔ یوں سب سے بڑا نقصان اس وقت یہاں دعوت کا ہوا ہے۔ داعیوں کو دعوت کا صرف ایک مضمون ہی

لوگوں کے سپردِ سماعت نہیں کرنا ہوتا؛ بلکہ ماتقدّم pre-emptive ہو کر انہیں یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ماحول کے اندر ان کی ایک بات کس سیاق وسباق کے اندر سمجھی جانے والی ہے۔ 'کمیونی کیشن' کا یہ ایک لازمی و بنیادی حصہ ہے؛ اور "دعوت" کامیاب کمیونی کیشن کے بغیر کچھ نہیں۔ لہٰذا توحید کے کئی ایک مضامین کو اُن کا صحیح سیاق دینا بھی اِس وقت حد سے مشکل کر دیا گیا ہے۔ دعوت کے مضامین کو اُن کا صحیح سیاق دیے بغیر؛ دعوت کے مقاصد سے برعکس نتائج سامنے آنے کا بھی کافی سے زیادہ امکان ہوتا ہے۔ جبکہ 'دعوت' ظاہر ہے کوئی سر سے اتارنے کی چیز نہیں بلکہ ماحول میں ایک صالح تبدیلی برپا کرنے کا نام ہے۔ یہ نہیں تو اسے "دعوت" نہیں محض ایک کارگزاری کہیے۔ پیچیدگیاں بڑھانا "دعوت" میں نہیں آئے گا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں!

"قوموں" کو لے کر چلنا "تحریکوں" کو لے کر چلنے سے مختلف ہے

اداریہ

حامد کمال الدین

'انقلاب' یا 'غلبۂ دین' وغیرہ ایسی اپروچ کو لے کر چلنے والے حضرات اکثر ان دو باتوں کا فرق نظر انداز کرتے ہیں:

1. ایک ہے: ایک "تحریک" کو لے کر چلنا۔ یہ چاہے کتنا ہی مشکل ہو، مگر دوسری بات کے مقابلے پر کچھ بھی نہیں۔
2. اور دوسرا ہے: ایک "قوم" کو لے کر چلنا۔ اور وہ بھی 'زوال' کے گڑھے میں ایک بار جا گری اور 'غلامی' کے پراسیس سے گزر چکی پوری ایک قوم کو۔ یہ تو گویا پہاڑ کو پیٹھ پر لاد کر چلنا ہے۔ اور یہ چیز تو موسیٰ علیہ السلام ایسے اولوالعزم رسولوں کے لیے ایک چیلنج ہوتی ہے؛ اور جو کہ قدم قدم پر آپ علیہ السلام کو بے بس کیے جاتی ہے۔

تاریخِ امت میں... "ابتدائے اسلام" کو اپنے اِن متاخرہ ادوار کی "قومی حالت" کے ساتھ خلط کرنے والے حضرات البتہ ہمیشہ ہی اِن دو باتوں کو خلط کرتے ہیں:

ایک 'قوم' کو لے کر چلنا... اور ایک 'تحریک' کو لے کر چلنا۔

جبکہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

وہ حضرات بھی جو "مصالح و مفاسد کے موزانہ" والے ایک معروف فقہی قاعدہ کا اکثر مذاق اڑاتے ہیں، 'قوموں' کے معاملے کو لے کر چلنے کو معمولی جانتے ہیں۔ حالانکہ

یہ وہ مقام ہے جہاں 'تدبیریں' اور 'شمشیریں' سب جواب دے جاتی ہیں۔

اس فرق کو نظر انداز فرمانے والے اکثر حضرات آج بھی اپنے لیے اس سوال کا جواب دینا آسان پاتے ہیں کہ: جب انگریز نے مسلم ہند پر اپنا قبضہ پوری طرح مستحکم کر لیا، اُس وقت کونسا عمل اختیار کرنا اُس بھنور سے نکل آنے کے لیے مسلمانوں کے حق میں بہترین تھا؟ گویا واقعتاً یہ حضرات ایسے کسی نسخے کی نشاندہی کر سکتے ہیں جسے اختیار کر لینے سے مسلمان اس بلائے عظیم سے نجات پا سکتے تھے:

- ایک جانب 'عسکری آپشن' کے مؤیدین اپنے دلائل رکھتے ہیں کہ مسلمان انگریز سے لڑ کر بڑے آرام سے آزادی حاصل کر سکتے تھے (اور یہ پنجابی ضرب المثال تو گویا بے معنیٰ ہے کہ "ڈوبا ہی بیچارہ تب جب سانس نہ لے سکا"!)۔

یعنی جو قوم اپنا بہت کچھ پاس رکھتے اور ایک بہترین پوزیشن میں ہوتے ہوئے اپنا ایک کے بعد ایک قلعہ دشمن کو دیتی چلی گئی ہے، اور یہ تمام عرصہ اس کا 'احساسِ زیاں' جاگنے کا نام نہیں لیتا، یہاں تک کہ پوری زیر ہو جاتی ہے... اب جب وہ اپنا سب کچھ ہاتھ سے دے چکی اور دشمن کی مکمل محکوم ہو چکی تو وہ آناً فاناً اس "پوزیشن" میں ہو گی کہ لڑ کر دشمن کو شکستِ فاش سے دوچار کر دے! اسے 'خواہش' تو آپ ضرور کہہ سکتے ہیں اور چند باعزیمت لوگ اس کے لیے قربانیاں دینے میں اپنے آپ کو سچا بھی ثابت کر سکتے ہیں مگر "قوم" بھی اِس راہ میں کچھ ہل جُل کر دے دے، 'اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'۔ حق یہ ہے کہ "قوم" کو "تحریک" میں ڈھالنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔

اس اتنے بھاری بوجھ (انگریزی اقتدار سے پوری ایک قوم کو رہا کروا کر اس کا کھویا ہوا اقتدار بحال کروا لینا) کو اٹھانے کے لیے آپ کے بڑے بڑے صالحین کو کہیں فرانسیسیوں کا دستِ کرم دیکھنا پڑتا ہے، کہیں جاپان کا، تو کہیں ہٹلر کا، تو کہیں روس کے در پر دستک دینا پڑتی ہے۔ ہر ایک کی اپنی اپنی شرطیں اور اپنے مفادات اور اپنی اپنی اسکیمیں اور چالیں... اور ہر ایک

کی اپنی اپنی کمینگی۔ ان سب کے مابین اکثر اوقات آپ ایک 'کارڈ' کے طور پر ہی برتے جاتے ہیں؛ ایک ایسا کارڈ جو کسی وقت پھینکنے کا ہوتا ہے تو کسی وقت سنبھال رکھنے اور 'وقت آنے پر' دیکھنے کا (اور دریں اثنا آپ کو خراب ہونے کے لیے چھوڑ رکھنے کا)۔ پھر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ سب قربانیاں دے لینے کے بعد بھی (عربی ضرب المثال کے مصداق) آپ کسی بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے جا کھڑے نہیں ہوں گے؛ یعنی 'متبادل' کوئی اس سے بھی بُرا قبضہ کار ثابت نہیں ہو گا۔

- دوسری جانب 'سر سید والے آپشن' کو برحق اور واجب قرار دینے والے (اور کسی وقت تو کالا پانی کی سزائیں بھگتنے والے صالحین کا مذاق اڑانے تک چلے جانے والے) اپنے دلائل رکھتے ہیں، گویا کمی ہی اسی بات کی تھی جو انگریز کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر پوری کر لی گئی... اور اس کے نتیجے میں بالآخر قوم نے 'فلاح' کی راہ ڈھونڈ لی! یعنی جب بھی کوئی قوم آپ پر چڑھ آئے اور آپ کو سدھانے اور غلامی و ٹیکس کلکٹری کی ٹریننگ کے باقاعدہ کچھ پروگرام جاری کرے تو ان میں داخلے لینے کی تحریک چلا دو اور اُس کے وہ کورس اعلیٰ نمبروں میں پاس کر کے دکھاؤ... اور غلاموں کی گریڈنگ میں اوپر جانے کے لیے اُس کے مقرر کیے ہوئے طریقے کو بہترین انداز میں 'فالو' کرو! 'وقت کے تقاضوں' کو سمجھنا عین اسی رویّے کا نام ہے! یعنی ایک جسمانی مغلوبیت انجام پا جانے کے بعد ایک باقاعدہ ذہنی و ثقافتی سرنڈر۔ آقا کا اعتماد پانا اس کے بغیر ممکن ہوتا بھی نہیں! بات سچ ہے مگر ہے رسوائی کی۔

غرض ہر دو فریق کو زعم ہے کہ اس صورتحال سے 'نمٹنے' کے لیے جو انگریزی اقتدار کی صورت انیسویں صدی میں مسلمانوں کے سر پر آ پڑی تھی، وہ قوم کو ایک بہترین و کامیاب ترین طریقے کی نشاندہی کر کے دے سکتا تھا!

جبکہ یہ وہ بلا تھی جو بنی اسرائیل کے حوالے سے یوں بیان ہوئی: آلِ فِرْعَوْنَ

يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ۔

حق یہ ہے کہ اس سوال کا جواب دینا آسان ہی نہیں تھا (انیسویں صدی کا سیناریو)۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب ہی مسلمانوں کے پاس نہیں رہ گیا تھا۔ غلامی کی ایک ایسی نوبت کو پہنچ جانے کے بعد مسلمانوں کے پاس کوئی آپشن رہ ہی نہیں گیا تھا۔ دنیا پوری ان کے لیے اندھیر ہو چکی تھی۔ غیر قوم کے قبضے میں آجانے کے بعد __ قومی سطح پر __ آپ کے پاس کوئی آپشن نہیں رہتا، خصوصاً اگر آپ کی پشت پر کوئی اور مضبوط مسلم قوت بھی نہ رہ گئی ہو۔ جتنے 'آپشن' اُس وقت نظر آتے ہیں، وہ ایک سے ایک برا ہوتا ہے۔

ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو اُس وقت (انیسویں صدی کے سیناریو میں) کچھ نہ کرنا چاہیے تھا۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہتے؛ مسلم قیادتوں کو کوئی بھی اسکیم مسلمانوں کو بنا کر نہ دینی چاہیے تھی۔ ظاہر ہے ہم یہ نہیں کہہ رہے۔

کسی صورتحال کے ساتھ 'معاملہ' کرنے کے لیے اور اُس کے اندر 'جو ہو سکتا ہے' اُسے انجام دینے کے لیے تو لامحالہ آپ کو کوئی اسکیم بنا کر قوم کو دینا ہوتی ہے خواہ وہ کوئی بدترین سے بدترین صورتحال کیوں نہ ہو۔ اس لحاظ سے مسلم قیادتوں کی ذمہ داری تو (مسلمانوں کی غلامی تو رہی ایک طرف) حالتِ اسیری کے اندر موقوف نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں، بابل کی اسیری کے دوران بھی ان کو انبیاء کی قیادت میسر کرائی جاتی ہے (اُس وقت کا ایک نبی دانیال بتایا جاتا ہے جس کا بخت نصر کے ساتھ ملاقاتیں کرنا بھی تاریخ میں مذکور ہے)۔ پس ''راہنمائی'' تو ''ممکنہ چارہ جوئی'' سے متعلق آپ کو ہر حال میں قوم کو دینا ہوتی ہے۔ ہمارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ''انیسویں صدی'' آپ کی تاریخ کا بدترین سیناریو تھا جہاں آپ اپنی اجتماعی زندگی کے بدترین آپشنز کا سامنا کر رہے تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر خوفناک گڑھے میں گرتے چلے جا رہے تھے۔ دربدر کی ٹھوکریں جو

آپ نے رنجیت سنگھ کے ایام میں کھائیں یہاں تک کہ اس ذلت کا جو ااتار پھینکنے کے لیے بمشکل تمام پورے ہند سے مجاہدین کی جو ایک مٹھی بھر جمعیت مہیا ہو سکی، وہ بالاکوٹ کے میدان میں کھیت ہو کر ہماری امیدوں کا آخری چراغ بھی گل کر گئی۔ اور اس کے بعد بے بسی جو آپ نے انگریز کے دور میں دیکھی اور جس کے آگے آپ کو مشرق تا مغرب کہیں سے مدد کی کوئی امید نہ رہ گئی تھی۔ وہ تو شکر کریں کہ پردۂ غیب سے ایک طرح کی مدد آپہنچی اور چند عشروں کے اندر ہی ''عالمی جنگوں'' کے دم قدم سے سیناریو بدل گیا اور ''آزادیوں'' کی ایک نہ واپس ہونے والی لہر چل پڑی، جس کا کریڈٹ یہاں انیسویں اور بیسویں صدی میں اختیار کیے جانے والے کسی بھی 'منہج' کو نہیں دیا جاسکتا؛ صرف خدا کی حمد کی جاسکتی ہے جو مسلمانوں کا ولی و کارساز ہے اور انہیں کسی بھی حال میں بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔

میں یہ چاہوں گا کہ اس بات کا کچھ اندازہ ضرور کر لیا جائے کہ یورپ کی کمر توڑ دینے والی عالمی جنگوں اور ان کے بطن سے پھوٹنے والی آزادیوں کا یہ منظرنامہ اگر پردۂ غیب سے ظاہر نہ ہوتا اور ''انیسویں صدی'' والا وہی منظرنامہ اپنی اُسی سفاکی اور سیاہ ناکی کے ساتھ کوئی ایک ڈیڑھ صدی جاری رہ لیتا تو آج آپ کس پاتال میں ہوتے۔ (جبکہ اللہ کا شکر ہے، آج حال یہ کہ آپ ایک سپر پاور کو شکست دے کر کوئی درجن بھر ملکوں میں اپنی اذان بحال کروا چکے اور دوسری سپر پاور کو ناکوں چنے چبوا رہے ہیں)۔ حضرات! کسی 'مثالیت' اور 'یوٹوپیا' میں رہنے کا اگر آپ فیصلہ کر ہی چکے ہیں اور اِس ضد میں اپنا سب کچھ ہاتھ سے دیتے چلے جانے کا ارادہ ہی فرما چکے ہیں تو کوئی آپ کو اس طرف جانے سے کیسے روک سکتا ہے۔ ورنہ اس بات کا ادراک کرنے میں حرج نہیں کہ **مسلمانوں کو کوئی نہ کوئی ''اجتماعی اکائی'' میسر آئی ہونا خواہ وہ کسی بھی قیمت پر ہو، براہِ راست کافروں کے زیرِ قبضہ ایک 'فرد' ہونے کی نسبت کہیں وارے کا ہے۔** اُس میں تو آپ کا کچھ بچتا ہی نہیں ہے، حضرات۔

بیسویں صدی میں ”آزادیوں“ کے اِس فنامنا سے پہلے، ابھی آپ کے کچھ تھوڑے بہت مصالح سنبھالے گئے اور آپ کے علمی و ثقافتی ورثہ کو کچھ تھوڑا بہت تحفظ اور سرپرستی حاصل رہی تو وہ انگریز کی کاسہ لیس اُن لولی لنگڑی ریاستوں کے طفیل جہاں کسی درجے میں مسلمانوں کی ایک اجتماعیت قائم تھی، مانند ریاست بہاولپور، ریاست بھوپال اور نظام حیدرآباد وغیرہ۔ تاریخ پڑھیں تو آپ کے علم و فضل کے اکثر لٹے پٹے ’آثار‘ یہیں کا قصد کیا کرتے تھے۔ سوانہی کے دم سے آپ کے کچھ دن نکل گئے۔ ان برائے نام مسلم ریاستوں کو آپ ’بھاگتے چور کی لنگوٹی‘ ہی کہہ لیجئے، بلکہ اس سے بھی کم، لیکن خوابوں، نعروں اور بڑھکوں کی دنیا میں رہنے کی بجائے اگر آپ کسی صاحبِ تحقیق سے کہیں کہ وہ ذرا اس پر آپ کو ایک تحقیق پیش کردیں کہ مسلم مصالح اور اسلامی آثار کے تحفظ میں تاریخی طور پر ریاست بہاولپور، بھوپال اور حیدرآباد وغیرہ کا کیا کردار رہا ہے تو اس کے مطالعہ سے شاید آپ کی آنکھیں کھل جائیں۔ یہی نواب جن کے تعیّش، مفادپرستی اور بےدینی کی حکایتیں بھی آپ بےحساب سنا سکتے ہیں، اور وہ یقیناً سچی ہوں گی، لیکن انہی ’بےدین‘ نوابوں کے دم سے کتنے ”صالحین“ اور کتنے ”علماء و فضلاء“ کو سر چھپانے کی جگہ بھی میسر آئی رہی، اور کتنے مواقع پر برصغیر کا بےسہارا مسلمان اور اس کے مفادات کچھ نہ کچھ سہارا بھی پالیتے رہے، یہ کہانی بھی بہرحال سننے کی ہے۔

آج کے مثالیت پسند افکار جو آپ کو کچھ جذباتی راستوں پر چلانا چاہتے ہیں... آپ ذرا تجزیہ کریں تو ان میں سے کوئی ایک بھی ”سوسائٹی“ کے ساتھ معاملہ کرنے کی سائنس سے آگاہ نہیں۔ چند صد افراد کی ایک جماعت کو شاید یہ لوگ ”سوسائٹی“ سمجھتے ہیں اور اسی کے مسائل کو ”سوسائٹی“ کے مسائل! ان کو شاید اندازہ بھی نہیں ہے کہ ”قوم“ کا بوجھ کس بلا کا نام ہے اور وہ کیسا ایک پیچیدہ معاملہ ہے اور اس کے لیے کس کس جہت سے آپ کو پریشان رہنا ہوتا ہے۔ نیز اس کے لیے کیسے کیسے صبر اور تحمل کی ضرورت ہے اور کیسے کیسے

ظالموں کے ساتھ آپ کو بردباری کا معاملہ کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے وہ مشائخ جن کی بابت ہمارا گمان ہے اللہ نے انہیں بیک وقت دینِ خالص کی سمجھ اور سماجی حقیقتوں کا فہم دے رکھا ہے، پھر وہ ائمہ سلف کے کلاسیکل منہج سے بھی نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ فی زمانہ اس کی باقاعدہ تطبیق کرتے ہیں... ہمارے یہ مشائخ مسلم اجتماعیت کی اِن سب اکائیوں کو جو آج ہمیں حاصل ہیں بسا غنیمت جانتے ہیں۔ اِن کو مسلمانوں کے گھر کا درجہ دیتے ہیں، اگرچہ مسلمانوں کے یہ گھر فی الحال کوئی اطمینان بخش نقشہ پیش نہ بھی کر پا رہے ہوں اور اِن کا بہت کچھ اپنی اصل حالت پر باقی نہ بھی رہ گیا ہو۔ ہمارے ان مشائخ کے یہاں بے شک کسی وقت اِن گھروں کو شدید سے شدید تنقید کا محل بھی ٹھہرایا جاتا ہو، یہاں کے مکینوں کو بڑے بڑے زور سے جھنجھوڑا بھی جاتا ہو، اس لحاظ سے کہ یہاں کے کارپردوازں کی دین سے دُوری اور مفاد پرستی یہاں کے ہر دردمند کو مبتلائے تشویش کرتی اور ہر چارہ گر کو دعوتِ اصلاح دیتی ہے اور خود یہاں کے مکینوں کی حالت انہیں خون کے آنسو رُلاتی ہے... لیکن یہ سب تنقید و سرزنش اس قیمت پر نہیں کہ یہ گھر بیرونی قبضوں اور اندرنی خلفشار کے لیے لقمۂ تر بننے دیے جائیں۔ ہاں ایسے (بیرونی و اندرونی) خدشات کے مقابلے پر یہ (ائمۂ سنت) ہی اِن گھروں کے سب سے بڑے محافظ بن کر سامنے آتے ہیں، خواہ اس کے لیے انہیں کوئی بھی قیمت دینا پڑے۔ بیرون کے (صلیبی / صیہونی / بھارتی) کینہ پروروں کے مقابلے پر بھی یہی قوم کو اٹھاتے اور جگاتے ہیں اور درون کے ففتھ کالمسٹوں (سرخوں / لبرلوں / قادیانیوں / باطنیوں وغیرہ) کی بابت بھی یہی قوم کی آنکھیں کھولنے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ ایسی کسی نادانی کا تو سوال ہی نہیں کہ اپنے ہی کسی اقدام سے یہ اپنے اِن گھروں پر باہر کے بھیڑیوں اور اندر کے گِدھوں کا ہاتھ پڑ جانے دیں۔ اور یہ تو آخری حد تک ناقابلِ تصور: کہ باہر کے بھیڑیے اور اندر کے گِدھ ہی یہاں کے بہی خواہ اور رکھوالے نظر آئیں اور یہ خود یہاں کے بدخواہ! اِن علمائے سنت کو

خدا نے وہ سمجھ عطا کر رکھی ہے کہ

1. اِن گھروں کا تحفظ، اور

2. اِن کے اندر خدا کی شریعت کا قیام

اِن کے ہاں دو ایسے واضح شرعی مطالب ہیں جو کسی بھی وقت آپس میں متصادم نہیں ہوتے بلکہ یہ مسلسل ایک دوسرے کو مکمل اور ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں۔ جتنی پیش رفت یہ ایک میدان میں کریں اس سے اتنی ہی مدد یہ دوسرے میدان میں پاتے ہیں۔ ہاں اس کے لیے ایک حکمت اور دور اندیشی ضروری ہے؛ اور چیزوں کا فوری فوری جڑتے ہوئے نظر آنا ضروری نہیں۔ بس یہ بصیرت آپ میدان میں لے آیئے اور اس کے لیے مطلوبہ حوصلہ، صبر اور بُعدِ نظر پیدا کر لیجئے، ان شاءاللہ یہ ملک آپ کے ہیں۔ بصورتِ دیگر (خاکم بدہن) نہ یہ ملک آپ کے پاس رہنے والے ہیں اور نہ شریعت یہاں آپ کو ملنے والی ہے؛ آپ گھِر گھِرا کر چھوٹے چھوٹے ڈربوں میں قید اُسی "انیسویں صدی" والے سیناریو میں جا پہنچنے والے ہیں جہاں آدمی کے پاس کوئی آپشن ہوتا ہی نہیں؛ جو کرنا ہوتا ہے دشمن نے کرنا ہوتا ہے؛ آپ نے کسی نپولین یا ہٹلر کی راہ دیکھنی ہوتی ہے یا کسی مہدی اور مسیح کے لیے دعائیں۔ (لا قدّرَ اللہ)۔

باہر آنکھیں کھول کر دیکھئے، دشمن کئی ملکوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ آپ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر بھی چکا ہے اور اس عمل کو پورے تسلسل کے ساتھ آگے بڑھاتا جا رہا ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے، وہ اپنی سب چالیں عین اِسی سمت میں تو چلتا جا رہا ہے۔ ابھی تک اس میں رکاوٹ آئی ہے یا آئندہ آنے والی ہے تو کچھ مضبوط سخت جان مسلم ممالک کے دم سے۔ ورنہ آپ دیکھتے، ہر جا آپ کے کتنے کتنے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ البتہ جتنے ملک آپ کے اب تک ٹوٹ بکھر چکے اور نامعلوم 'ملیشیاؤں' کے حوالے کرائے جا چکے، وہ یہ اندازہ کرانے کو کافی ہیں کہ دشمن کے عزائم آپ کے اِن ملکوں کی بابت ہیں کیا۔ نیز ان عزائم کو

سرے چڑھانے کے ڈھب patterns اُس کے یہاں کیا ہیں۔

پس ہمارے یہ مشائخ کبھی اس بات کے روادار نہیں ہوتے کہ ایک معاملے کا بڑا نقشہ نظر انداز کر کے اس کے کسی چھوٹے حصے پر ہی نظر مرکوز کر لیں اور وہیں پر کمال کر دینے کی کوشش کریں۔ ’معرکہ‘ جیتنے کی گرمجوشی میں ”جنگ“ ہار دینے (winning a battle but losing a war) ایسی نادانی یہ کبھی نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے؛ کوتاہ نظر لوگ اکثر ان سے شاکی رہتے اور عموماً وقت گزر جانے کے بعد ان کے مواقف کی صحت کا اندازہ کرتے ہیں۔

اسلامی تحریکی عمل میں چند جذری ترمیمات سفارشات

ادار یہ

حامد کمال الدین

بہت دوستوں نے اصرار کیا ہے کہ ملک میں اسلامی عمل کو درپیش چیلنجز کے حوالے سے ہم کچھ سفارشات قوم کے دردمندوں کے آگے پیش کریں۔

یہ امتِ محمدؐ ہے؛ کوئی یہاں امت کے مفاد سے قیمتی تر نہیں۔ کسی سے قربت، کسی سے دُوری، کسی کا ڈر، کسی کی رضا، کسی کی خفگی یہ ایک امانت ادا کرنے میں مانع آئے، یہ ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ واللہ أحقُّ أن تخشاہ۔ نہایت اختصار کے ساتھ، اور اپنی بہترین صوابدید سے کام لیتے ہوئے، ہم ایک امانت قوم کے چارہ گروں کے سپرد کرنا چاہیں گے، ان تین مقدمات کے بعد:

1. ہماری یہ تجاویز اِس ملک کے اندر درکار ایک دینی راہنمائی سے متعلق ہیں۔ وہ سب لوگ جو کسی درجے میں قوم کو دینی راہنمائی دینے کے عمل سے وابستہ ہیں، اپنی اپنی اہمیت، تاثیر اور پوزیشن کے بقدر ہماری ان گزارشات کے مخاطب ہوں گے۔
2. یہ سب لائحۂ عمل چونکہ ایک مخصوص (الجھی ہوئی) صورتحال سے متعلق ہے، لہٰذا ان سب باتوں کو کسی مطلق سیاق an absolute context میں نہ لیا جائے۔ ایک "دی ہوئی صورتحال" میں جو امور زیرِ غور آتے ہیں، ان کی سب شرعی بنیادیں اور سب علمی پراسیس اُسی "دی ہوئی صورتحال" کے حوالے سے اختیار کیے گئے ہوتے ہیں۔ ان کو کسی مطلق حوالے an absolute reference کے طور پر لینا یا ان پر

کسی مستقل حوالے سے نقد کرنا درست نہ ہو گا۔ ہم یہ گزارش ہی کر سکتے ہیں۔ باقی "نشر" کرنے والوں کی اپنی سمجھ، اور ان کا ضمیر۔

3. "اسلامی عمل" یہاں اب سے نہیں طویل عرصے سے بند گلی پر پہنچا ہوا ہے۔ کسی کو اب بھی اصرار ہے کہ سب ٹھیک جارہا ہے تو وہ ضرور اپنا کام اسی ڈگر پہ جاری رکھے۔ البتہ ہمارے مخاطب وہ حضرات ہیں جن کا ماننا ہے کہ معاملہ کہیں پر خراب ضرور ہے۔

اور اب ہماری یہ سفارشات:

نظریۂ انقلاب پر ایک نظرثانی کی ضرورت

"انقلاب" اور "غلبۂ اسلام" ایسی اشیاء کو **دعوت** کا عنوان بنانے پر اسلامی تحریکی عمل کو ایک نظرثانی کرنا ہو گی۔

بہت سے مسلم ملکوں میں یہ نظرثانی ہو چکی: تحریکیں وہاں 'انقلاب' اور 'اسلامی حکومت' ایسے نعروں کو اب آگے نہیں رکھ رہیں۔ (لیکن یہ عمل کس طریقے سے وہاں انجام پایا ہے، اس پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے، اور خود ہمارے اِس پر ملاحظات ہیں)۔ البتہ کچھ پیش رفت اِس "نظرثانی" کے بعد ہی اُن ملکوں کے اندر ہو پائی ہے۔ میں عرض کروں گا، اس کے بغیر آگے بڑھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کو مؤخر کرتے جانا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے والی بات ہو گی۔ یہ بلاضرورت تاخیر آپ کا ڈھیروں نقصان کروا چکی۔ ایک چیز ہونی تو بہر حال ہے: البتہ اس میں دیر کرنا "وقت" کے فیکٹر کو آپ کے خلاف کرتا چلا جاتا ہے؛ بالآخر آپ زیادہ قیمت دے کر وہی کام کرتے ہیں!

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم پہلے دن سے "انقلابی منہج" کو کوئی صائب طریق نہیں جانتے۔ (البتہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر، حالیہ شمارہ میں ہم نے الگ سے ائمۂ سنت کے "کلاسیکل" منہج اور دورِ حاضر کے "انقلابی" منہج کا فرق واضح کرنے کی کوشش کی

ہے، اس موضوع کی تفصیلات کے لیے وہیں سے رجوع کیا جائے)۔ اِس نظرِثانی سے متعلقہ چند پہلوؤں کے حوالہ سے، ہم تین سال پہلے ایک طویل اداریہ قلمبند کر چکے ہیں بہ عنوان "پیراڈائم شفٹ اپنے پختہ تر مراحل میں"۔ اُس مضمون سے بھی ہمارا مقصود کچھ واضح ہو سکتا ہے۔ اُس کا مکمل اِعادہ یہاں ممکن نہیں۔ مختصراً:

1. پیراڈائم (یعنی تصورات) کے اندر تو ایک شدید درجہ کا ٹھیٹ پن رکھنا۔ دورِ حاضر کی فکری اھواء کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت conciliation قبول نہ کرنا؛ اور یہاں پر چیزوں کو خالص سے خالص رکھنا۔ اِسی ٹھیٹ دین پر جینا، اسی پر مرنا، اسی کو پیچھے والوں کے لیے چھوڑ کر جانا (**كلمةً باقيةً**)، اسی پر حشر کی آرزو۔ سلف کی تفاسیر دیکھیں تو یہی معنیٰ قوی تر ٹھہرتا ہے کہ اہل باطل کے ساتھ "**تَوَلِّی**" (رفاقت) اور ان کی جانب "**رُکُون**" (جھکاؤ کر لینا) جس پر شدید ترین وعیدیں آئی ہیں، وہ اصل میں نظریات کے اندر ہوتا ہے، جن میں ٹھیٹ پن رکھنا آپ کی خصوصی ترجیح اور محنت ہونی چاہیے۔ داخلی کھپت internal consumption (خود اپنے لوگوں کے حوالہ کے لیے) اصطلاحات تک کافروں سے لینے کا روادار نہ ہونا۔
2. البتہ عمل اور پیش قدمی کے اندر "منہجِ استطاعت" اختیار کرنا۔[1] اسی کو ہم "دستیاب مواقع کو اختیار کرنا" بھی کہتے ہیں۔ جس کی صورت ظاہر ہے ہماری طرف

---

[1] پہلا نقطہ ایقاظ کا عمومی موضوع ہے۔ یہ دوسرا نقطہ ان مضامین میں کچھ واضح کیا گیا ہے:

1. "درمیانی مرحلہ کے بعض احکام" (ایقاظ، اپریل 2013)
2. واقعۂ یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ابن تیمیہ کی تقریر (ایقاظ جولائی 2013)
3. غیر شرعی نظام کو بنانے اور اس کے اندر شرکت کرنے میں فرق ہے (ایقاظ اپریل 2014)
4. "لوگوں کو بتدریج دین پر لانا" (ایقاظ، اکتوبر 2014)
5. الحنیفیۃ السمحۃ (ہماری تالیف "موحد تحریک" کی ایک فصل)

سے پیشگی طے نہیں ہوتی (کہ ہم واقعات کی ایک خاص ترتیب کو منہج کہہ ڈالیں) بلکہ اس کی صورت "دستیاب مواقع" خود طے کریں گے جو مختلف حالات میں اور مختلف ممالک کے اندر مختلف ہو سکتی ہے۔ یہاں سے؛ اپنے آگے بڑھنے کے راستے بنانے کے لیے آپ کو ایک ڈائنامزم ملتا ہے۔ یعنی "مواقع" پر آپ اپنی پیشگی شروط عائد کر کے اپنے راستے تنگ نہیں کر لیتے (کہ مواقع اگر آپ کی شرطیں پوری نہیں کرتے تو آپ کو بیٹھ رہنا ہے اور انتظار کرنا ہے کہ وہ آپ کی شرطوں پر آئیں 'کیونکہ منہج یہی ہے'!) بلکہ "مواقع" کے اندر، وہ جیسے ہیں، خود اپنے راستے بناتے ہیں اور بالآخر ان کو اپنے ڈھب پر لے آتے ہیں (بشرطیکہ "پیراڈائم" میں آپ آخری درجے کے ثابت قدم stubborn واقع ہوئے ہوں؛ جو کہ آپ کی اصل قوت ہے اور اسی پر آپ کو بہت سی توجہ دینا ہوتی ہے؛ بصورتِ دیگر یہ 'میلہ' دیکھنا بے حد مہنگا پڑ سکتا ہے، اس سے ہم آپ کو پیشگی خبردار کیے دیتے ہیں)۔ البتہ اس ساری پیش قدمی کو ضبط میں رکھنے کے لیے ہمارے پاس ایک قاعدہ رہتا ہے اور وہ ہے "مصالح اور مفاسد کا شرعی موازنہ"۔ یعنی ایک عمل میں پائی جانے والی مصلحت اور مفسدت میں سے جو چیز بھاری ہو اس کا اعتبار کیا جائے]

سب سے اہم بات دعوت کا مضمون اور عنوان ہے۔ "انقلاب" کو دعوت کا مضمون و عنوان بنانے والے حضرات بالعموم 'مکی مرحلے' سے استدلال بھی فرماتے ہیں۔ ہم عرض کریں گے: چلیے اس 'مکی مرحلے' کو ہی لے لیں اور "مکی قرآن" کو ہی لے لیں، اس کے موضوعات میں "انقلاب" کا ذکر کہاں ہے؟ اپنے زمانے کے شرک کی ایک جا بجا نفی ہے اور اس کا شدید ابطال ہے۔ خدا کی تعظیم اور تنہا اُسی ایک کی عبادت کا جا بجا اِثبات ہے۔ 'حکومت' یا 'ریاست' حاصل کرنے کا تو کہیں کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ (آپ قرآن و سیرت کا وہ سارا مکی بیان پڑھ جائیے)۔ شرک اور توحید کے اُس بیان سے جو مکی قرآن میں ملتا ہے،

نیز جو نبی ﷺ کے مکی مضامین میں ملتا ہے، اسلام کی ایک حکومت ہونے کا لزوم کسی حد تک 'ذہنوں' کے اندر آتا ہے۔ یہ ہم مانتے ہیں۔ لیکن ہم کہیں گے: یہاں قرآن اور سیرت کی بہترین اتباع یہی ہوگی کہ وہ چیز جو 'ذہنوں' میں خودبخود آتی ہے اس کو آپ بھی 'زبان' پر مت لائیے اور 'خودبخود' ہی ذہنوں میں آنے دیجئے۔ مکی قرآن اور مکی سیرت کی صحیح تطبیق تو یہ ہوگی۔ 'زبان' پر البتہ آپ کے وہی موضوعات ہوں جو وہاں 'زبان' پر تھے: صرف شرک کا ابطال۔ توحید کا اِثبات۔ سب معاملات خدا کی جانب لوٹانے کی تاکید۔ اور قلوب کو خدا کے ساتھ جوڑتے اور نفوس کو آخرت کے ساتھ وابستہ کرتے پل پل پر دہرائے جانے والے بیانات۔ خدا کو نفسِ انسانی میں مرکزی ترین حیثیت دلوانا۔ ایک بات کو "**دعوت** کا موضوع" بنانے سے ہماری یہی مراد ہے۔ ورنہ "غلبۂ اسلام" پر ایمان ہم بھی رکھتے ہیں۔ البتہ زیرِبحث مسئلہ آپ کی پریزنٹیشن presentation کا ہے کہ وہ کیا ہو۔ یہ جگہ 'انقلاب' کے پاس چلی جانا بلکہ **دعوت** کا عنوان ہی یہ بن جانا نہ تو کوئی 'مکی' مرحلہ ہے اور نہ 'مدنی'۔ جو چیز "لزوم" کے زمرے میں آنی چاہئے اس کو "عنوان" مت بنائیے۔ اور جو چیز "عنوان" ہونا چاہئے اس کو "لزوم" کے خانے میں مت جانے دیجئے۔

اسی چیز کو ایک دوسرے پہلو سے ہم 'تنظیمی عمل' کی بجائے "دعوتی عمل" بھی کہتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارے اِسی شمارہ میں شامل مضمون "کلاسیکل ڈسکورس کا انقلابی ڈسکورس سے فرق" پوائنٹ 8)۔ یہاں آپ 'تنظیمی' کی بجائے "دعوتی" فارمیٹ اپنے عمل میں لے آیئے؛ بفضلِ خدا آپ ایک طوفان برپا کرسکیں گے؛ کیونکہ جو قوت "دعوت" میں ہے وہ "تنظیم" میں ہے اور نہ کسی چیز میں۔ کون "ہماری تنظیم" میں آرہا ہے اور کون ابھی "ہماری تنظیم" میں آنے کے لیے تیار نہیں، اِس اپروچ ہی کو اپنے یہاں سے ختم کردیجئے ("دعوت" کے اندر)۔ **کس کا ایک چیز پر "ایمان" ہے اور وہ اس کو اپنی "تواصی" کا موضوع بنانے پر آمادہ ہے اور کون اس چیز کو ماننے سے پس وپیش کرتا ہے،** سارا فوکس اِس پوائنٹ پر

چلا جانا چاہیے۔ (''دعوت'' بہر حال اِسی چیز کا نام ہے)۔ معاشرے کو دو حصوں میں بانٹ دینے والی چیز کچھ واضح شرعی حقائق کو ماننا یا انہیں ماننے میں پس و پیش کرنا ہو جائے؛ اس کا نام ہے دعوتی اپروچ، جس پر ہم بے حد زور دیں گے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور معاشرے کے ثقافتی مراکز میں **اسلام کی کچھ بنیادی باتوں کو منوانے اور جاہلیت کے کچھ مرکزی مضامین کا انکار کروانے** پر کُل زور ہو جائے (دعوتی اپروچ) بہ نسبت اس بات کے کہ 'ہمارے نظم میں آیئے' (تنظیمی اپروچ)۔ یہاں سے؛ معاشرے کی ایک خالص نظریاتی تقسیم عمل میں آئے گی؛ جو بے حد ضروری ہے۔ معاشرے میں ایک خالص نظریاتی اختلاف کھڑا کیا جائے گا؛ جو کہ ''**دعوت**'' کا ایک بڑا مطلوب ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا بہت سے علماء، مشائخ، پروفیسر، دانشور، سماجی، سیاسی، ثقافتی اثر و رسوخ کی مالک شخصیات ایک ''نظریے'' سے وابستہ ہونا حتیٰ کہ اس ''نظریے'' کا عَلَم اٹھانا بآسانی قبول کرتی ہیں بہ نسبت ایک ''تنظیم'' سے وابستہ ہونے کے۔ لیکن یہاں غلطی سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چونکہ 'منہج' ہی یہ ہے کہ لازماً لوگوں کو ایک ''تنظیم'' میں لایا جائے، جبکہ ''تنظیم'' میں آنے کے لیے اکثر سربرآوردہ لوگ تیار ہی نہیں ہوتے، اس لیے معاشرے میں آگے بڑھنے اور مؤثر افراد کو دعوت کا عَلَم اٹھوانے کے معاملہ میں اپنا کام غیر ضروری طور پر مشکل کر رکھنا ہماری ایک 'منہجی' مجبوری ٹھہری! یعنی کام ہو تو پورا ہو (اور وہ یہ کہ ہر بڑے سے بڑا آدمی سیدھا سیدھا ہماری اطاعت میں آئے اور ہمارے تنظیمی احکامات کی تعمیل کرنے لگے)؛ نہیں تو نہیں! ایسا کام بھلا کب آگے بڑھے گا؟ وہ تو ''تنظیم'' ہی کے پوائنٹ پر کھڑا رہے گا۔ (نہ بڑے بڑے لوگ تنظیم میں آئیں اور نہ بات آگے بڑھے!) حیرت یہ کہ اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سب لوگ تنظیم میں آنے پر آمادہ نہیں ہوتے کچھ جماعتوں کے ہاں 'حامی' یا 'ہمخیال' ایسا خانہ رکھا گیا تو وہ بھی 'تنظیم' کا حامی یا ہمخیال! بھائی 'تنظیم' کو بالکل ہی پیچھے لے جایئے۔ اصل مسئلہ بنا دیجئے کچھ نظریات (عقیدہ) پر ایمان رکھنے اور نہ

رکھنے کو۔ معاشرے میں ہلچل اسی بنیاد پر ہونی چاہئے (اور ہو سکتی ہے) کہ فلاں بات حق ہے اور فلاں بات باطل۔ کُل محنت اسی پر ہو۔ یہاں کوئی مضمون ہو جس کو منوانے پر کُل زور صرف ہو رہا ہو؛ **اور بس۔** گلی گلی، محلے محلے، کچھ ایشوز ہوں (اور وہ بھی ایمانی انداز کے) جو لوگوں کے قلب و ذہن کو جھنجھوڑ رہے ہوں (دوبارہ واضح کردیں: وہ "عقیدہ" کے ایشوز ہوں نہ کہ 'انقلاب' کے) تاآنکہ لوگوں کے لیے ان (ایمانی) ایشوز کے معاملہ میں غیر جانبدار رہنا دشوار کر دیا جائے۔ اسے ہم کہتے ہیں "دعوتی اپروچ"؛ جو ایک طویل محنت چاہتی ہے۔ ہاں دعوت جب معاشرے میں ایک راستہ بنالیتی ہے، ذہنوں کو متاثر کرلیتی ہے، ایک جاندار اختلاف یہاں کی ایک ایک بیٹھک ایک ایک چوپال میں برپا کرلیتی ہے، ایک صحتمند ڈیبیٹ debate جگہ جگہ کھڑا کرلیتی ہے، جس پر خوب وقت لگتا ہے... اور اس کے نتیجے میں ایشوز یہاں بچے بچے کی زبان پر بولنے لگتے ہیں، حمایت اور مخالفت کی بنیاد کچھ ایمانی موضوعات ہوتے ہیں، اور ان (موضوعات) کے حق میں ایسے ایسے لوگ ایسی ایسی جگہوں پر آواز اٹھا رہے ہوتے ہیں جو آپ کے نظم میں تو کیا، آپ کے علم اور آپ کے سان گمان میں نہیں ہوتے۔ ("دعوت" اصل میں کہتے ہی اس نامیاتی organic چیز کو ہیں جو اپنا عمل خود کرتی ہے؛ آپ کو صرف اس کا "بیج" ڈالنا اور ایک تسلسل کے ساتھ اُس کو "سیراب" کرنا ہوتا ہے؛ باقی کا کام خود اسی پر چھوڑنا ہوتا ہے)... غرض کچھ ایمانی موضوعات معاشرے میں جب ایک صحتمند اختلاف پیدا کرلیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک صحتمند تقسیم معاشرے کے اندر انجام پالیتی ہے... تو تب یہ ہوتا ہے کہ ان ایشوز (ایمانی موضوعات) کے لیے معاشرے میں جو شخصیات اور تنظیمیں اور فورَمز سب سے زیادہ سرگرم رہے ہوں وہ بھی توجہ کا مرکز بنیں۔ تب ایک الگ محور پر لوگ ان شخصیات اور تنظیموں اور فورَمز سے جڑتے بھی ہیں۔ زیادہ تر لوگ ایک عقیدت کی صورت میں اور کچھ لوگ باقاعدہ راہنمائی لینے کی صورت میں۔ البتہ ایک بڑی تعداد کی وابستگی تب بھی صرف اُس کیس

کے ساتھ ہوتی ہے جس کی آپ نے معاشرے میں ایک گونج اٹھائی تھی (نہ کہ آپ کی تنظیم یا آپ کی شخصیت کے ساتھ)۔ خصوصاً سربرآوردہ لوگوں کی وابستگی؛ جن کے بولنے سے واقعتاً معاشرے کو کچھ فرق آتا ہو۔ (یعنی تنظیموں اور شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہونے والے لوگ کبھی بھی بہت بڑی تعداد میں نہ ہوں گے؛ ابھی کی تو سوچیے ہی مت!) **البتہ تب یہ ہوتا ہے کہ تنظیمیں یا شخصیات یا فورَمز "دعوت" کے لیور lever سے "معاشروں" ایسی بھاری چیز کو ہلا لیتے ہیں**۔ اس کے بغیر البتہ "معاشرے" ہِل کر دینے کے نہیں۔

سو "دعوت" ایک نرسری ہے۔ یہ آپ کا اصل ہے۔ یعنی بنیاد۔ اس کا رنگ ہرگز نہ تو تنظیمی ہونا چاہئے اور نہ مسلکی۔ تنظیمیں اور مسلک وغیرہ یہاں سو فیصد پس منظر میں چلے جائیں۔ یہاں؛ دین کے حقائق خود ہوں جو براہِ راست لوگوں سے مخاطب ہوں (دین کے حقائق جو وقت کی جاہلیت کو چیلنج کریں)۔ دین کے بنیادی ایشوز ہوں جو لوگوں سے بول بول کر بات کر رہے ہوں۔ 'اپنی' طرف آپ کسی بھی حیثیت میں لوگوں کو نہ بلا رہے ہوں۔ (یہاں کسی بھی حیثیت میں خود کو 'نبی' کی جگہ پر رکھنے کا قیاس تباہ کن ہے؛ وہ حیثیت بس نبی کی ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ خاص)۔ دعوت یوں بولے گویا خدا اپنی طرف بلا رہا ہے اور بیچ کے لوگ بولنے کے باوجود بیچ سے غائب۔ یوں گویا ہر آدمی کو براہِ راست خدا ہی کو 'ہاں' یا 'ناں' میں جواب دینا ہے۔ یہاں: جتنا آپ بیچ سے غائب ہوں گے اور "خدا"، "آخرت" اور "رسالت" کو جتنا بولنے دیں گے اتنا ہی اس عمل پر "دعوتی" رنگ آتا چلا جائے گا۔

[براہِ کرم نوٹ کیا جائے یہ بات ہم خاص "اخلاصِ نیت" کے حوالے سے نہیں کر رہے؛ کیونکہ اخلاصِ نیت (خدا کو راضی کرنے کا سچا جذبہ) تو ایک تنظیمی دعوت میں بھی ہو سکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے۔ ہم بات کر رہے ہیں باقاعدہ ایک "منہج" کی کہ خود اسی کے اندر دین بول رہا ہو اور "دین" کے سوا کچھ نہ بول رہا ہو، باقی ہر چیز اس میں پیچھے کر دی گئی ہو۔ دعوت نام ہے اس چیز کا]۔

پس دعوت آپ کی نرسری ہے۔ یہی آپ کی اصل سرمایہ کاری۔ باقی سب کچھ آپ کے 'پراجیکٹ' ہیں، جو متنوع ہو سکتے ہیں۔ 'پراجیکٹس' چلیں گے ایک بالکل الگ محور پر، لیکن اپنی کامیابی کے لیے انحصار اِسی "نرسری" پر کریں گے۔ یہاں اگر جان ہو گی تو ہی آپ کے "پراجیکٹس" میں جان ہو گی، خواہ وہ سیاسی ہوں، خواہ سماجی اور خواہ انتظامی۔ "دعوت" وہ پانی ہے کہ جیسے جیسے اس کی سطح بلند ہو گی، ویسے ویسے آپ کی سب کشتیاں اوپر ہوتی چلی جائیں گی اور جیسے جیسے اس کی سطح نیچی ہو گی ویسے ویسے آپ کی سب کشتیاں زمین سے لگتی چلی جائیں گی، یہاں تک کہ اکثر پر 'تیرنے' اور 'حرکت کرنے' کی نوبت ہی نہ آئے گی اور یہ مسلسل 'حالات' کو کوستی رہیں گی۔ صورتحال اس وقت یہ ہے کہ 'کشتیاں' اب بھی آپ کے پاس کم نہیں لیکن ان میں سے اکثر زمین میں دھنسی پڑی ہیں۔ ان کو اوپر اٹھانے کے لیے آپ کو پانی کی سطح ہی بلند کرنی ہے۔ مراد ہے: دعوت کے اندر ایک بھاری سرمایہ کاری۔

غرض "دعوت" نام ہو گا یہاں تنظیمی اور مسلکی لہجوں سے اوپر اٹھ آنے کا۔ جبکہ سرِدست یہاں اِلاماشاءاللہ دو ہی لہجے پائے جاتے ہیں، تنظیمی یا مسلکی۔ دین کی خدمت کے یہی دو ڈھب modes مانے جارہے ہیں فی الحال! جبکہ اِنہی دو کو پیچھے کرنا "دین" کے سامنے آنے کے حق میں مطلوب ہے۔ تاکہ فی الواقع یہاں "دعوت" پنپ سکے۔ جس سے: ہمارے سبھی پراجیکٹس میں جان پڑے۔ "دین" اور "بے دینی" ہی کے مابین ایک صاف مڈھ بھیڑ ہو؛ اور یہاں کے ایک ایک انسان کو اس میں اپنی پوزیشن طے کیے بغیر چارہ نہ رہے۔ ایسی ایک کیفیت بنانا اپنے سب سیاسی و سماجی منصوبوں میں جان ڈالنے کے لیے ناگزیر ہے۔ گو ہمارے نزدیک یہ آپ اپنی ذات میں مطلوب ہے۔

چنانچہ "دعوت" ہوا اِس پورے عمل کا وہ پیندا جسے آپ کے تمام پراجیکٹس کا بوجھ سنبھالنا ہے۔ "پراجیکٹس" اس پر سہارا کریں گے لیکن ہوں گے ایک الگ تھلگ چیز۔

یہاں سے ہمارا دوسرا پوائنٹ شروع ہوتا ہے۔

اگر کچھ سربر آوردہ شخصیات — خصوصاً کچھ عظیم المرتبت مشائخ نیز کچھ راسخ العقیدہ دانشور — "دعوت" کا عَلَم اٹھا کر میدان میں اتر آتے ہیں... علمی وروحانی وسماجی حوالوں سے یہ یہاں کے عمل پسند نوجوان کو ایک بھرپور چھتری فراہم کر دیتے ہیں، اور پھر دینی طبقوں کو مسلکی خول سے نکال کر زیادہ سے زیادہ اس سماجی دعوتی عمل کی پشت پر لانے کی کوششیں عمل میں آنے لگتی ہیں، نیز یہاں کے خواص اور عوام کو اس کا مخاطب کرنے کے کچھ مؤثر طریقے اور ذرائع اختیار کر لیے جاتے ہیں (اور اِسی کو اِس وقت کے اسلامی تحریکی عمل کی سب سے بڑی ترجیح مان لیا جاتا ہے...

تو یہاں ہم تجویز دیں گے کہ دین سے داعیہ inspiration پانے والے ہمارے سیاسی یا سماجی پروگرام ترکی و مصر کی طرح **کسی خاص اسلامی لیبل کے بغیر بھی** میدان میں اتر لیں۔

بوجوہ، اس وقت اِن دو میدانوں کو خلط کرنا ممکن نہیں۔ پچھلا کچھ عرصہ آپ کے سامنے ہو تو

- "دعوت" کو یہاں کی لامتناہی 'سیاسی رکاوٹیں' ہٹانے کے لیے دورِ حاضر کی فکری اھواء اور اصطلاحات کے ساتھ مسلسل ایک مفاہمت (ریکونسائل reconcile) کرنا پڑا ہے؛ جو "دعوت" کی موت ہے۔

("دعوت" میں آپ کی زندگی اور جاہلیت کی موت اِسی ایک چیز میں مضمر تھی کہ: جاہلیت کے ساتھ آپ ایک بنیادی اختلاف اٹھائیں اور اس کا آہنگ اونچے سے اونچا کر دیں۔ لیکن آپ کی سیاسی مجبوریاں اس اختلاف کو زیادہ سے زیادہ اٹھانے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان سیاسی مجبوریوں کو یکسر نظر انداز کرنا بوجوہ ممکن نہیں ہوتا)۔

- دوسری جانب آپ کی "سیاست" اپنے اعلانیہ 'مذہبی' نعروں، وعدوں اور دعووں

کے باعث جگہ جگہ اپنے راستے تنگ کر لیتی ہے۔ یہ بات "سیاست" میں آپ کی ناکامی کا موجب بنتی چلی گئی ہے۔

نتیجتاً: "دعوت" آپ کی "سیاست" کی بھینٹ چڑھتی رہی۔ اور "سیاست" آپ کی "دعوت" کے متاثرین victims میں رہی ہے۔یوں نہ "دعوت" میں آپ کے یہاں کوئی جان آ پائی اور نہ "سیاست" نے آپ کو کوئی پیش رفت کر کے دی۔ یہ اُس پر قربان کرائی جاتی رہی اور وہ اِس پر؛ نتیجتاً دونوں قربان؛ کوئی ایک بھی چیز ہاتھ میں نہیں۔

اِن دونوں کے لیے الگ الگ جمعیتوں کا میدان میں اترنا نہایت خوب تدبیر ہو گی۔

⟸ "دعوت" کا ٹھیٹ پن [کہ اس میں اپنے دور کی فکری اھواء کے ساتھ ذرہ مفاہمت نہ کی گئی ہو اور اپنے فکری مدِ مقابل (مغرب) کی کسی ایک بھی اصطلاح کو گھاس نہ ڈالی گئی ہو (کم از کم اپنے لوگوں کے لیے درآمد شدہ اصطلاحات کو دُور دُور تک "حوالہ" نہ بننے دیا گیا ہو)] ایک طرف "دعوت" کا یہ ٹھیٹ پن برقرار رکھنا

⟸ اور دوسری جانب عمل اور پیش قدمی میں دستیاب مواقع کو بھرپور طور پر لینا

یہ دونوں باتیں اسی صورت ممکن ہیں کہ:

⌈ "دعوت" کو محض ایک سماجی بیس base بنایا جائے۔ اور ہاں "دعوت" کو تمام 'سیاسی' مجبوریوں سے پاک بھی رکھا جائے؛ تاکہ وہ ہیومن اسٹ شرک اور اس کی تمام مصنوعات کا کھل کر ابطال کرے اور وقت کے شرک کے خلاف ایک برہنہ مزاحمت معاشرے کے اندر برپا کر سکے۔ یہ دراصل معاشرے میں ایک وسیع تر اور دُوررَس گراؤنڈ تیار کرنا ہے۔ "دعوت" کو یہاں کی سیاسی مجبوریوں سے آزاد کرانا یہاں کی نظریاتی و تہذیبی جنگ میں پورا اترنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

⌈ تاہم "سیاست" میں (ترکی و مصری تجربے کی طرح) 'مذہبی' دعوے اور نعرے کے ساتھ اترنے کی بجائے کسی ایسے چہرے face کے ساتھ اتر لیا جائے جسے اپنے آگے بڑھنے کے لیے

یہاں کم سے کم رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے۔[2] ہاں اِس آگے بڑھنے کے دوران جتنی جتنی زمین فی الواقع صاف ہوتی جائے، جتنی جتنی زمین اس قابل ہوتی جائے کہ وہاں شریعت کے تقاضے پورے کرنے کی واقعتاً کچھ سیاسی وسماجی گنجائش بن رہی ہو[یعنی شریعت کے ان اجزاء کا قیام آپ کی اِس سیاسی پیش قدمی میں جہاں رکاوٹ نظر نہ آرہا ہو ("استطاعت" کا یہ ایک باقاعدہ معنیٰ ہے؛ جبکہ شریعت کے سب احکام عمل کے معاملہ میں "استطاعت" سے ہی مشروط ہیں)]... غرض جتنی جتنی زمین (ایک معروضی تجزیے کی روشنی میں) شریعت پر عملدرآمد کے لیے صاف ہوتی جائے اتنی اتنی زمین پر اللہ کی شریعت قائم کرنا فرض ہو گا۔ رہے وہ ایریاز areas جہاں "استطاعت" مفقود ہے وہاں یہ شرعی قاعدہ ہی لاگو رہے گا: لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا "خدا مکلف نہیں کرتا کسی نفس کو سوائے اسی قدر جو اس کی گنجائش ہے"۔ یوں آپ یہاں ایک ایسی سیاسی جماعت کے طور پر آگے بڑھیں گے جو اسلام نافذ کرنے کے کوئی خاص نعرے تو نہیں لگاتی [اسلام کے واحد قانونِ حق ہونے اور اسلام سے متصادم ہر قانون کے باطل اور موجبِ شرک ہونے کا مقدمہ "دعوت" کھل کھلا کر معاشرے میں (الگ سے) پیش کر جو رہی ہو گی؛ لہٰذا اِس (سیاسی جماعت) کے پاس اِس معاملہ میں ایک درجہ خاموشی اختیار کر رکھنے کی گنجائش ہے].. سیاسی محور پر البتہ آپ ایک ایسی جماعت کے طور پر آگے بڑھ رہے ہوں گے جو (پہلے سے) اسلام نافذ کرنے کے کوئی بلند بانگ دعوے تو نہیں کرتی (نفاذِ اسلام کا کوئی لمبا چوڑا ذکر ہی ـــ پہلے سے ـــ نہیں کرتی) اور نہ شاید کسی مخصوص مذہبی گیٹ اَپ کے ساتھ سیاست میں اترتی ہے (تاکہ معاشرے کے زیادہ سے زیادہ طبقوں کو ساتھ چلا سکے؛ کیونکہ معاشرے کے زیادہ سے زیادہ

[2] یہاں ایک ممکنہ اعتراض کے حوالہ سے، ہماری دوبارہ درخواست ہو گی، شیخ ابراہیم السکران کا یہ مضمون دیکھ لیا جائے: "غیر شرعی نظام کو بنانے اور اسکے اندر شرکت کرنے میں فرق ہے" (ایقاظ اپریل 2014)۔ اس کے علاوہ ہمارے وہ دیگر مضامین جن کا ہمارے پچھلے حاشیہ میں ذکر ہوا ہے۔

طبقوں کو ساتھ چلا پانا ہی فی الوقت یہاں قوت کے سوتوں کو ہاتھ میں کرنا ہے؛ اور قوت کو ہاتھ میں کیے بغیر چارہ نہیں)، البتہ جہاں جہاں اسے شرعِ خداوندی کے تقاضے پورے کرنے کا موقع (سسٹم کے اندر) ملتا جاتا ہے وہاں وہاں یہ شرعِ خداوندی کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی کمی بھی نہیں کرتی۔ (ترکی کا حالیہ عمل کسی حد تک اس کی ایک مثال)۔ یوں یہ "گرجے" بغیر جہاں جہاں "برس" سکتی ہے "برستی" چلی جاتی ہے۔

غرض معاملے کی تصویر یوں بنی کہ:

- "شریعت" کا کیس نظریاتی وسماجی سطح پر "دعوت" لڑے گی، اس شدت کے ساتھ کہ آخر وہ پورے معاشرے کو "شریعت پر ایمان" یا "شریعت سے اِعراض" کی بنیاد پر بانٹ کر رکھ دے (جو کہ کوئی چند دن کے اندر انجام پا جانے والا عمل نہیں)، گو ہوگا یہ کام ایک دعوتی میدان میں (نہ کہ سیاسی میدان میں)۔ اور اس کے اپنے رجال ہوں گے۔
- جبکہ "شریعت" کا راستہ عملی میدان میں آپ کی (دین سے داعیہ inspiration پانے والی) سیاسی جماعتیں / شخصیات حسبِ استطاعت بنا رہی ہوں گی۔ نیز آپ کے وہ رجال اور فورَم جو 'مذہبی' نعرے لگائے بغیر، یہاں مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی پیشہ ورانہ اہلیت و دیانت سے کام لیتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے اور اوپر جانے کی کوشش کریں گے۔ ان سب کی پیش رفتیں acheivements مل کر یہاں "عمل" کے میدان میں دین کے لیے راستہ بنائیں گی۔

رول roles بانٹنے کی یہ گنجائش یقیناً شریعت میں ہے۔

یہاں سے:

- آپ کے عقیدے میں جو قوتِ تسخیر ہے اور جو کہ اپنے دور کے شرک کے ساتھ ایک کھلا ٹکراؤ کر کے ہی اپنا پوٹینشل دکھاتی ہے...

آپ کے عقیدے کی یہ قوتِ تسخیر بھی میدان میں آگئی۔

≥ اور آپ کے آگے بڑھنے کے راستے بھی کھلے رہے، جو کہ پہلے سے 'مذہبی' نعرے لگانے کی صورت میں بڑی حد تک آپ پر بند ہو جاتے ہیں۔ نیز آپ کے وقتی مصالح بھی معطل نہ ہوئے۔

یہ مجوزہ تقسیمِ کار اِس فقہی بنیاد پر ہے کہ دعوت (اپنی تمام تر اہمیت کے علی الرغم) ہے ایک فرضِ کفایہ۔ جبکہ سیاسی یا معاشی یا انتظامی شعبوں میں مسلمانوں کو ایک ممکنہ پیش رفت کر کے دینا بھی ایک فرضِ کفایہ۔ (فرضِ کفایہ: یعنی مسلمانوں کی ایک تعداد وہ کام انجام دے لے تو باقیوں کی جانب سے وہ ادا متصور ہو گا۔ ہاں اگر کوئی بھی انجام نہ دے تو وہ سب کا بوجھ ہو گا)۔ اسلام میں فروضِ کفایہ کا تصور صلاحیتوں اور مواقع کے تنوع کو کام میں لانے کی ایک بہترین وخوبصورت ترین بنیاد فراہم کرتا ہے۔

پیش رفت کے لیے: 'سیاست' واحد میدان نہیں "شعبہ ہائے حیات میں جڑیں بنانے" کا عمل فی الوقت اس سے بھی اہم تر ہے

اسلام کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ نفوذ اور تاثیر دلوانے کے لیے "سیاست" فی الوقت کوئی واحد میدان نہیں۔ یوں بھی اگر کسی کا خیال "مکمل باگ ڈور" حاصل کرنے کا ہے (یعنی انقلاب) تو وہ تو حالیہ سیاست میں بھی ایک غیر معینہ مدت تک آپ کے ہاتھ آنے کا نہیں۔ فرض کیا آپ ایک اچھی سیاسی کارکردگی دکھا لیتے ہیں (جو کہ آسان نہیں)، حتیٰ کہ کسی وقت اقتدار تک جا پہنچتے ہیں، تو بھی "مکمل باگ ڈور" والی بات اِس تمام کوچے میں نہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ یہ وجہ ہے، بہت سے ملکوں میں سیاسی میدان میں اترنے والی دینی جماعتیں "انقلاب" کی بجائے "اصلاح بقدر استطاعت" والی اپروچ ہی

اختیار کر چکی ہیں، جس سے کچھ پیش رفت بھی وہاں پر ممکن ہوئی ہے۔ اب اگر آپ کے یہاں 'انقلاب' کی بجائے "اصلاح بقدرِ استطاعت" اپروچ اختیار کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، (جس کے سوا چارہ ہی نہیں۔ خود شریعت کا اقتضاء یہی ہے، جیسا کہ ہم ایک علیحدہ مضمون میں واضح کر چکے)... تو جاننا چاہئے کہ "اصلاح بقدرِ استطاعت" کا واحد ذریعہ یہاں "سیاسی جدوجہد" نہیں ہے۔ "سیاسی جدوجہد" ضرور کیجئے، مگر باقی میدانوں کو نظرانداز مت کیجئے، خصوصاً اگر سیاسی میدان میں کوئی بہت اچھی پیش رفت فی الحال ہو کر بھی نہیں دے رہی، اور خصوصاً جبکہ وہ (دوسرے میدان) "سیاست" سے بھی بڑھ کر اہم ہوں، پھر خاص طور پر اگر خود آپ کی "سیاست" ہی اِس بات پر انحصار کر رہی ہو کہ پہلے اُن دوسرے میدانوں میں آپ نے ایک اچھی کارکردگی کر لی ہو۔

دین پر گہرا ایمان رکھنے والوں کا زندگی کے اہم اہم شعبوں میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنا؛ یہاں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا؛ اور اِس طریقے سے معاشرے پر اثرانداز ہونے کی پوزیشنوں تک پہنچنا بسا اوقات "سیاسی جدوجہد" سے بھی زیادہ ثمربار ثابت ہوتا ہے۔

ہمیں یاد ہے، مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی نے صرف تعلیم کے شعبے کو ہاتھ ڈالا تھا اور یہاں ایک غیر معمولی بھرتی کر کے دماغوں کو اپنے ہاتھ میں کر لینے کا حیرت انگیز کارنامہ کر دکھایا تھا۔ یہاں تک کہ اتھارٹیز مکتی باہنی کے کام کے نتائج دیکھتی اور بے بسی سے ہاتھ ملتی رہ گئیں، اور وہ اپنا مقصد حاصل کر کے چلتی بنی۔ ظاہر ہے وہ ایک تخریب کار تحریک تھی۔ کیا ہم تعمیری کام کے لیے (معاشرے کو اسلام کی پٹڑی پر چڑھانے کے لیے) ان شعبوں کے اندر نہیں اتر سکتے؟ تعلیم صرف ایک شعبہ ہے، جسے ہم نے بطورِ مثال ذکر کیا۔ اور بے شمار شعبے ہیں جو صالحین کے منتظر ہیں۔ اس وقت حال یہ ہے کہ کالجوں یونیورسٹیوں میں طلبہ کو صحیح معنوں میں متاثر کرنے والے پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے لیس اساتذہ، جو دین کی روشنی بھی رکھتے ہوں، کم ہی کہیں پائے جاتے ہیں۔ آخر کس نے روکا ہے کہ ہم یہاں ایسے

اساتذہ کی ایک بھاری کھیپ مہیا نہ کر دیں اور دماغوں تک اپنا راستہ نہ بنا لیں؛ جس سے تھوڑی دیر میں پورا معاشرہ روشن ہو جائے؟ تعلیم کے علاوہ بے شمار شعبے ہیں جن میں صالحین کا اوپر کی پوزیشنوں تک جا پہنچنا اچھی خاصی معاشرے کی کایا پلٹ سکتا ہے۔

ہمارے علم کے مطابق ترکی میں اِس (شعبہ جاتی) میدان کے اندر اسلامی پیش رفت بہت پہلے شروع ہوئی تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہی عمل آخر "سیاسی پیش رفت" میں بھی اپنے ثمرات دکھانے لگا۔ اِس لحاظ سے یہ سب پراجیکٹ ایک دوسرے کے متبادل نہیں بلکہ ایک دوسرے کو مکمل کرنے اور ایک دوسرے کا سہارا بننے والے ہیں۔

[یہ چیز (یعنی شعبہ ہائے حیات میں اپنی جڑیں گہری کرنا اور اوپر کی پوزیشنوں تک پہنچنا) ہمارا دینی سیکٹر اِس میں کس قدر پیچھے ہے، اور صورتحال ہماری پستی اور لتھارجی کا کیسا بر ا رونا رو رہی ہے، اس کا کچھ بیان ہمارے ایک اداریہ "فاعلیت کا فقدان" (ایقاظ جولائی 2015) میں ہوا ہے؛ یہاں ہم اس کی مزید تفصیل میں نہیں جائیں گے]۔

یہاں ایک بات ہم ذکر کرنا چاہیں گے۔ براہِ کرم اسے خصوصی طور پر نوٹ فرمایا جائے: گو باقی میدان بھی اپنی کامیابی کے لیے "دعوت" کے مرکزی عمل پر غیر معمولی انحصار کریں گے مگر یہ (شعبہ ہائے حیات میں اپنی جڑیں گہری کرنا) وہ خاص میدان ہے جو کلیتاً یہاں "دعوت" کے سرگرم ہونے پر انحصار کرے گا۔ کسی کا اگر خیال ہو کہ یہ 'تنظیمی' اسٹائل میں کرنے کا ایک کام ہے تو وہ بہت بڑی غلط فہمی میں ہے۔ کم از کم یہ وہ میدان نہیں جس میں آپ تنظیمی سیٹ اپ کے ساتھ آگے بڑھ لیں گے۔ تنظیمی فارمیٹ کے ساتھ، بوجوہ آپ یہاں ناکام ہوں گے۔ یونینز unions وغیرہ کا تجربہ کئی شعبوں میں شاید آپ کر ہی چکے۔ ہم اِسے جس طرح دیکھتے ہیں، یہ خالصتاً ایک نامیاتی organic عمل ہے۔ اسے آپ کو صرف بیج اور پانی دینا ہے اور اس کا باقی کنٹرول اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی۔ ظاہر ہے یہ ایک دعوتی اپروچ کو میدان میں لانے سے ہی ہو سکتا ہے۔

"دعوت" کو سامنے لانے کا طریقہ یہ ہو گا کہ :

✧ وقت کی جاہلیت کے ساتھ ایک بنیادی "اختلاف" سامنے لایا جائے۔ (اس کے لیے الگ سے آپ کو ایک ڈسکورس discourse لے کر آنا ہو گا)۔ اسی "اختلاف" کو زیادہ سے زیادہ اٹھایا جائے۔ (تبلیغی جماعت کی مساعی کو بے شک ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن یہاں پر مطلوب "دعوت" میں اس کو شمار نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اس میں اپنے زمانے کے شرک کے ساتھ معارضت conflict with the shirk of your times تقریباً مفقود ہے)۔ اپنے زمانے کی جاہلیت کے تعلق reference سے ہی پھر آپ یہاں دینِ حق کا بیان کریں گے اور اسی کو "ایمان" کی بنیاد ٹھہرائیں گے۔ اس سارے عمل کا عنوان "خدا" اور "آخرت" ہو گا۔ اور اس کا فریم "رسالت"۔[3] (رسولؐ کا ہمارے اِس معاشرے، اِن گلیوں، اِن محلوں اور اِن بستیوں میں جو ایک رول role اور سٹیٹس status خدا کی جانب سے مقرر ہے، اس کو "ایمان" کی بنیاد بنانا ہو گا)۔ "دعوت" کا کُل موضوع یہاں "ایمان" ہی ہو گا اور "ایمان" کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ اِس بنیاد پر معاشرے

---

[3] "رسالت" کو ایمان اور عمل کا محور بنانا اِس وقت خاص طور پر ضروری ہو گیا ہے۔ یعنی

⟸ اسلام (رسالتِ محمدی) کا واحد حق ہونا، اور اس کے سوا ہر دین، ہر طرزِ حیات کا باطل اور موجب جہنم ہونا،

⟸ عمل کی روحِ رواں اتباعِ شرعِ محمد ﷺ نہ ہو تو خواہ وہ عمل سونے چاندی کا کیوں نہ ہو نرا مردود اور موجبِ ہلاکت ہے

چونکہ مقابلے پر ہیومن اسٹ ڈسکورس ہے، لہٰذا اس عقیدہ کا احیاء اسلامی سیکٹر کو ایک زندگی دے جائے گا اگر بروقت اِس کے سُر چھیڑ دیے گئے۔ ان شاءاللہ۔ رسالت پر ایمان کی اِس جہت پر اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے ہماری ایک مختصر تحریر "ہیومن ازم اپنی برہنہ صورت میں"۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک پمفلٹ: فتنۂ ہیومن ازم۔

میں ایک "کردار رکھنے" کو ایمان باللہ اور اخروی جوابدہی کا مسئلہ بنایا جائے گا۔ اور "ایمان" کی یہ یاددہانی ہی صبح شام تذکیر کا موضوع۔

- مسجدوں اور محرابوں کو "ایمان و کفر" کے اِس نزاع کی پشت پر لانا ہو گا۔ یہاں کوئی خطبہ، کوئی جمعہ، کوئی درس اور کوئی بیان ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں "ایمان" کا وہ تقاضا بیان ہونے سے رہ جائے جس کا نام "فرد کا معاشرتی کردار" ہے۔ خصوصاً
  - فرد کا معاشرتی کردار اُس جاہلیت کے مقابلے پر جو اس کے نبیؐ اور اس کے دین کے ساتھ ایک بنیادی و محوری نزاع رکھتی ہے۔ اِس نزاع کے اندر اِس کو اپنے نبی کے ساتھ کھڑا ہونا اور اُس کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کر کے اُس کی شفاعت کا استحقاق پانا ہے۔ یہاں سے؛ ہر ہر فرد کو "اسلام کے ماسوا" سے بیزار کرانا دعوت کا ایک مرکزی موضوع ہو گا۔
  - نیز فرد کا معاشرتی کردار اُس حق کو لے کر کھڑا ہونے میں جس کے ساتھ اس کا نبیؐ دنیا میں مبعوث ہوا ہے.. اپنے گھر میں، اپنے دفتر میں، اپنے شعبے میں، اپنے حلقۂ اثر میں، اور اپنے اِس جہان میں، وغیرہ۔ اپنی اِن سب حیثیتوں میں (اور ان میں سے ایک ایک دائرے کے اندر) اس نے دینِ محمدؐ کے حق میں کس قدر گواہی دی اور اس کو کیونکر نصرت اور تقویت دی؟[4] اِس سوال کو "فرد" کے تصور ہی کا حصہ بنا دینا

---

[4] اِس "نصرت" کو کسی ایک شکل میں محصور کر دینا البتہ سنگین غلطی ہو گی۔ (مثلاً ہر کسی کو ایک ہی mode دینا کہ تمہیں لازماً کسی تنظیم میں جانا ہو گا اور اس کے علاوہ نصرتِ دین کی کوئی صورت نہیں! یہ چیز معاشرے میں دینِ محمدؐ کی نصرت و تقویت کے عمل کو شدید مشکل، محدود اور جامد کر دینے کا باعث ہو گی)۔ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ دعوت تو دینِ محمدؐ کی نصرت ہی کو (ایک مطلق انداز میں) "ایمان" کا موضوع بنا کر رکھے۔ ہاں "فرد" جب دینِ محمدؐ کی نصرت پر اصولاً آمادہ ہو جائے، تو اسے صرف اس بات کی تلقین ہونی چاہئے کہ وہ اپنی پہنچ کے اہل علم سے رجوع کرے اور مسلسل ان کی

دعوت کا ایک محوری موضوع ہو گا۔

{ اِسی بات کو ہم "اسلامِ مجمل" سے وابستگی بھی کہتے ہیں۔ دعوت میں اِس وقت یہیں تک رہنا ضروری ہے۔

دعوت کے اندر فی الوقت "اسلامِ مجمل" سے آگے بڑھنا، یعنی

۱) ان موضوعات میں جا اترنا جن کے اندر اہل سنت طبقوں کا کچھ اختلاف ہوا ہے،

۲) یا اصطلاحات و تعبیرات کی کسی ایسی صورت میں الجھنا جہاں اہل سنت طبقے تعبیر کا ایک تنوع رکھتے ہیں جبکہ مفہوم میں سب ایک بات پر متفق و یکجہت ہیں،

۳) یا ایسے دقیق مسائل چھیڑ لینا جو اسلام کے بنیادی مسائل میں نہیں آتے، اگرچہ وہ اسلام ہی کے مسائل کیوں نہ ہوں۔ یا کچھ ایسے اعمال کی صدا لگانا جو اسلام کے بنیادی فرائض میں نہیں آتے، اگرچہ وہ اسلام ہی کے اعمال کیوں نہ ہوں)..

"اسلامِ مجمل" سے آگے بڑھنا دعوت کے اندر کبھی بھی درست نہیں، مگر اندریں حالات تو یہ مہلک ہو گا۔ ("اسلامِ مجمل" سے آگے کی جتنی بات ہو گی وہ "تعلیم" میں ہو گی نہ کہ "دعوت" میں؛ ہاں تعلیم مختلف لوگوں کے لیے مختلف سطحوں کی ہو گی مگر دعوت عام ہو گی اور نہایت سادہ و غیر پیچیدہ رکھی جائے گی)۔ یہ بات اسلامی تحریک کی

ہدایت و تربیت میں رہے جو اُس کے احوال کے مطابق، نیز معاشرے کی ضرورتوں کی رعایت سے، اُسے دین کے فرائضِ شخصی و اجتماعی پر کاربند ہونے میں مدد دیں گے (جس میں اُس فرد سے متعلقہ نصرتِ دین کی صورتیں اور اس کے ممکنہ میدان خودبخود آجائیں گے) نیز وقت گزرنے کے ساتھ وہ اس کے فرائض اور عمل کے ممکنہ میدانوں میں ضروری تبدیلیاں developments بھی تجویز کر دیا کریں۔ نیز بعض لوگوں کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور ذمہ دار رویّوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اِس لائق بھی قرار دیں کہ اپنے تدبیری فیصلے وہ خود کرے اور اہلِ علم سے صرف علمی و فقہی راہنمائی لے۔

قوت کا ایک بڑا راز ہے؛ اگر اس کو سمجھ لیا جائے۔ اِسی بات کو ہمارے شیخ سفر الحوالی اور صلاح الصاوی یوں بیان کرتے ہیں: معاشرے کے ایک عام آدمی کو اِس وقت آمادہ کیا جائے گا صرف

١) "ماسوائے اسلام" سے ایک مجمل براءت کردینے پر۔ خواہ اُس "ماسوائے اسلام" کی تفصیلات میں وہ بہت جگہوں پر غلط ہی کیوں نہ ہو۔ کم از کم بھی یہ ہو گا کہ وہ چیز جو اس کے علم میں "ماسوائے اسلام" (یعنی اسلام سے متصادم) ہے وہ اس سے بری و بیزار ہونے میں ایک نہایت دوٹوک زوردار لہجہ دکھائے۔ یہ بھی اس کے لیے بہت ہے۔ اس سے بھی؛ اسلامی سیکٹر کو معاشرے میں جو قوت ملتی ہے وہ اندازے سے باہر ہے؛ اور فی الوقت غنیمت۔

٢) اور "اسلام" سے ایک مجمل وابستگی رکھنے پر۔ خواہ اس کی تفصیلات میں وہ کئی جگہوں پر غلط ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جو چیز اسے معلوم ہے کہ یہ اسلام ہے، اس کے لیے تمسک، جذبہ اور غیرت رکھنے میں وہ ایک شدید ترین لہجہ لے کر آئے۔ یہ بھی فی الوقت اس کے لیے بہت ہے۔ اس سے بھی؛ اسلامی سیکٹر کو معاشرے میں جو قوت ملتی ہے وہ اندازے سے باہر ہے؛ اور فی الوقت غنیمت۔

[ہاں ایک الگ محور پر، معاشرے کے اندر جاری کرایا جانے والا "تعلیمی عمل" اس "ماسوائے اسلام" کی بھی توضیح کرتا چلا جائے گا اور "اسلام" کی تفصیلات بھی لوگوں کے ذہن نشین کراتا جائے گا۔ (تعلیمی عمل ہر فرد کے لیے اس کی سطح کے مطابق)۔ لیکن وہ ایک لانگ ٹرم پروگرام ہے۔ اس کے سرے لگنے کی جلدی نہ کی جائے گی۔ نیز اس کے فی الحال سرے نہ لگ پانے کا اعتبار بھی کیا جائے گا اور

معاشرے کے 'عام آدمی' کو اس کا فائدہ اور چھوٹ بھی دی جائے گی؛ اور اس پر صبر و حوصلہ سے بھی کام لیا جائے گا]۔

دعوت میں ''اسلامِ مجمل'' کو بنیاد بنانا شاید ہم الگ سے بھی کسی مضمون میں واضح کر سکیں۔

گویا ''ماسوائے اسلام سے شدید ترین بیزاری'' اور ''اسلام سے شدید درجے کی وابستگی'' ایک فریم کے طور پر آپ کو دعوت تیار کر کے دے گی (عوامی سطح پر)؛ اور اس پر تو پورا زور صرف کر دیا جائے گا۔ البتہ اِس فریم کی بھرتی (کہ ''ماسوائے اسلام'' مفصل طور پر ہے کیا اور ''اسلام'' یعنی خدا کی اطاعت مفصل طور پر ہے کیا) آپ کا تعلیمی عمل کرے گا [جس کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہی عوامی سطح پر فی الحال انجام دیا جائے گا؛ البتہ اس کا ایک بڑا حصہ مقتدر طبقوں کو اپنا طرفدار بنانے کے بعد ہی انجام پا سکے گا، اس سے پہلے نہ یہ ممکن ہے (خواہ آپ جو مرضی کر لیں) اور نہ اس کے لیے فی الحال پریشان ہونا ضروری]۔ فی الحال پریشان ہوں تو

أ. صرف دعوت کے لیے (جس کا دائرہ، امید ہے، اب واضح ہو گیا ہو گا کہ وہ کوئی ایسا ناقابلِ تحصیل unacheivable نہیں)۔

ب. نیز ضروری تعلیم کے لیے۔

بس اِسی چیز سے آپ کو ان شاء اللہ وہ ''سماجی مومنٹم'' مل جائے گا جو یہاں کے ایک ہزار مسئلے کا حل ہے: ''سیاست'' کے اندر بھی اور ''شعبہ ہائے حیات'' کے اندر بھی۔ آپ کی کشتیاں یہاں ایک بار اوپر اٹھ گئیں تو پھر دیکھئے 'راستے' آپ کے سامنے قطار اندر قطار کیسے آتے ہیں۔ ان شاءاللہ وبفضلہٖ تعالیٰ۔ البتہ پانیوں کی سطح اوپر لائے بغیر 'راستوں' کی لکیریں کھینچنا اور 'منہج' کے زائچے بنا بنا دینا ایک غیر نتیجہ خیز کام ہے اور ایک درجہ میں مایوس کن۔

⟩ ترتیب اِس عمل کی یہ ہو گی کہ:

⟩ معاشرے کی کچھ بھاری بھرکم شخصیات (علماء، مشائخ، دانشور، سیاستدان، بیوروکریٹ، سماجی اثرورسوخ کی مالک شخصیات جو صاف ستھرے کردار کی مالک ہوں) اپنے پورے ایک کیس case کے ساتھ میدان میں آئیں گی۔ (کوئی ایک سربر آوردہ شخصیت ہو تو بھی کافی ہے)۔ اس کا کیس بہت سادہ ہو گا۔ اسلامِ مجمل:

۱) ماسوائے اسلام سے صاف بیزاری۔ ماسوائے اسلام کا وہ موٹا موٹا بیان جو یہاں کی اکثریت اپنے حق میں متعلقہ relevant and substantial جانے۔ اپنے زمانے کے شرک پر فوکس۔ بچے بچے کو اس سے بیزار کروا دینے کی ایک دلنشیں دعوت۔ اِس (ماسوائے اسلام سے بیزاری) کو ہی نبیؐ سے وابستگی کا عنوان بنا کر رکھنا۔

۲) اسلام کے مطلق حق ہونے (اور دنیا میں واحد حق ہونے) کی شہادت۔ ساتھ میں اسلام کے کچھ بنیادی مطالب اور اساسی فرائض کا ایک سادہ و آسان بیان۔ اسلام کو واحد حق جانتے ہوئے؛ اس سے بطورِ عقیدہ، بطورِ شریعت و دستور اور بطورِ تہذیب و بطورِ سماج وابستہ ہو رہنے کی دعوت۔ اس کے کچھ موٹے موٹے تقاضے سامنے لانا۔ اور اسی کو نجات کا موضوع بنا کر رکھنا۔

۳) یہاں ایک ایک فرد کو دین پر قائم ایک معاشرتی کردار ادا کرنے پر کھڑا کرنا۔ نصرتِ دین کے اِس فریضہ کی صبح شام آوازیں۔ [اِس (دین پر قائم ایک معاشرتی کردار) کی عملی صورت گو ہر شخص اپنے حق میں اہل علم سے جُڑ کر معلوم کرے گا]۔

٤) مکارمِ کی منادی۔ اعلیٰ رویّوں کا احیاء مانند: صلہ رحمی، خاندان اور رشتوں کی حرمت، بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، مظلوم کی فریادرسی، ظالم کو ٹوکنا، ظلم و

سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا، محروموں کی دادگیری بلا تفریق رنگ و مذہب۔ گلی گلی، محلہ محلہ، شہر شہر۔ غرض مسلمان کو مکارم کا باقاعدہ عَلَم اٹھوانا۔ اس بات کو 'فلسفوں' کی بجائے "روزمرہ اعمال و معمولات" کا حصہ بنانا اور مساجد کو اس عمل کے باقاعدہ محاذ بنا دینا۔

۵) مسلم وحدت (جماعۃ المسلمین / اجتماعِ کلمہ / شیرازہ بندی)، الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ کا خصوصی بیان۔ فقہ الجماعۃ کا اِحیاء۔ رنگوں، نسلوں، قبیلوں، مسلکوں، تنظیموں، پارٹیوں اور قومیتوں کا اپنی اپنی جگہ درست ہونے کے باوجود، اپنے ایک صحیح سیاق perspective میں لایا اور ایک بڑی وحدت (جماعتِ اسلام) کے اندر پرویا جانا اور ان تمام جہتوں سے فرقہ واریت کے خاتمہ کو عقیدہ کا مسئلہ بنانا۔

٦) برسراقتدار طبقوں کے ساتھ صبر صبر اور صبر، قطع نظر اس سے کہ فی الوقت وہ کس 'نظام' پر ہیں۔ نہایت دلنشیں پیرائے اختیار کرکے ان کو اسلام پر کھڑا کرنے، ان میں اسلام کے مددگار تلاش کرنے اور ان کے اندر دینِ محمدؐ سے وفا کی جوت جگانے کی ایسی حوصلہ مند تحریک اٹھانا جو اِس باب میں کبھی ہمت نہ ہارے۔ باہر کے کافر اور اندر کے ففتھ کالمسٹ کے مقابلے پر جہاں اور جس صورت ممکن ہو ان کے ساتھ کھڑے ہونا۔ اور اگر ان کی جانب سے آپ پر زیادتی ہو تو صبر۔ قومی مفاد کو امانت کے طور پر لوگوں کے ذہن نشین کروانا۔

{ ان کے کیس کا ایک بڑا حصہ: اپنے دور کی جاہلیت کا اِبطال۔ معاصر جاہلیت کے کچھ مرکزی مضامین اور کچھ موٹے موٹے مظاہر کی نشاندہی۔ اور ان کو مٹا ڈالنے کی ایک غیر مبہم دعوت۔ خصوصاً شرک کا رد۔ اور اس کے خلاف ایک معاشرتی محاذ اٹھانے کی تلقین۔ نیز ایمان کے کچھ نمایاں مطالب اور فرائض کا ایک موٹا اور سادہ

بیان۔ کفر اور نفاق کے مقابلے پر ایمانی بلاک کی تشکیل؛ عالمی سطح پر بھی، علاقائی سطح پر بھی، ملکی سطح پر بھی، اور ضرورت پڑے تو شہر و محلے کی سطح پر بھی۔ یہ کیس بھی بڑا ہے۔ اکثر مقامات پر اس کا کوئی ایک آدھ نکتہ بھی کفایت کرے گا، جس کا انتخاب موقع مناسبت کی رعایت سے ہو گا۔

{ **ملکی سطح پر دعوت کا بیڑا اٹھانے والی یہ شخصیات**

۱) **ملک کی تمام سربرآوردہ شخصیات** کو **فرداً فرداً** اپنی دعوت پہنچائیں گی۔ ایک ایک سربرآوردہ شخصیت کے پاس بیس بیس بار جائیں گی۔ اور ان کے آگے اپنے کیس کا اعادہ کرتے چلے جانے سے ہرگز بوریت محسوس نہ کریں گی۔

۲) **معاشرے** سے ایک زوردار **عمومی خطاب** سامنے لائیں گی اور اس کا آہنگ برابر اونچا کرتی چلی جائیں گی۔

۳) اسلام سے متصادم نظریات کی داعی **شخصیات** کو **دلیل کے میدان میں کھلا چیلنج** دیں اور ہر ہر جگہ ان کا سامنا کریں گی۔ دلیل و بیان کی قوت سے ان کا راستہ آخری درجے تک تنگ کر ڈالیں گی۔ حجت اور برہان کا پورا ایک معرکہ اسلام کو جیت کر دیں گی۔ یہاں کے پڑھے لکھے ذہنوں پر دین کی دھاک بٹھانے کے لیے باقاعدہ ایک ڈسکورس سامنے لائیں گی (جسے ہمارے بعض اصحاب 'ماڈرن علم الکلام' بھی کہتے ہیں؛ اور جو کہ فی الحال یہاں کے پڑھے لکھوں کو کسی باقاعدہ انداز میں دستیاب نہیں ہے)۔ پھر اس کو لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے طویل اور مختصر دورانیوں کے کورسز آفر کریں گی۔ ہر شہر میں اس کا تانتا باندھ دیا جائے گا۔ ہر مسجد "اپنے زمانے کی جاہلیت کے رَدّ" پر کورسز آفر کر رہی ہو گی۔ یہ شخصیات مادرہائے علمی کے اندر جا اتریں گی اور وہاں ایک صحتمند مباحثے debate کی طرح ڈالیں گی؛ جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا

پانی لوگوں کے سامنے آتا چلا جائے۔ شہر شہر تعلیم یافتہ عقول پر اپنے کیس کی حقانیت عیاں کرنے کے وسیع و عریض بندوبست کریں گی اور اپنے مخالف کا فکری اِفلاس اور تہذیبی دیوالیہ اس طرح طشت از بام کریں گی کہ لوگ خود دیکھیں یہ نرا کوئی دعویٰ یا بڑھک نہیں بلکہ سامنے کی ایک حقیقت ہے۔ غرض ایک نظریاتی یلغار جس کے مدمقابل کوئی نظریہ کھڑا نظر نہ آتا ہو۔ دھونس کرے تو فریقِ مخالف؛ یہ البتہ دلیل اور حجت سے سرِ مُو تجاوز نہ کرے۔

٤) **عوامی داعیوں کی بڑی بڑی کھیپیں** نکالیں گی (بھاری محنت کا کام)۔ جو ایک ایک گلی ایک ایک محلے تک پہنچیں۔ ایک ایک کلاس روم میں بولیں۔ ہر ہر فورَم پر پہنچیں۔ دور دراز علاقوں تک جا ڈیرے لگائیں۔ ہر اہم مقام، ہر اہم موقع پر، نیز ادب، تخلیق اور پروڈکشن کے ہر ہر رنگ ہر ہر اسلوب میں قوم انہیں اپنے سے مخاطب پائے اور یہ مسلسل لوگوں پر خدا کی حجت قائم کریں۔ چند سال یوں گزریں جیسے کسان بیج کی جھولی اٹھائے کھیت میں 'چھَٹہ' دیتا چلا جاتا ہے۔ اس کے سوا کسی بات کی جلدی نہ کریں۔

٥) **ان سے وابستہ ہوتے چلے جانے والے لوگ** قوم کی نظریاتی و سماجی کایاپلٹ کا یہ پروگرام لے کر 'ون ٹو ون' اپروچ مشن پر نکل کھڑے ہوں۔ یہاں کے ایک ایک پروفیسر، ایک ایک خطیب، ایک ایک صحافی، ایک ایک ادیب، **ذہن سازی opinion making کے مقام پر فائز ایک ایک شخص کا دروازہ کھٹکھٹائیں** اور اسے قوم کو اسلام کی شاہراہ پر لے آنے کے اِس مشن میں شامل ہو جانے پر آمادہ کریں گے۔ چونکہ یہ عمل معاشرے میں دینداروں کا ایک "کیس" ثابت کرنے اور لوگوں کو محض اُس "کیس" کا ہمنوا بنانے سے عبارت ہوگا نہ کہ کسی تنظیم کی اطاعت میں آنے کی دعوت، لہٰذا اِس میں پس و پیش

کرنا وہ اپنے نفوس میں نسبتاً مشکل پائیں گے۔ یعنی ایک چیز آپ کے لیے مانگنا کہیں آسان اور ان کے لیے اس سے نکرنا کہیں مشکل۔

٦) خطباء کی ایک تھوڑی تعداد بھی اگر اصلاحِ احوال کے اِس پروگرام کا حصہ بننے پر آمادہ ہو جائے (درمندانِ قوم کو ایک ایک خطیب کے دروازے پر جا کھڑا ہونا ہو گا اور قوم کی پتا کہہ کر اُسے اصلاح کا عَلَم اٹھانے پر بار بار آمادہ کرنا ہو گا)[5].. تو **مسجدیں یہاں جاہلیت کا ابطال** کرتی نظر آئیں گی، معاصر شرک کے رد، اسلام کے بنیادی مطالب کی تلقین اور اسلام کے بنیادی فرائض کی تعلیم کا گڑھ بنیں گی۔ ذہن سازی کے دیگر میدانوں کے رجال بھی ایک تعداد میں اگر اصلاح کا یہ علم اٹھا لیتے ہیں تو یہاں کی **مادرہائے علمی سے لے کر ثقافتی مراکز تک "دین" اور "بے دینی" کا ڈائلیکٹ** خود بخود سامنے آنے لگے گا۔ مخالفت ملنے کا مطلب یہ ہو گا کہ کامیابی کا آغاز ہو چکا؛ اب ایک طویل عرصے تک اس عمل کی شدت میں ہی اضافہ کرنا ہو گا۔

٧) دعوت کی ایک زوردار اشاعت کے نتیجے میں جو جو طبقے اسلام کی صدا پر لبیک

---

5 یہاں ہماری تجویز ہو گی کہ "حق گوئی" کی نصرت و اعانت کے لیے، کچھ دردمندانِ قوم یہاں ایک فنڈ ایسا قائم کریں کہ معاشرے میں جو بھی خطیب یا عالم یا مفتی یا مصلح اپنی حق گوئی کے باعث 'جاب لیس' jobless کر دیا جائے (جس کا جگہ جگہ امکان ہے)، یا کسی اور پریشانی کا سامنا کرے، اُسے اُس پریشانی سے نکل آنے تک ایک معقول مالی تعاون فراہم ہو۔ یا کم از کم ایسا سیٹ اپ جو علاقہ کے اصحابِ خیر کو اِس جانب توجہ دلانا اور اس کی اعانت کو یقینی بنوانا اپنی ذمہ داری جانے۔ نیز کوئی نیٹ ورک جو ایسے ہیروں کو بہتر سے بہتر متبادل جگہوں پر کھپانے کا انتظام کرے۔

غرض دعوت کی خدمت میں علم والے اپنا علم لے آئیں اور مال والے اپنا مال۔ اور انتظامی صلاحیتوں والے اپنی یہ صلاحیت۔

کہنے والے سامنے آتے جائیں، ان کو **"تعلیم" کے ایک مختصر پراسیس** سے گزارنے کا بندوبست سامنے لانا ہوگا؛ جس کا اصل مرکز مساجد ہوں۔ ساتھ میں ایمانی ماحول کی فراہمی جو "تعلیم" کو خودبخود "تربیت" میں ڈھالتی اور "نظریے" کو خودبخود "روحانیت" دھارتی جائے۔ یہاں خیال رکھنا ہوگا، "اعمالِ دین" کا پیکیج ہرگز بھاری نہ ہونے پائے اور چیزیں حددرجہ آسان رکھی جائیں۔ 'حُلیوں' پر محنت کرانے کا یہ وقت نہیں۔ فضائل تو کیا، فرائض میں بھی صرف اسلام کے بنیادی فرائض ہوں گے جن پر معاشرے کے ایک عامِ فرد کو پختہ کرایا جائے گا۔ اور بس۔ بڑے بڑے محرّمات (كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ) سے اجتناب، اور بس۔ پیکیج کو سادہ اور مختصر رکھنا ایک عوامی رَو اٹھانے کے باب میں کامیابی کی کلید سمجھا جائے گا۔[6]

۸) "تعلیم" مختصر مگر "صحبت" نااختتام پزیر۔ جس کا مرکز خدا کے گھر ہوں۔ یہاں سے؛ **"ماڈل مسجد"** کا ایک تصور سامنے لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ "دعوت" کی کامیابی بہت بڑی حد تک اسی کے اندر پنہاں ہو گی۔ "مسجد" جو روزمرہ عبادات ہی کو روحانی وسماجی توانائی کے اندر ڈھال دینے کی مہارت سامنے لائے۔ "عبادت" جو خودبخود یہاں ایک معاشرتی کردار میں ڈھلتی اور سماج کو جنت بناتی چلی جائے۔ "مُصلّین" کے جمگھٹے جو کسی اضافی ٹانکے کے بغیر (آپ سے آپ) "طعام المسکین" کے ادارے ہوں اور جن کے اردگرد کئی کئی کلومیٹر تک بھوک یا ننگ یا گند نہ پھٹک سکتا ہو[کجا یہ کہ ایک پرائم ٹائم پر (نمازِ

6 دعوت کا پیکیج ویسے بھی مختصر رکھنا ہوتا ہے۔ تاہم اِس پورے مضمون میں جس دعوتی ضرورت کی بات ہو رہی ہے وہ ہے اِس وقت ہمارے معاشرے پر حملہ آور ہیومن اسٹ کفر اور اس کی اہم اہم مصنوعات کے مقابلے پر مسلم عقول کی قلعہ بندی اور اسلام کے سماجی کردار کی بحالی۔

جمعہ کا سلام پھرتے ہی) بیسیوں کراہتی آوازیں سائلوں کی دل چیر دینے والی اٹھیں اور 'مسجد انتظامیہ' کی طرف سے انہیں موقع پر تنبیہ فرمانے والے ذمہ دار تعینات ہوں کہ 'شاباش باہر جا کر مانگو'! (مانگتے ضرور رہو!) 'مساجد' پر یہ وقت بھی آنا تھا! 'نمازیوں' سے کھچا کھچ بھرے اس مجمعے کی بلا سے، ان دلدوز چیخوں میں کونسی آواز کسی حقیقی ضرورتمند کی ہے اور کون نرا پیشہ ور گداگر جو حقیقی ضرورتمندوں کا حق مارنے اور مسلم معاشرے میں بھیک ایسی لعنت کو فروغ دینے کے باعث در حقیقت لائقِ تادیب ہے نہ کہ قابلِ مدد۔ یہ لااُبالی ان 'صدقہ گزاروں' کے چہرے پر بھی آپ دیکھ سکتے ہیں جو باہر مانگنے والے مردوں اور عورتوں کے ہاتھ پر کچھ روپے دھرتے ہوئے رخصت ہو جائیں گے! ('نمازیوں' کو کوئی ایسی معلومات دستیاب کرانا کہ ان کے اس پورے علاقے میں حقیقی ضرورتمند کون اور کہاں کہاں واقع ہیں اور ان کو باعزت زندگی کی پٹڑی پر چڑھالانے کی کیا کیا اسکیمیں قابلِ عمل ہیں، یہ 'مسجد انتظامیہ' کے دائرۂ کار میں نہیں آتا! نہ 'نمازیوں' کو یہ جان رکھنے سے سروکار! نہ یہاں 'امامت' کرانے والے کا دردِ سر!)]

وہ مسجدیں جہاں صبح شام سورۃ الماعون کی تلاوت ہوتی ہے (زیادہ تر اس لیے کہ یہ ایک 'چھوٹی' سورت ہے اور جلد پڑھی جاتی ہے!) آخر کیا مانع ہے کہ یہ مسجدیں اپنی اس پنجوقتہ گہما گہمی کو کسی سنسان 'این جی او' سے بڑھ کر یہاں کے فقراء و مساکین کے لیے کارآمد نہ بنادیں؟ کیوں وہ انجیل بردار این جی اوز سات سمندر پار سے آکر یہاں قدم قدم پر 'سوشل سروس' کے تھڑے لگا لیتی ہیں؟ یہ اتنا بڑا خلا ان کے لیے آخر چھوڑا کس نے ہے؟ ذرا نام ہی پر غور فرمائیں: non-governmental organizations! یعنی کسی ریاستی

انتظام کے بغیر چلنے والی انجمنیں! جو سات سمندر پار سے ہماری 'مدد' کو آپہنچیں۔ ادھر ہمارا رونا یہ کہ 'ریاست' اور 'انقلاب' کے بغیر ہم کریں تو کریں کیا! (اپنے محلے کا سہارا بھی بغیر 'انقلاب' اور 'خلافت' کے کیونکر بنیں!)

'این جی اوز' کو بے حدوحساب کوسنے دیتے وقت کیا ہم نے "مسجد" کو دستیاب پوٹینشل کی اُس فراوانی پر بھی کبھی غور کیا جو ہمارے خلاف شاید ایک حجت بننے والی ہے؟ کتنی مہنگی پڑتی ہے ہمیں وہ روٹی جو 'این جی او' سے آپ کی اِس بیٹی کو میسر آتی ہے۔ کتنی تلخ ہے وہ مسکراہٹ جو اِس چہرے پر اُس کے احسان سے آتی ہے۔ وہ اِس کے آنسو پونچھتی ہے تو اِس کے سر کی چادر ہی نہیں تن کا لباس تک عنقا ہونے لگتا ہے۔ یہی روٹی اسے "الماعون" کی خوش الحان تلاوت والوں سے آخر کیوں میسر نہیں آسکتی؟ تاکہ اِس غریب کا پیٹ بھرے تو دین و آبرو بھی بچے۔ آخر کچھ initiative ہی تو لینے ہیں آپ کو۔ وہ این جی اوز بھی تو ہمارے ہی وسائل کو گردش میں لاتی ہیں۔ صرف سوچ اور اقدام اُن کا ہوتا ہے باقی تو سب کچھ ہمارا اور یہیں کا ہوتا ہے۔ اِن دو باتوں کی ہی شاید کمی ہے ہمارے یہاں: سوچ idea اور اقدام initiative۔ اِنہی دو باتوں سے آپ ہمیشہ راج کرتے ہیں، باقی تو کارِ خر donkey work ہے جو آج بھی ہمارے ہی لوگ کرتے ہیں اُن باہر کے دماغوں کے لیے۔[7] کیا ہم اِنہی دو باتوں میں مفلس ہو چکے؟ مؤثر روزگار سکیمیں، صفائی مہمات، تعلیمِ بالغان، سماجی انصاف، محروموں کی دادرسی، محلے کے بے سہارا اور آوارہ بچوں

---

7 آپ نے نوٹ فرمایا ہو گا باہر سے چلنے والے پروگراموں کے لیے ہمارے یہیں کے ملازم اور افسر نہایت معیاری کارکردگی دکھاتے ہیں! یعنی 'باہر کے ملک' جائے بغیر گویا یہ یہاں کے نہیں! ایک لمحۂ فکریہ۔ یہاں "امامت" کے افلاس پر ایک واضح و افسوسناک دلیل۔

کو معاشرے کا ایک مفید اور پید آور حصہ بنانا، یتیموں اور بیواؤں کی کفالت... جرائم، مار دھاڑ، منشیات، ملاوٹ، رشوت، خیانت، کام چوری، دو نمبری، گھٹیا پیداوار وغیرہ کے خلاف عوامی آگہی public awareness و عوامی مزاحمت public resistence کو باقاعدہ ایک چینل دینا (آخر کیوں یہ کام 'اخبارات' اور 'ٹی وی' کے لیے چھوڑا جائے؟)[8]، بے حیائی کی روک تھام، امر بالمعروف و نہی عن المنکر... ایسے سب امور کے تھڑے یہ اونچے اونچے میناروں والی مسجدیں کیوں نہیں ہو سکتیں؟ جس معاشرے میں ہر چند قدم پر "مسجد" میسر ہو وہاں "ترقی" کو آوازیں پڑیں! ہر طرف لتھارجی کا مارا ہوا سماج! نرا ایک 'کونزیومر' اور دوسروں پر جینے والا معاشرہ! عزتِ نفس مفقود! کشکول برداری! سب ناقابل یقین ہے۔ یہاں "امامت" کا ایک تصور ہی تو درست کرانے کی ضرورت ہے؛ باقی کمی کیا ہے؟ 'دو رکعت کے امام' کو "زندگی کے امام" میں ڈھال دینے کے پلانٹ جگہ جگہ لگا دیجئے؛ آپ کا بحران کہیں بھی نہیں۔ یہ سب رونے کیسے؟ طاقت کے سر چشمے پر بیٹھ کر ناتوانی کے گلے! وہ مار گیا، وہ کھا گیا، وہ این جی او، وہ یہودی، وہ عیسائی، وہ سازش، وہ ملی بھگت... بھائی ہم اپنے گریبانوں میں کب جھانکیں گے؟ ہمارا بحران تو ہماری "امامت" میں ہے۔ یہ تلچھٹ تو آپ سے آپ چھٹ جاتی ہے۔ یہ مسجدوں کے مینار آج بھی مبارک ہیں اور ہمیں کفایت کر دینے والے ہیں۔

غرض مسجد کی حیثیت سماج میں وہ ہو جو جسد میں کلیجے اور دل کی ہوتی ہے۔

---

8 ذرا اندازہ کرتے جائیں، یہاں چند درجن دین باختہ 'کالم نگار' اور 'اینکر' پوری قوم کی ذہن سازی کر جائیں اور ہزاروں ائمہ و خطباء بڑے بڑے مجمعوں کے ساتھ اس کام سے عاجز، ہاتھ ملتے رہ جائیں! واللہ، خدا کے اِس جہان میں کوئی قوم بے وجہ مار نہیں کھاتی!

یہاں صالح خون کی افزائش ہونے لگے، اور یہاں سے پورے جسم کو خون کی ترسیل ہونے لگے تو "جسم" تو خود بخود اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مصیبت یہ ہے جب "دل" کو بھی اعضاء میں سے ایک عضو سمجھ لیا جائے جو بیچارہ خود بھی خون کے عطیات پر جینے لگے، نہ کہ وہ "عضوالاعضاء" جس کا کام ہے کہ پورے جسم کا خون صالح و کارآمد کر دینے کے بعد اس کو جسم میں لوٹائے اور دن میں 'پانچ بار' اس عمل کو کامیابی کے ساتھ دہرائے۔ یہ جو اپنا ایک بحران ہے حضرات اس پر تو ہمیں خود ہی قابو پانا ہے! اِس کے لیے تو کسی 'آرڈیننس' اور کسی 'بل' کی ضرورت نہیں! میں کہتا ہوں کوئی حرج نہیں اگر "دعوت" کا بیڑا اٹھانے والی کچھ مرکزی شخصیات "ائمہ" کا صرف ایک پلانٹ اِس ملک میں ایسا لگا دیں اور ان کے ذریعے سے "مساجد" کے ایسے کامیاب نمونے سامنے لائیں جن میں "سماجی زندگی" کو ایک صالح رخ دینے کی صلاحیت ٹپکے۔ پھر دیکھتے ہیں یہاں ہمارا 'گراس رُوٹ ورک' کیسے نہیں پھوٹتا۔ یوں مساجد معاشرے کے لیے حقیقی انجن کی حیثیت اختیار کر لیں گی۔ اِسی کو ہم کہتے ہیں مسجد کا تاریخی کردار بحال کروانا۔ دعوت کا بیڑا اٹھانے والی مرکزی شخصیات یا ان میں سے کچھ، سب سے پہلے اس ("ماڈل مسجد") کے کچھ پائلٹ پراجیکٹ لائیں پھر ابتدائی تسلی کر لینے کے بعد اس کو قریہ قریہ بستی بستی پھیلا دیں۔ سب اندھیرے آپ کے راستے سے چھٹتے چلے جائیں گے، ان شاءاللہ۔

۹) نئی نسل کے معاملہ میں ایک چیز جسے ہم **<u>تعلیمی سپلیمنٹ supplement</u>** کہتے ہیں۔ "دعوت" یہاں سے بھی معاشرے کے اندر ایک بہت بڑا راستہ بنا سکتی ہے۔ لوگوں کی ایک معتدبہ تعداد ایسی ہے جو اپنے بچوں کو سٹینڈرڈ کے ان اداروں میں پڑھانے کے سوا فی الحال چارہ نہیں پاتی جہاں تعلیمِ دین کی کوئی

صورت میسر نہیں۔ جبکہ اپنے بچوں کو اساسیاتِ دین کی تعلیم دلوانے میں دلچسپی اِدھر بھی کم نہیں، بشرطیکہ ایک معیاری انداز میں دستیاب ہو، جو کہ نہیں ہے۔ یا تو آپ اپنے بچوں کو کسی فل ٹائم اسلامی سکول میں پڑھائیے۔ لیکن اگر وہ بوجوہ ممکن نہیں تو پھر انہیں کوئی دینی تعلیم اور ماحول سرے سے میسر نہیں۔ حاملانِ دین تھوڑی ہمت سے کام لیں تو اِس رخنہ کو بڑی آسانی سے پر کر سکتے ہیں۔ ایسے مؤثر وِیک اینڈ ادارے اور سمر پروگرام جو لوگوں کی اس ضرورت کو ایک مشنری جذبے کے ساتھ پورا کریں اور باقاعدہ کورسز اور گریڈز کی صورت میں یہ خدمت انجام دیں۔ اور ہوتے ہوتے نوجوانوں کی سطح تک کے پروگرام سامنے لائیں۔ اِسے ہم کہتے ہیں "تعلیمی سپلیمنٹ"۔ یہ چیز نہ صرف نئ نسل کو اسلام سے جوڑنے میں ممد ہو گی، بلکہ اس کے ذریعے "دعوت" یہاں کے سیکولر اداروں کے اندر جا اترے گی۔ اس "سپلیمنٹ" کی معیاری فراہمی کے لیے صرف کچھ نیٹ ورک میدان میں لانا ہوں گے۔

۱۰) دعوتی جذبے کے ساتھ یہاں کئی گروپ اور پروگرام ایسے میدان میں اترنے چاہئیں جو دعوتی ضرورت کی **میڈیا پروڈکشنز کا ایک سیلاب** لے آئیں۔ اور ہوں وہ بے حد مؤثر۔ تقریروں، وعظوں اور ٹاک شوز کے سی ڈیز کا زمانہ پرانا ہو چکا۔ مختصر آئیڈیا پر مشتمل کچھ تخلیقی اشیاء آنی چاہئیں۔ شارٹ فلم ایک بہت قوی ہتھیار ہے۔ ایک ایک دو دو منٹ کا پاور فل میسیج بسا اوقات تین گھنٹے کی تقریر پر بھاری ہوتا ہے۔ تہذیبی ایشوز کو خاص طور پر موضوع بنانا ہو گا۔ سمجھو "عقیدہ" کو جتنی بات کرنی ہو اس کے لیے وہ "ثقافتی پیرائے" اختیار کرے۔ یہی چیز اس وقت آپ کی تعبیری قوت کا امتحان بھی ہو گی۔ (خواص کی بات اور ہے، دعوت کو عوام کے اندر بولنے کے لیے اِن اشیاء سے چارہ نہ ہو گا)۔

سوشل میڈیا ایک بہت بڑا جہان ہے، جو آپ کے پاس چینل نہ ہونے کے گلے خاصی حد تک ختم کر دیتا ہے۔ آئندہ سالوں میں تو یہ اور بھی پھیل جانے والا ہے۔ پھر جمعہ کے سٹال۔ مگر سوال یہ ہے کہ **آپ کے پاس یہاں دینے کو ہے کیا؟** اسلامی جذبہ رکھنے والے تخلیق کاروں کی ایک فوج ظفر موج درکار ہے جو اِس ثقافتی جنگ کا پانسہ پلٹ کر رکھ دے۔ تاثرات کی جنگ تاثرات کی زبان میں لڑے (عوام میں دلیل اور علمیت ایک حد تک ہی کام کرتی ہے)۔ دردمندوں کو ایسے رجالِ کار لازماً میدان میں لانا ہوں گے۔ اب ہرگز یہ کافی نہیں رہ گیا کہ مساجد کے باہر صرف وعظوں اور ترانوں کے کیسٹ ہی بکیں۔ یہاں اب کچھ تخلیقی چیزیں آنی چاہئیں۔ البتہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی سیکٹر اِس وقت سوشل میڈیا وغیرہ پر کچھ پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ چند گروپ ایسے کھڑے کر دیے جائیں (جس پر آپ کی خوب محنت ہو گی) تو وہ تھوڑے عرصے میں صورتحال کو بدل سکتے ہیں۔ اصل چیز پروڈکشن ہے۔

ان سب یا ان میں سے کچھ بھی جہتوں پر اگر کام ہونے لگتا ہے تو تھوڑی دیر میں ان شاءاللہ آپ دیکھیں گے یہاں زندگی کے گوناگوں شعبوں کے اندر "مسلمان" سر اٹھانے لگا ہے اور لادینوں کو پیچھے چھوڑ جانے لگا ہے۔ بس یہاں سے آپ کے دن پھرنے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمل کو نامیاتی organic ہی رہنا اور ایک دھیمی رفتار سے ہی چلنا ہے۔ آپ کی وہ محنت جو پیچھے مذکورہ میدانوں میں ہوئی، یہاں کے اداروں اور شعبہ ہائے حیات کے اندر آپ سے آپ بولے گی؛ اس کے لیے کسی اضافی کارروائی کی ضرورت نہیں۔ البتہ توجہ اِدھر خوب رکھنی ہے اور لوگوں کو ان میدانوں میں آگے بڑھنے اور پروفیشنل معیار دینے پر خوب آمادہ کرنا ہے۔ میرٹ کی جنگ میرٹ پر ہی لڑی جائے گی۔ خود اسلامی تحریکی عمل کو گیج guage کرنے کا

یہ ایک پیمانہ ہو گا کہ ”دیندار“ یہاں زندگی کے شعبوں میں کس قدر پیش قدمی کر پایا ہے (”دیندار“ سے مراد یہاں کچھ مخصوص 'حلیوں' کے لوگ نہیں، براہِ کرم یہ تصور ضرور درست کرا دیجئے)۔ ”دین Vs بے دینی“ کا ڈائیلیکٹ اگر آپ دانشمندی سے یہاں اٹھاتے ہیں.. اس کے لیے آپ کے دینی خطاب میں جس قدر پختگی maturity، سماجی نظر social vision نیز جس استقلال، صبر، برداشت (بدترین سے بدترین مخالفت کو خندہ روئی سے لوٹانا، جو اِس پورے عمل کی جان ہے)، جس وسعت، فراخ دلی، جاذبیت، دلنشینی، ادبی لہجے، سلیقہ اور جمالیاتی حس کی ضرورت ہے.. اُس کا اگر اپنے دینی خطاب میں بندوبست کر لیا جاتا ہے.. اپنے وقت کے انسان کو خطاب کرنے کی صلاحیت اگر بہم پہنچالی جاتی ہے.. تو سماجی شعبوں میں دین کی پیش قدمی کو ان شاءاللہ کوئی نہیں روک سکتا۔

شدت پسند ڈسکورس کو اسلامی پیراڈائم سے بیگانہ ٹھہرانا.. اِس وقت کی اہم ترین ضرورت

عمومی حالات میں یہ تکرار ضروری نہ تھی۔ (پچھلی فصول میں اس پر بات ہو چکی) تاہم ”دعوت“ کو بچانے کے حوالے سے سفارشات میں اس کا علیحدہ ذکر کر دینا ضروری ہے:

پچھلے ایک عرصہ میں ملک پر جو مار دھاڑ کی صورتحال گزری ہے اور اس مار دھاڑ کا ایک حصہ بد قسمتی سے 'اسلام' کے نام پر لانچ کروایا گیا ہے جس کا نقصان ملک اور قوم کو بھی یقیناً بہت ہوا... لیکن جو نقصان اِس کا یہاں پر ”دعوت“ اور ”اسلامی ایجنڈا“ کو ہوا وہ ہر چیز سے سوا ہے۔ خرانٹ لبرلز کا ایک غول تو بیٹھا ہی گویا اِسی تاک میں تھا۔ اور اب حالت یہ کہ لبرلز کا یہ غول، جو یہاں کے ذرائع ابلاغ پر بھی حاوی ہے، اسلامی اِحیاء کی ہر کوشش اور کاوش کو ایک جرم کے رنگ میں پیش کرنے کی مار پر ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے کہ اسلامی

سیکٹر نے 'اسلام' کے نام پر ہونے والی اس جنگجوئی militancy کا سب سے نمایاں ناقد نظر نہ آکر ایک شدید کوتاہی کی ہے (جس طرح اور بے شمار دعوتی ضرورتوں میں اس سے کوتاہیاں ہو رہی ہیں، یہ بھی ایک سُستی ہوئی)۔[9] اس کے نتیجے میں یہاں کی صورتحال پر لبرلز کا اتنا بڑا ہاتھ پڑا ہے جو اس سے پہلے شاید کبھی نہیں پڑا تھا۔ ایک بہت بڑا نقصان جو ہو چکا۔ وقت واپس لایا نہیں جا سکتا۔ اب یہ پانسہ بڑے صبر و دانشمندی کے ساتھ اور عام معمول سے بڑھے ہوئے کچھ اقدامات لا کر ہی کسی نہ کسی حد تک پلٹنے کی سبیل کرنا ہوگی۔ اسلامی ایجنڈا کا مفاد ہر چیز پر مقدم ہے۔ لہٰذا:

- اب یہاں کے کسی بھی اسلامی اِحیائی عمل کو جہاں اور چیزوں پر توجہ دینا ہوگی وہاں اپنا ایک ایسا چہرہ سامنے لانے پر معمول سے بڑھ کر محنت کرنا ہوگی جو:

۱) اِس وقت دنیا بھر میں 'اسلام' کے نام پر جاری شدت پسندی کو نہ صرف کھل کر اور آخری حد تک رد کرتا ہے، بلکہ 'اسلام' کے حوالے سے اُس (شدت پسند) ڈسکورس کے پیدا کردہ شبہات اور اِشکالات (جو بہرحال نوجوانوں کی ایک تعداد کو متاثر کرتے ہیں) کا علمی جواب دینے پر بھی سب سے بڑھ کر یہی قدرت رکھتا ہے۔ اور عملاً ایسا کر رہا ہے۔ (اپنا ایک ایسا چہرہ سامنے لانے پر معمول سے بڑھ کر محنت کرنا ہوگی، نیز یہ واضح کرنے پر کہ) نوجوانوں کو اس شدت پسند ڈسکورس سے باہر لانے کا واحد طریقہ ان سے جیلیں بھر دینا

---

9 مکرر عرض کر دیں، ہم نے یہ نہیں کہا کہ اسلامی سیکٹر نے اس جنگجوئی militancy کی کبھی کوئی تائید کی ہے۔ ہرگز نہیں۔ حق یہ ہے کہ اسلامی سیکٹر نے بالعموم اس کا رد ہی کیا ہے۔ ہم یہاں جو بات کہہ رہے ہیں وہ یہ کہ جس شدت کے ساتھ اسلامی سیکٹر کو اس کا رد کرتے ہوئے پچھلے سالوں میں نظر آنا چاہیے تھا وہ شاید اس سے نہیں ہو سکا، گو اس کی کچھ اپنی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر اس کا نقصان ملک کے اندر اسلامی ایجنڈا کے حق میں شدید رہا۔

نہیں (گو لبرلز اسی صورتحال کو شکار نے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کی صورت دھار لے اور اس کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جائے، جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے جانیں جاتی رہیں، تاکہ اِن کی اور اِن کے غیر ملکی سرپرستوں کی خوب چاندی ہو، یہ مسلسل ملک کے خیر خواہ بھی نظر آئیں اور اس کے اندر ایک دُوررَس جنگ کی چنگاریوں کو بھی ہوا دیتے چلے جائیں، جس کی حد یہ ہو کہ یہاں اسلام کا ہر نام لیوا اِس جنگ کا حصہ بنا دیا جائے)۔ بلکہ اس صورتحال پر قابو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دیندار طبقے ہی یہاں کے نوجوان ذہن کو تشدد کی راہ سے دور کریں جو اِس شدت پسند ڈسکورس کا علمی رد کر سکتے ہوں [آخر سوچتے کیوں نہیں "نفاذِ اسلام" کی بات تو یہاں روزِ اول سے ہوتی آئی ہے جبکہ یہ شدت پسندی جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ اب اگر لبرل خبثِ باطن "نفاذِ اسلام" کے سب داعیوں کو اِس جنگ کا فریق بنا دینے کی کوشش کرتا ہے تو یہ بات نہ صرف خلافِ واقعہ ہے بلکہ یہ ایک جنگ کو وسیع کر دینے کی گھناؤنی کوشش بھی ہے؛ یعنی ایک ایسے ملک میں "ریاست" اور "اسلام" کی جنگ اٹھانا جو بنا ہی "اسلام" کے نام پر ہو! یعنی ملکِ پاکستان کے تصور کو undo کروانے کی ایک شاطرانہ کوشش، اس کے وجود میں آنے کے صرف چھ عشرے کے اندر اندر! بخدا، لبرل کچھ ایسے ذہین نہیں ہمارے لوگ کچھ سادہ نکلے جو ایک بالکل سامنے کی صورتحال کو بھانپنے یا اس پر بولنے میں دیر کر گئے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم محض اپنے ایک نکماپن (ایک صحیح بات بروقت بول نہ پانے) کے باعث لبرلز کو وہ چیز دے دیں جو وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتے تھے]۔ لبرلز کا یہ داؤ، جس کا موقع بلاشبہ یہاں کے شدت پسندوں کی نادانی نے ہی انہیں فراہم کیا ہے.. لبرلز کا یہ داؤ ہمیں ہر

حال میں ناکام کروانا ہو گا خواہ اس کے لیے جو بھی کرنا پڑے۔ ورنہ ہماری نسلیں شاید ہمیں معاف نہ کریں۔ اتنے بڑے نقصان کے ہم متحمل ہی نہیں ہیں۔ ملک میں اسلام آنے کو دیر لگے یا سویر، البتہ یہ حربہ اِس موقع پر چل جانے دینا ہمیں کسی صورت اور کسی قیمت پر قبول نہیں۔ اسلام اور پاکستان کے رشتے کو لازوال رکھنے کے داعیوں کو لازماً یہ کرنا تھا اور کرنا ہو گا (اگر وہ اِس رشتے کو کم از کم اچھے وقتوں کے لیے بچا رکھنا چاہتے ہیں) کہ:

- ”نفاذِ اسلام“ کے ساتھ لگا دیے گئے ”تشدد“ کے اس ٹانکے کو ختم کرنے کے سب سے بڑے داعی بن کر یہ از خود سامنے آئیں تاکہ معاملہ پچھلی پوزیشن پر واپس آئے (جب ”نفاذِ اسلام“ کی دعوت یہاں زور و شور سے تھی مگر ”تشدد“ کا کہیں نام و نشان نہ تھا)۔
- اور یہ بھی واضح کریں کہ اس ملک میں ”نفاذِ اسلام“ کے حقیقی داعی کچھ حوصلوں والے لوگ ہیں جو قوم کے ساتھ صبر کرنا جانتے ہیں۔ آج بھی، کل بھی اور سو سال بعد بھی یہ قوم کا ہاتھ تھام کر ہی چلیں گے۔ اور ان کو معلوم ہے ابھی قوم کس حالت میں ہے اور کن خطرات میں گھِری ہے۔ لہٰذا **”نفاذِ اسلام“ کے لیے یہ جس شدت کے حریص ہیں اُسی ہمت کے ساتھ یہ اس کے لیے لمبا چلنے کا برتہ بھی رکھتے ہیں۔** ”نفاذِ اسلام“ کا راستہ اِن کے ہاں ”سماجی عوامل“ سے گزرتا ہے نہ کہ ’بندوق‘ کی نالی سے اور اپنے ہی لوگوں کا ’خون‘ کرنے اور اپنے ہی ملک کو غیر مستحکم کر ڈالنے سے۔ یہ (امن پسند ڈسکورس) اِن کے اپنے نظریے اور اعتقاد conviction کی بات ہے؛ جس پر یہ روزِ اول سے کاربند ہیں اور جس کے یہ اللہ کے فضل

سے ڈھیروں دلائل پاس رکھتے ہیں۔

O اور یہ کہ "نفاذِ اسلام" کے ساتھ ظلم یا جہالت سے لگوا دیے جانے والے "تشدد" کے اِس ٹانکے کو ختم کروانا اور اس پر وہ شرعی دلائل لانا جو یہاں کے جذباتی نوجوانوں کی معتد بہ تعداد کو مطمئن کر سکیں، یہ بھی ان شاء اللہ اِنہی کے بس کی بات ہے۔

۲) اِس ملک کے سٹریٹیجک مفادات، قومی اثاثہ جات، یہاں کے قومی اداروں اور اس کی سلامتی و استحکام اسے دل و جان سے عزیز ہیں۔ ان پر کسی قسم کی آنچ آنے کے اندر یہ ایک دُوررَس معنیٰ میں اسلام ہی کا نقصان دیکھتا ہے۔ اِس وقت اِن (مسلم) ملکوں کا مفاد کسی بھی طرح اسلام کے مفاد سے الگ نہیں ہے۔ (اِس نقطہ پر پیچھے ہم تفصیل سے بات کر آئے ہیں، یہاں اس کو صرف ایک سیاق میں لانے کے لیے اعادہ ہوا)۔

ملکی تاریخ کے اِس موڑ پر یہ چیز ویسے بھی ضروری ہے۔ اور اسلامی تحریک ہی کے انجام دینے کی ہے۔ تاہم اسلام کے احیائی عمل میں کسی نئی پیش رفت کے لیے فکر مند طبقوں کا اِس طرف توجہ دینا کچھ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سے صرفِ نظر کرنا نہ صحیح ہو گا اور نہ ممکن۔ بلکہ صورتحال جس قدر حساس اور پیچیدہ کر دی گئی ہے، ہماری نظر میں اسلامی تحریک کو کچھ دیر تک توجہ ہی اس پر مرکوز کر دینا ہو گی۔ **یعنی دہشتگردی اور تشدد کا اسلامی فکر سے ہرگز کوئی ناطہ نہ ہونے کا بیان۔** قومی سلامتی اور قومی مفاد کو یہاں اس حد تک اون own کرتے ہوئے نظر آنا کہ کچھ نادان کوششیں اس کو ضرر پہنچانے والی اگر 'اسلام' کے نام پر سامنے آتی ہیں تو اس کا سدباب کرنے والا سب سے نمایاں فریق نہ تو یہاں کا لبرل نظر آئے اور نہ حتیٰ کہ حکومتی مشینری۔ 'اسلام' کے نام پر قومی سلامتی یا قومی مفاد کو نقصان پہنچانے والی جو بھی کوشش سامنے آتی ہے، سب سے بڑھ کر اس کا سدباب کرتا نظر آنے والا خود اسلامی سیکٹر

ہی ہونا چاہیئے، اور کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ ایک داخلی داعیہٴ عمل کے تحت۔ آئندہ سو سال تک کے لیے اس بات کو گرہ باندھ لیجئے اور پیچھے والوں کو اس پر نصیحت کر جایئے۔ بڑی قیمت دی ہے ہم نے اس کی؛ آئندہ یہ کبھی نہ دینی پڑے۔ اس صورتحال کی درستی کو حالیہ مرحلہ میں اپنی سب سے بڑی ترجیح قرار دینا ہوگا۔ ہم تو کہیں گے، کچھ دیر تک اسلامی سیکٹر کے اِس image repair کے علاوہ آپ کی فی الحال کوئی اور سرگرمی نہ ہو تو ٹھیک ہے۔

*****

واضح رہے، اوپر صرف دعوت کا ایک خاکہ آیا ہے کیونکہ یہیں سے اس تمام بیداری کا آغاز ہوتا ہے۔ رہ گئی آپ کی سیاسی یا شعبہ جاتی جدوجہد تو اس کی کوئی تفصیل ہماری اِن سفارشات میں بیان نہیں ہوئی۔ البتہ یہ بات خصوصی طور پر نوٹ ہونی چاہئے، اور جو کہ ہماری اس تمام گفتگو کا مرکزی نقطہ ہے کہ: **دعوت میں ایک جاندار پیش رفت اگر علیحدہ سے ہونے لگتی ہے تو آپ کی سیاسی یا شعبہ جاتی پیش رفت یہاں کسی لمبے چوڑے 'مذہبی' نعرے یا دعوے یا کسی مخصوص 'مذہبی' پہچان face کے بغیر ہی ہونی چاہیئے**۔ سیاست میں 'مذہب' کا باقاعدہ بیگیج اٹھا کر چلنا اِس وقت بوجوہ ممکن نہیں۔ اس پر خوامخوہ زور لگا کر وقت اور توانائیاں ضائع نہ کی جائیں۔

(نوٹ کیا جائے، ہم نے کہا ہے: اس وقت ممکن نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ صحیح نہیں۔ یعنی بات ازراہِ تدبیر ہو رہی ہے نہ کہ ازراہِ اصول)۔

مسئلہ ایک جماعت کو دو شعبے کر دینے سے بڑھ کر ہے

یہ بھی واضح کر دیں کہ یہاں جو وِژن vision بیان ہوا وہ محض کوئی اتنی سفارش نہیں کہ ایک ہی جماعت اپنا 'شعبہٴ دعوت' اور 'شعبہٴ سیاست' الگ الگ کر لے، اور بس! مسئلہ اس سے حل نہیں ہو گا۔ ہم یہ کہتے ہیں: دعوت اور سیاست کے لیے جمعیتیں ہی الگ الگ میدان میں اتریں۔ دونوں ایک دوسرے کی مجبوریوں سے ہی کُلی آزاد ہوں۔ ہماری اِس

سفارش کا مرکزی خیال ہی یہ ہے کہ

- o دعوت کو فی الواقع یہاں جو طاقت boost دلانے والی باتیں ہیں وہ (شارٹ ٹرم میں) سیاست میں آپ کے تقویت پانے کے اندر رکاوٹ ہیں۔
- o دوسری جانب سیاست میں جو جو راستے بنانا فی الوقت ممکن ہے وہ **ایک داعی کے طور پر** آپ سے تقریباً منہ بند رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

(اگر آپ حقیقتِ حال کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں)۔

اس لیے؛ بجائے اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کی مجبوریوں کی بھینٹ چڑھیں، دونوں اپنے اپنے strength points کے ساتھ آگے بڑھیں۔ جس کے لیے ضروری ہے، دونوں الگ الگ محور پر آگے بڑھیں۔ ہاں راستے میں جہاں جہاں اپنی پیش رفت سے یہ دونوں ایک دوسری کو صرف فائدہ دلا سکتی ہو، بس وہ دلائیں۔ یعنی دعوت سیاست کی یا سیاست دعوت کی کمزوری تو بالکل نہ بنے۔ مضبوطی جہاں بن سکتی ہو وہاں بنے، ورنہ ہر دو اپنی اپنی راہ چلیں۔ یہ چیز ایک ہی جماعت کے 'دو الگ الگ شعبوں' سے حاصل نہ ہو گی۔ وہ شہ زوری جو دونوں جانب درکار ہے، اس سے حاصل ہونے والی نہیں۔

پھر خاص طور پر جبکہ "دعوت" میں آپ کو ویسے بھی 'تنظیم' سے اوپر اٹھ جانا ہو گا۔ اس کے لیے بڑے بڑے مشائخ (فُحُول giants) کو سامنے لانا ہو گا جو کفر کی ایک تہذیبی پیش قدمی کے مد مقابل قوم پر خدا کی حجت قائم کریں؛ اور محسوس ہو کہ "امت" اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور بلاشبہ یہ مشائخ کے کرنے کا کام ہے بھی۔ البتہ یہ (مشائخ) لوگ کسی تنظیم یا گروپ سے نسبت جوڑنے پر بالعموم آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اس معاملہ میں کچھ الرجک بھی واقع ہوئے ہیں۔ ہاں کچھ "موضوعات" کے حق میں (اگر وہ صریح "دین" ہیں) بولنے اور آواز اٹھانے میں ان کو کیا مانع ہے؟ یہ تو ان کا خدائی منصب ہے (لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنّاسِ) جس کی انہیں یاددہانی کرانا ہمارا حق ہے۔ (ہاں ان موضوعات کے حق میں "بولنے" اور "آواز اٹھانے" کو

سٹرکچرڈ structured بنادینا ضروری ہے)۔ جبکہ ’’دعوت‘‘ ہے ہی اس ’’بولنے‘‘ اور ’’آواز اٹھانے‘‘ سے عبارت۔ یہی معاملہ دین سے وابستہ بڑے بڑے دانشوروں کا ہے۔ یہ بھی ایک ’’ایشو‘‘ کے حق میں بول سکتے ہیں (اور مجھ سے اور آپ سے بہتر بول سکتے ہیں) ایک ’جماعت‘ کو جوائن کرنے کے سوال پر البتہ یہ ہزار بار سوچتے ہیں؛ اور بڑی حد تک درست بھی ہیں۔ لہٰذا دعوت کا پوٹینشل اپنے ہی انداز میں آگے آئے، یہی اس کی قوت strength ہے، اس پر اضافی قدغنیں لگانا (ہر بڑی شخصیت کو ’تنظیم‘ میں لانے کی کوشش کرنا) اس کا زور کم کر دینے کا باعث ہو گا، ایک ایسے وقت میں جب ہمیں دعوت یہاں پورے زور سے اٹھانی ہے۔ بصورتِ دیگر یہ ہیومن اسٹ یلغار ہمارا کچھ نہیں چھوڑنے والی۔

بلکہ ہم تو کہیں گے یہاں جگہ جگہ دردمندوں کے سرکل سامنے آنے چاہئیں جو اپنے اپنے شہر کے اہل علم و فضل کو دعوت کی پشت پر لے آنے پر پورا زور صرف کر دیں۔ یہ اپنے علاقے کا کوئی عالم، کوئی دانشور، کوئی پروفیسر، سماجی اثر ورسوخ کی مالک کوئی شخصیت ایسی نہ چھوڑیں جس کے دروازے پر یہ بار بار نہ جا کھڑے ہوئے ہوں، اِس ایک مقصد کے ساتھ کہ یہاں دینِ خداوندی کے حق میں جس آواز اٹھانے کی ضرورت ہے ان میں سے ایک ایک شخصیت اس کے اندر اپنا کماحقہ ’حصہ‘ ڈالے۔ غرض ’’دعوت‘‘ کو ایک دھارا بنانے کے لیے کچھ نیٹ ورک تو ضرور جگہ جگہ سرگرم ہوں، لیکن عملاً یہاں کے بڑے بڑے فحول giants (سربرآوردہ علماء، دانشور) ہی (ایک informal غیر تنظیمی انداز میں) اس کے سرکردہ دیکھے جائیں۔

مالک بن نبیؒ کا دیا ہوا ایک مبحث ’’معاشرتی جہت‘‘ تحریکی فکر میں شاملِ مضمون کرانا

یہ وہ نقطہ ہے جو شروع میں کسی حد تک مودودی صاحبؒ کے زیر بیان رہا۔ بعد میں سیاسی توقعات حاوی ہوتے چلے جانے کے باعث پس منظر میں چلا گیا۔ سید قطبؒ کے آخری ایام کی

تحریروں میں یہ مبحث قدرے کھل آیا۔ لیکن ”نظام“ والا پہلو اِن دونوں بزرگوں کے ہاں ”معاشرے“ والے پہلو پر مجموعی طور پر چھایا رہا۔ باقاعدہ مبحث کے طور پر البتہ یہ الجزائری مفکر مالک بن نبیؒ (جنہیں دورِ حاضر کا ابن خلدون کہا جاتا ہے) کے بیان میں ہی آیا ہے۔ ہماری درخواست ہو گی اسے یہاں کے تحریکی مباحث میں باقاعدہ شامل کروایا جائے۔ یہاں ہم اِس مبحث کو مع کچھ تطبیقات اختصار کے ساتھ اپنے اسلوب میں بیان کریں گے:

مالک بن نبیؒ کے فکر کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ تبدیلی کے مباحث میں سب سے زیادہ نمبر کسی قوم کی ”معاشرتی صورتحال“ کو دیے جائیں گے۔ دیگر عوامل کو نمبر ملیں گے ضرور، لیکن اِس مرکزی عامل کے مقابلے پر بہت کم۔ ابن نبیؒ کا کہنا ہے، ایک معاشرے کو دیکھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے کہ وہاں کیا کچھ بآسانی ہو جانے والا ہے اور کیا کچھ کی توقع رکھنا وہاں پر خام خیالی کے زمرے میں آئے گا۔ مثلاً ایک ’قابلِ استعمار‘ معاشرہ استعمار کی تھوڑی کوشش کے نتیجے میں بڑی آسانی سے اُس کے نرغے میں آجائے گا اور پھر بڑے مزے سے اُس کو کام دیتا چلا جائے گا۔ البتہ ایک ’قابلِ استعمار‘ معاشرے سے اگر آپ یہ چاہیں کہ یہ ایک زندہ و آزاد و ذمہ دار معاشرے کی طرح عمل کرے، تو یہ بات محض نعروں، خطبوں یا چند جذباتی انجیکشنوں کی مدد سے انجام نہیں پا جائے گی۔ اس کے لیے آپ کو یہاں کے کچھ سماجی عوامل ہی کو ہاتھ پر کرنا پڑے گا اور یہ معاشرتی کایا پلٹ ایک طویل المیعاد منصوبہ ہو گا (بشرطیکہ معاشرتی عمل میں آپ کچھ مؤثر کارگزاری کر سکیں، جبکہ یہاں کل امیدیں سیاسی عمل سے ہی وابستہ رکھی جا رہی ہیں اور اس کے اندر بھی ہاتھ میں کچھ نہیں!)۔ معاشرے کے اندر بولنے والی بہت سی سیاسی حقیقتیں بھی درحقیقت وہاں کی سماجی حقیقتوں کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہیں۔ گو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ”سماجی حقیقتوں“ پر اگر آپ ”سیاسی“ راہ سے اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں ہوں تو اِس کی ہرگز کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ ”سیاست“ یقیناً آپ کو ایک قوم کی سماجی صورتحال کو بدل دینے کے کچھ غیر معمولی مواقع فراہم کرتی

ہے (جو کہ اِس وقت لبرل یہاں بدرجۂ اتم لے رہے ہیں، سیاست میں لمبا چوڑا خود سامنے آئے بغیر!)۔ تاہم "سیاست" میں اگر آپ کا ہاتھ پڑے بھی، تو اصل توجہ آپ کو وہاں کی سماجی حقیقتوں پہ اثرانداز ہونے پر ہی مرکوز کر دینا ہوتی ہے، نہ کہ کچھ قانون قاعدوں وغیرہ کے اجراء میں پھنس کر رہ جانا ہوتا ہے۔ (لبرلز فی الوقت بڑی حد تک اِسی پالیسی پر گامزن ہیں، ایک نہایت اہم نکتہ جو دراصل ہمارے سمجھنے کا تھا)۔

بنابریں، ایک ماحول سے توقعات رکھنے میں آپ کو تلخ ہو جانے کی حد تک حقیقت پسند رہنا ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی منصوبہ بندی کرنا ہوتی ہے:

- شارٹ ٹرم میں صرف وہ اہداف ہی رکھنے ہوتے ہیں جن کے متعلق قوم کی "معاشرتی صورتحال" بول کر بتا رہی ہو کہ یہ کام فی الواقع یہاں پر ہو جانے کے ہیں۔ خواہ وہ (اہداف) آپ کی "وِش لسٹ wish list" کے حوالے سے شدید ناکافی ہوں، لیکن شارٹ ٹرم میں آپ کو بس انہی تک رہنا ہوتا ہے۔ "شارٹ ٹرم اہداف" کا فلسفہ ہی یہ ہے جیسے ایک آدمی دھیرے دھیرے ایک قدم دھرنے کی جگہ بناتا ہے۔ پھر دوسرے قدم کی۔ پھر چلنے پھرنے کی گنجائش نکالتا ہے۔ اور پھر اس سے آگے کی کوئی صورت ممکن بناتا ہے۔ آخر ہوتے ہوتے بہت کچھ کر لیتا ہے۔ البتہ ہر مرحلہ میں اتنا ہی ہدف رکھتا ہے جو وہاں کی "معاشرتی صورتحال" کے حوالے سے ممکن الحصول ہو۔ (منہج استطاعت)۔ حتیٰ کہ کسی وقت آپ اقتدار میں کیوں نہ ہوں، یا اہل اقتدار کی بھرپور تائید میں کیوں نہ لوٹ رہے ہوں، "شارٹ ٹرم" میں آپ اتنا ہی ہدف بناتے ہیں جو اندریں حالات ممکن الحصول acheiveable ہو۔ یہ وجہ ہے، آپ نے دیکھا ہوگا، کسی وقت لبرل بھرپور طاقت رکھنے کے باوجود ملک میں بہت سی اسلامی اشیاء کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ دوسری جانب، بعض ملکوں میں اقتدار رکھنے کے باوجود اسلام پسند طبقے اپنے اسلامی اقدامات میں ایک حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ یعنی "استطاعت"

خود اپنا آپ منواتی ہے۔ ضروری یہ ہے کہ اس کو ایک قانون کے طور پر بھی سمجھ لیا جائے (جیسے کشش ثقل کے قانون کی دریافت سے پہلے بھی لوگ چھتوں سے چھلانگیں نہیں لگا دیا کرتے تھے لیکن اس کو بطورِ قانون سمجھنے کے بعد بہت سی منظم ترقی ممکن ہوئی)۔ "معاشرتی صورتحال" کو مرکزمان کر اپنے شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم اہداف متعین کرنا ایک قانون کے طور پر تحریکی عمل میں ہمیں ویسا ہی فائدہ دے سکتا ہے جیسے نیوٹن کا قانون کشش ثقل سائنسی ترقی میں۔

- جبکہ لانگ ٹرم میں آپ کو وہ اہداف رکھنے ہوتے ہیں جو اس "معاشرتی صورتحال" کو رفتہ رفتہ اس قابل بنائیں کہ آپ اپنے شارٹ ٹرم اہداف زیادہ سے زیادہ مؤثر substantial اور زیادہ سے زیادہ براہِ راست direct بنانے لگیں، یعنی 'گھما پھرا' کر اپنے عمومی اہداف کی جانب بڑھنے کی مجبوریاں کم سے کم ہو جائیں۔

واضح رہے، ہم نے یہاں کسی ماحول کی معاشرتی صورتحال کو مرکزمان کر شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم اہداف متعین کرنے کی بات کی ہے۔ البتہ جہاں تک بات ہے خود اِس "شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم اہداف مقرر کرنے" کی، تو وہ تو ایک چھوٹے سے چھوٹا ادارہ بھی کرتا ہے۔ ہماری بڑی بڑی دینی جماعتوں کے ہاں اگر آپ کو ایسا کوئی وِژن vision نظر نہیں آتا کہ شارٹ ٹرم میں واضح واضح یہ کن اہداف کا تعاقب کر رہی ہیں اور لانگ ٹرم میں ان کے یہاں کن اہداف پر محنت ہو رہی ہے تو یہ بات افسوس ناک ہے۔ لہٰذا شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم اہداف کا تعین تو ضروری ہے ہی، ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ چیز یہاں کی "معاشرتی صورتحال کو مرکزمان کر" ہو:

- شارٹ ٹرم میں آپ دیکھیں گے: یہاں کی "معاشرتی صورتحال" آپ کو گنجائشیں کیا کیا دے رہی ہے، جہاں سے آپ اپنے عمومی اہداف کی جانب کچھ مؤثر راستے بنا سکتے ہوں۔ پھر اس کے مطابق اپنے کچھ فوری اہداف وضع کریں گے۔ وہ اہداف آپ کو بظاہر

کتنے ہی ناکافی لگیں، شارٹ ٹرم میں صرف انہی کے اندر کامیاب ہو کر دکھائیں گے۔ شارٹ ٹرم میں ناکامی کا سوال ہی نہ ہونا چاہیے۔ ایسا ہو تو زیادہ امکان یہ ہے، یہ اہداف وضع کرتے وقت آپ حقیقت پسند نہیں رہے تھے بلکہ آرزومند wishful ہو گئے تھے۔ یاد رکھیے ایک آرزومند wishful قیادت اپنے پیروکاروں کے حوصلوں کا ستیاناس کر دیتی ہے خواہ وقتی طور پر وہ ان کے حوصلوں کو آسمان پر کیوں نہ پہنچا لے۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ شارٹ ٹرم میں آپ اپنے لوگوں کو اہداف ہی وہ دیتے ہیں جو سر ہو جانے والے achievable ہوں۔ اس سے ان کے حوصلے جوان اور قیادت میں ان کا اعتماد بڑھتا چلا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ پہاڑوں کو اٹھا لینے کا برتہ پیدا کر لیتے ہیں۔ سکندر یونانی پہلے دن فتحِ ہند کے پیمان نہیں باندھتا۔ لیکن اس کی ابتدائی فتوحات اس کے سپاہیوں میں ہند جا پہنچنے کا حوصلہ ضرور پیدا کرا دیتی ہیں۔

- جبکہ لانگ ٹرم اہداف میں آپ نے کسی ماحول کی معاشرتی صورتحال کے اندر اپنے اہداف کے لیے گنجائشیں پیدا کرنا ہوتی ہیں۔ (یعنی شارٹ ٹرم میں آپ گنجائشیں ڈھونڈتے ہیں تو لانگ ٹرم میں آپ گنجائشیں پیدا کرتے ہیں)۔ اور یہاں بلاشبہ ایسی ہی ایک حوصلہ مند ambitious منصوبہ بندی ہونی چاہیے اور اسی کے مطابق اس پر محنت کا ایک باقاعدہ عمل بھی۔

"معاشرتی صورتحال" کو بنیاد بنانے کے اِس قاعدہ کی بعض ضروری تطبیقات ہم یہاں ذکر کریں گے:

۱) "نفاذِ شریعت" ایسے ایک بڑے ہدف کو آپ لانگ ٹرم میں رکھتے ہیں۔ یعنی یہ ایک ایسا ہدف ہے جس کے لیے آپ کو پہلے ایک باقاعدہ زمین تیار کرنی اور گنجائش بنانی ہے۔ یہ اگر آپ کا ہدف ہے تو آپ کو بتانا ہو گا، اس کے لیے زمین تیار کرنے کا آپ کے پاس کیا پلان ہے؟ نفاذِ شریعت کے حق میں ایک

دھواں دھار تقریر یا دھرنا اِس سوال کا جواب بہر حال نہیں ہو گا۔

۲) اور جہاں تک برسر اقتدار طبقوں سے شریعت نافذ کروانے کا تعلق ہے، تو اس کے لیے ایک عمومی انداز اختیار کرنا اپنی جگہ درست۔ لیکن عملاً چند ایسے مطالبے ہی (نفاذِ شریعت کے حوالے سے) سامنے لائیے،[10] یا کوئی ایک ہی اچھا سا مطالبہ سامنے لائیے جس کو حکمران طبقوں کی طرف سے انکار ہونا معاشرتی طور پر شدید اچھنبے کی بات ہو، جس کی بنیاد پر آپ یہاں کے عوامی طبقوں کو زیادہ سے زیادہ موبلائز mobilize کر سکتے ہوں (اِس موبلائز کرنے میں گو آپ کے کچھ اور تحریکی مقاصد بھی حاصل ہو رہے ہوں گے، اور اس پر پس و پیش کرنے میں حکمران طبقے معاشرے کے اندر زمین کھونے (ground lose کرنے) لگیں گے۔ اور اگر پس و پیش نہیں کرتے تو اسلامی سیکٹر کی ایک پیش قدمی سامنے آتی ہے۔ گویا ہر دو صورت آپ win win پوزیشن میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ یہ ایک مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ریاست اقامتِ صلاۃ کے معاملہ میں اپنی 'شرعی و دستوری' ذمہ داری پوری کرے۔ فی الحال کے لیے آپ اس کے سوا کوئی مطالبہ نہ کریں، البتہ اِس ایک بات پر خیبر تا کراچی قوم کو کھڑا کر دینے کی تحریک چلا دیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر لبرل ایجنڈا کے لیے کارآمد (substantially effective)

---

[10] پیچھے جو وضاحت ہو آئی ہے اس کی روشنی میں: ایسے کوئی مطالبے کرنا یا ایسی کوئی تحریک چلانا (نفاذِ شریعت کے حوالے سے) ہم ایک دعوتی جماعت کے حق میں تجویز کریں گے نہ کہ ایک سیاسی جماعت کے حق میں، اندریں حالات۔ کیونکہ ایک سیاسی جماعت کے لیے فی الوقت ہماری تجویز یہی ہو گی کہ وہ 'مذہب' کا لمبا چوڑا نام لیے بغیر، اور کوئی مخصوص 'مذہبی' فیس face اختیار کیے بغیر، یہاں سیاست کے میدان میں کچھ راستے بنائے۔ تفصیل کے لیے اِس فصل کا دوسرا مبحث پڑھیے۔

’اسلامی‘ دلیلیں فراہم کرنے والے (المورد ایسے) طبقے تک آپ کی مخالفت پر دلیل کا بازار گرم نہیں کر سکیں گے (ان کی اب تک کی تحقیق یہی ہے کہ ریاست یہاں لوگوں کو نماز کا پابند کرنے کی پابند ہے۔ کم از کم اِن سے وہ تو لیں!)۔ البتہ اس ایک بات میں لبرل عقیدے کا پورا ابطال ہے (کہ ہر آدمی اپنے ذاتی اعمال میں سو فیصد آزاد ہے)۔ نیز سرکاری سطح پر اقامتِ صلاۃ کا بندوبست ہو جانے کی صورت میں یہاں کے معاشرتی خدوخال دنوں کے اندر بدلتے ہیں (یہاں ایک ’مذہبی‘ معاشرہ آپ سے آپ تشکیل پا جاتا ہے)۔ البتہ حکومت کی جانب سے اس کو انکار ہو جانے کی صورت میں بھی اسلامی سیکٹر کو ایک مومنٹم ملتا ہے۔[11] (اصل دیکھنے کی چیز یہ ہو گی کہ کس

---

[11] بغور دیکھیں تو قادیانیوں کو کافر قرار دلوانے کی تحریک جو دو عشرے چلتی رہی، صرف اِس ایک نقطے پر تھی۔ اس کے ذریعے آپ نے گویا امت کی ایک دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ یہ ایک مطالبہ ایسا تھا جس پر ایک کامیاب rallying کرنے کے نتیجے میں اسلامی سیکٹر معاشرے کے اندر مسلسل ایک مومنٹم حاصل کر رہا تھا اور فریقِ مخالف ایک مشکل پوزیشن میں چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کو گھٹنے ٹیک دینا پڑے۔ لیکن اسلامی سیکٹر کیونکہ کسی منصوبہ بندی کے تحت یہ نہیں کر رہا تھا لہٰذا اس کے بعد وہ اپنا کوئی اگلا پتہ نہ پھینک سکا۔

خلاصہ یہ کہ ”پوری شریعت“ کا مطالبہ ایک عمومی انداز تک ہی محدود رہنا چاہئے؛ گو اس میں بھی بھرپور زور ہونا چاہئے۔ البتہ عملاً چند (یا ایک ہی) اسلامی مطالبہ ایک وقت میں سامنے لائیے۔ اس (ایک مطالبے) کا انتخاب کرنے میں البتہ بھرپور سماجی و سیاسی بصیرت کا ثبوت دیجئے۔ فریقِ دیگر جب شریعت کو اون own نہیں کر رہا اور وہ شریعت کو جو دے گا ازراہِ مجبوری دے گا تو اصل چیز ہوئی اُس کے لیے ایک مجبوری کھڑی کرنے میں کامیابی پانا (شریعت کے لیے اس کے بغیر یہاں آپ کو جگہ نہیں مل سکتی)۔ یہ مجبوری پیدا کرنے کی کوئی صورت عوامی موبلائزیشن اور برسرِ اقتدار طبقوں

کامیابی کے ساتھ آپ نے اس کے لیے rallying کی)۔ یہ (اقامتِ صلاۃ) محض ایک مثال ہے۔ انسدادِ فحاشی و عریانی اس کی ایک اور مثال ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کی بجائے آپ کچھ اور چیزیں دیکھ سکتے ہیں، جن کے حوالے سے حکومت کے پاس یہ کم سے کم گنجائش ہو کہ اپنی کوئی 'مجبوری' بتائے یا نام ہی کو عذرِ لنگ پیش کر سکے، یا لبرلز کے 'اسلامی' وکیل اس پر زیادہ دلیلیں لا سکیں۔ یہاں سے آپ فریقِ مخالف کو ایک ایسی پوزیشن میں لا سکتے ہیں کہ وہ ہر دو صورت آپ کے اسلامی ایجنڈا کی پیش رفت کروانے پر مجبور سا ہو جائے اور آپ ہر دو صورت معاشرتی زمین پر پیش قدمی کریں۔

۳) یہ گردان rhetoric کہ ستر سال گزر جانے کے باوجود حکمران طبقوں نے اسلام کے نفاذ کی جانب کوئی توجہ نہیں دی... عوامی کھپت public

---

کے اچھے عناصر کو شریعت کا طرفدار بنانے کے علاوہ فی الوقت آپ کو میسر نہیں ہے۔ اب جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو انہیں کوئی ایک آدھ موٹی tangible بات زیادہ آسانی سے سمجھ آتی ہے بہ نسبت کسی بڑے پیکیج کے۔ دوسری جانب حکومت بھی کسی ایک آدھ بات کو انکار کر کے زیادہ بری پڑتی ہے جبکہ وہ بات بھی ایسی ہو کہ حکومت کے پاس اسے ناں کرنے کے کم سے کم بہانے ہوں۔ خود برسر اقتدار طبقوں میں کسی ایک آدھ بات کے حق میں رائے ہموار کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت ایک بڑا پیکیج منوانے کے۔ یہاں (برسر اقتدار طبقوں میں) آپ نے اپنے ہم خیال پیدا کرنا ہوتے ہیں، اور جو ہم خیال نہ ہو سکیں ان میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اور ایسے لوگوں کو سنگل آؤٹ single out کرنا ہوتا ہے جو تن کر شریعت کے مقابلے پر آئیں۔ [واضح رہے، شریعت کی ایک بات بھی شریعت ہی ہے؛ اور یہ مسئلہ اول تا آخر ایمان کا ہے، اس میں ایمانی اسلوب ہی اختیار کرنا چاہئے، جس میں حکمران طبقوں کے ساتھ قولِ لیّن (نرم اندازِ خطاب) کو آخری حد تک ترجیح دی جاتی ہے فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ]۔

consumption کے لیے شاید بری نہیں (کیونکہ اس کے اندر کوئی غلط بیانی بہرحال نہیں ہے)۔ لیکن فرزندانِ تحریک کی داخلی کھپت internal consumption کے لیے یہ rhetoric تباہ کن ہے۔ یہاں تو یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ: اگر حکمران طبقوں کے تیور آپ کو ستر سال سے معلوم ہیں تو اسلامی تحریک کے پاس اِس صورتحال کے ساتھ پیش آنے کے لیے کیا لائحۂ عمل تھا؟ اور اگر حکمرانوں کے تیور اب بھی ویسے ہیں تو کیا ستر سال بعد بھی آپ یہی rhetoric دہرائیں گے کہ 'حکمران طبقوں نے اسلام کے نفاذ کی جانب کوئی توجہ نہیں دی'!؟ اور اگر ایسا ہے، تو وہ رخنہ جو اسلامی تحریکی عمل کو یہاں پُر کرنا ہے بس یہ rhetoric دہرانا ہے کہ 'حکمران طبقوں نے یہاں نفاذِ اسلام کی جانب کوئی توجہ نہیں دی'؟ تحریکی عمل میں یہاں ہم جس مبحث کی داغ بیل ڈالنا چاہیں گے وہ یہ کہ: 'مطالبات کی زبان' صرف ابلاغی کھپت کے لیے ہو۔ البتہ فرزندانِ تحریک کی توقعات کا کوئی رشتہ اِس زبان کے ساتھ نہ رہنے دیا جائے۔ اِس دائرہ میں: اُس rhetoric کو اِس rhetoric کے ساتھ بدل دیا جائے کہ: وہ سماجی عوامل جو ذوالفقار علی بھٹو ایسے دین بیزار آدمی کو بھی کچھ اسلامی اقدامات پر مجبور کر دیتے ہیں،[12] ویسے سماجی عوامل ہاتھ میں کرنے کے لیے کیا کیا لائحۂ عمل اور کیا کیا مؤثر اقدامات خود ہماری طرف سے ہو پائے ہیں؛ اور اِس معاملہ میں ہماری کیا منصوبہ بندی رہی ہے؟ ذہنوں پر چھا جانے اور شریعت کے حق میں ایک

[12] کسی اور مقام پر یہ بات ہم نے تفصیل سے کی ہے مگر یہاں اتنا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ یہ اسلامی اقدامات آپ نے پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کے بل پر نہیں کروائے تھے، بلکہ بہت تھوڑی سیٹیں رکھتے ہوئے اتنا کچھ لینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ بس اِسی فن میں آپ کو طاق ہونا ہے۔

سماجی فضا تشکیل دینے کے لیے آئندہ بھی ہمارے پاس کیا انتظام ہے اور اس میں کہاں تک یہ جان ہے کہ "شریعت" یہاں کا سکۂ رائج الوقت بنا دی جائے؟ "بل" اور "آرڈیننس" تو ایک طویل عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، وہ خالی آواز دینے سے تو نہیں آجاتے! وہ "طویل عمل" بھلا ہمارے ہاں کہاں ہے؟

٤) جب یہ طے ہے کہ "شریعت" کو لامحالہ اپنی پشت پر ایک سماجی قوت درکار ہے، اور اس کے بغیر شریعت کے خیر خواہ بھی اقتدار میں ہوتے ہوئے شریعت کے لیے بہت کچھ نہ کر پائیں گے... تو یہ درست نہیں کہ آپ اپنی تمام اسلامی امیدیں یہاں کی 'مذہبی' جماعتوں کے انتخابات جیتنے کے ساتھ وابستہ کریں (اندریں حالات)۔ ہماری وہ دلیل کہ 'پارلیمنٹ' کو مکمل طور پر اسلام دشمن عناصر کے سپرد ہو جانے دینا یہاں باطل کو کھل کھیلنے کا موقع دینے کے مترادف ہو گا... ہماری یہی دلیل کچھ مخصوص حالات میں یہ تقاضا بھی تو کر سکتی ہے کہ یہاں مسلم لیگ اور تحریک انصاف وغیرہ ایسی جماعتوں میں لبرلز کو دندنانے اور اس پوزیشن میں آنے دینا کہ وہ ان جماعتوں کا رخ دین دشمنی کی طرف کر دیں، یہاں باطل کو کھل کھیلنے کا موقع دینے کے مترادف ہے۔ آخر یہی جماعتیں تو ہیں جنہیں حکومت اور اپوزیشن میں رہتے ہوئے حالیہ برسوں میں ملکی پالیسیوں پر اثرانداز ہونا ہے۔ ان پارٹیوں کو بھی دین دشمنوں کی کھل کھیل کے لیے کیسے چھوڑ دیا جائے؟ خود ان کے اندر جو ایک غیر معمولی تعداد دین سے ایک گونہ وابستگی رکھنے والوں کی پائی جاتی ہے اس کے دینی جذبہ کو کارآمد بنانے کی کوئی دانشمندانہ اسکیم بھی کیوں نہ اختیار کی جائے اور خود یہیں پر لبرلز کے راستے کیوں نہ (ممکنہ حد تک) تنگ کیے جائیں؟ آخر کیا تُک ہے کہ پوری کی پوری ایک پارٹی کو تو لبرلز کی گود میں پڑ

جانے دیں اور پھر اُس کے فیصلوں کے ساتھ اُس وقت جا کر الجھیں جب ان پر علمدرآمد کی نوبت ہو، وہ بھی پارلیمنٹ میں اپنی شدید ناکافی تعداد کے ساتھ! آخر جب یہ فیصلے پارٹیوں کے اندر لیے جاتے ہیں (بے شک وہاں پر فردِ واحد حاوی ہو) اُن پر وہیں اثر انداز ہونے کی کوئی (ممکنہ) کوشش کیوں نہ ہو؟ چلیے کچھ نہ کچھ مزاحمت تو انہیں وہاں پر دی جائے۔ غرض "سماجی عوامل" کو ہاتھ میں کرنے کی یہ بھی ایک جہت ہے جو اندریں حالات توجہ کی مستحق ہو سکتی ہے۔ پس بے شمار سمتوں سے آپ کو "شریعت" کے حق میں ایک سماجی قوت اکٹھی کرنا ہو گی؛ اگر مقصد آپ کا یہاں "شریعت" کے لیے ایک ساز گار فضا قائم کرنا اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش ڈھونڈنا ہو۔ نفوذ penetration کے ایسے ایریاز areas کی تلاش اگر شروع ہو جائے تو دین سے جذبہ پانے والے دعوتی اور سیاسی عناصر کو اپنے سرگرم ہو جانے کے ان گنت محاذ ملیں گے اور مختلف لوگ یہاں مختلف مورچے سنبھالتے چلے جائیں گے۔ دینی ایجنڈا رکھنے والوں کی ایک فوجِ ظفر موج یہاں ہر جگہ اپنے لیے "کام" دیکھے گی۔ یوں اسلام کی کشتیاں اوپر لے جانے کے لیے یہاں ایک نہایت متنوع محنت سامنے آنے لگے گی۔ اصل چیز مجموعی طور پر اسلامی سیکٹر کو صورتحال پر حاوی کروانا ہے نہ کہ اس کی کسی خاص صورت پر اصرار کرنا۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ لوگوں کی ہمدردیاں لینا ان کے ساتھ پیار اور ملاطفت کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی کے بڑے پر طعن و تشنیع کرنا دل کی بھڑاس نکالنے کی تو ایک آسودہ صورت ہے لیکن اُس کی محبت اور ہمدردی لینے کا موقع یقیناً ضائع کروا دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عکرمہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ابو جہل تک کے لیے برے الفاظ ممنوع ٹھہرا دیے تھے۔ دل جیتنا، نفوس کے

ساتھ معاملہ کرنا پوری ایک سائنس ہے۔ یہاں اسلامی ایجنڈا کو اعلیٰ نتائج لے کر دینے کے لیے آپ کو پہاڑ ایسے حوصلے چاہئیں ہوں گے۔

۵) سماجی مقوّمات social essentials کو ہاتھ میں کرنے کا یہ قاعدہ اگر طے ہو جاتا ہے تو ایک عربی مقولہ بھی اس کے ساتھ رکھ لیجئے: إذا أَرَدْتَ أن تُطَاع، فَاسْئَلْ مَا يُسْتَطَاع "اپنی بات منوانا چاہتے ہو تو وہ بات کرو جو پوری ہونے والی ہو"۔ یہاں سے؛ماحول میں دستیاب سماجی مقوّمات social essentials کو دیکھنے کی دو جہتیں بیک وقت سامنے آئیں گی:

أ. معاشرے میں موجود مساجد، اذانوں، نمازوں اور دیگر دینی مظاہر کو ایک قیمتی اثاثے asset کے طور پر دیکھنا۔ یہ مظاہر چاہے مزید آپ کو کچھ بھی نہ دیں، پھر بھی ان کو اپنی ایک قیمتی چیز کے طور پر لینا۔ اس کو اگر بہتر نہیں کیا جاسکتا تو اس حالت میں بھی اس کو شدید قدر کی نگاہ سے دیکھنا اور اِس حالت میں بھی اس کی حفاظت ہی کے لیے پریشان ہونا۔ تصور کیجئے ان سب کاموں کا بیڑا ابھی یہاں پر آپ ہی کو اٹھانا پڑتا! بڑی اچھی بات ہوتی لوگ قرآن کو سمجھ کر پڑھتے۔ اس کے لیے ڈھیروں پروگرام بھی سامنے آنے چاہئیں۔ لیکن بڑی ہی خوشی کی بات ہے لوگ بے سمجھے سہی، قرآن کو پڑھتے ہیں۔ یہاں کی سماجی تشکیل میں اس کا بھی ایک اثر ضرور ہو گا اور عند اللہ یہ اس پر ماجور بھی ضرور ہوں گے۔ اور ڈریں اس بات سے کہ یہ بے سمجھے قرآن پڑھنے والے بھی معاشرے میں کم ہونے لگیں۔ تصور کریں تب اِس معاشرے کا کیا بنے گا۔ خصوصاً ایک عجمی معاشرے میں تو یہ غنیمت ہے۔ نبی ﷺ کے ساتھ لوگوں کی عقیدت چاہے کچھ بدعات لیے ہوئے کیوں نہ ہو

اُس ملحد عفریت کے مقابلے پر جو تیزی کے ساتھ آپ پر مسلط کرایا جا رہا ہے، بسا غنیمت ہے۔ تراویح کے یہ ٹھٹھ، چاہے ان میں سے ایک بھی شخص یہ سمجھ نہ رہا ہو کہ یہاں کیا پڑھا جا رہا ہے، دل کو باغ باغ کر جانے والی چیز ہے۔ یہ سب خدا سے محبت کرنے والے اور آخرت کے طلبگار یہاں قطاریں بنائے کھڑے ہیں۔ یہ جیسے بھی ہیں، اپنی تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ مؤذن کی صدا جانفزا ہے، چاہے کوئی ایک بھی یہاں نہیں سمجھ رہا کہ ان کلمات میں کیا شاندار حقیقتیں بیان ہو رہی ہیں اور وہ ان کی روزمرہ زندگی میں کیا پیغام رکھتی ہیں۔ خطۂ بلقان یا وسطِ ایشیا کے بعض علاقوں یا برما یا مشرقی ترکستان وغیرہ میں معاملہ اس سے بھی دگرگوں ہے تو ہماری نظر کی یہ جہت وہاں اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ یہاں نماز روزہ تک ایک بڑی سطح پر غائب ہے اور رہن سہن میں کافروں سے شاید ہی کوئی فرق باقی ہے، اور یہ بات ہمیں خون کے آنسو رلاتی ہے، تو یہاں کے ایک عام آدمی یا حتیٰ کہ ایک 'بےپرد' عورت کی زبان پر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں "لاالٰہ الااللہ محمدٌرسول اللہ" سن کر اور اِس کلمہ کے لیے اُس کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھ کر خود ہماری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں۔ بےشک یہ چیز "انقلاب" اور "اسلامی نظام" کے لیے انتہائی ناکافی ہے مگر اس پر بھی ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہتی اور کچھ وقت کے لیے ہمیں صرف یہ فکر ہوتی ہے کہ یہ چیز بھی کیسے بچی رہ سکتی ہے۔ یہ ہے "سماجی نظر" جسے 'انقلابی' یا 'سیاسی' اپروچ نے کسی حد تک ہمارے یہاں متاثر کر دیا ہوا ہے اور جس کے باعث 'نظام' ہمارے پیراڈائم میں ضرورت سے کچھ زیادہ

جگہ لے گیا ہے۔ حالانکہ دنیا کے اندر بھی "ڈیموگرافی" میں یہ سب چیزیں اپنا وزن رکھتی ہیں اور آخرت کے اندر بھی کچھ خاص احوال میں موجبِ نجات ہیں۔ غرض ان سب اشیاء کو اپنے اُس بچے کھچے اثاثے کے طور پر لینا جو اِس وقت ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ اپنی جتنی تعمیرات ہونی ہیں، اسی سے ہونی ہیں۔ اور کہیں سے ہمیں یہ مواد نہیں ملنا۔

یہاں ایک اہم نکتہ ہے: موسیٰ علیہ السلام کے احوال قرآن میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ بلکہ بہت سی باتیں مکرّر آئی ہیں۔ بنی اسرائیل کو بڑی شدید سرزنش بھی جابجا وارد ہوئی ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کو سرزنش کا جتنا بیان ہے وہ فرعون سے خلاصی پانے کے بعد کا ہے۔ کیا مصر میں اُن کی سب خصلتیں ٹھیک ہی ہوں گی اور وہاں ان کی تمام زندگی اسلام پر قائم ہی ہو گی؟ اسلام پر قائم ہوتے تو فرعون سے جوتے ہی کیوں کھاتے۔ لیکن وہاں اُنہیں وہ جس حال میں ہیں بظاہر قبول کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ڈانٹ ڈپٹ بھی وہاں نہیں ملتی (صرف ہمتیں بڑھانے اور اعتماد دلانے والا اسلوب ملتا ہے)۔ حالانکہ کیسا کیسا زوال نہیں آیا رہا تھا وہاں اُن پر۔ اسے کہتے ہیں سماجی نظر۔ اس حالت میں امت پر شرطیں عائد نہیں کی جاتیں۔ اُن سے جو مل سکتا ہے وہ لیا جاتا ہے۔ إذا أرَدْتَ أن تُطَاع، فَاسْئَلْ مَا يُسْتَطَاع اور ان کو ایسی اسکیمیں بنا کر دی جاتی ہیں جو ان کے انجام دینے کی ہوں۔

یہ ہوا ماحول میں دستیاب سماجی مقوِّمات کو ایجابی انداز میں لینا۔

ب۔ دوسرا ہے اِن سماجی مقوِّمات social essentials کو کارآمد بنانا۔

لوگوں سے ایسے مشکل تقاضے کیے بغیر جو وہ ادا کرنے والے نہیں،

آپ کو انہیں کچھ ایسی اسکیمیں بنا کر دینا ہوتی ہیں جو ایک وسیع تر تناظر میں in the long run معاملے کی مجموعی تصویر بدل کر رکھ دینے والی ہوں۔ یہاں اگر آپ عام لوگوں کو، وہ جیسے ہیں کی شرط پر، اپنے ساتھ انگیج engage نہیں کر سکتے اور یہاں دستیاب پوٹینشلز کو کوئی کارآمد راستہ نہیں دکھا سکتے تو آپ کی قیادت اور منصوبہ بندی میں ضرور کوئی خلل ہے۔ اِس کا گلہ آپ اُن سے نہیں اپنے سے کریں۔ ہر آدمی سے طلب کرنے کے لیے آپ کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہئے اور وہ ایسا آسان کام ہو جو اُس کے کرنے کا ہو۔ کم از کم بھی، اللہ اور اُس کے رسول سے اپنی عقیدت نمایاں کرنے کے کچھ مظاہر تو اُس کو ضرور مہیا کرنے چاہئیں۔ ایک مجموعی تصویر میں یہ بات بھی ایک کمال اثر رکھے گی۔ ہمارے ائمۂ سنت امت کے فاسق سے فاسق طبقوں کے ساتھ بھی ایک کمال کمیونی کیشن رکھتے اور گویا ایمان کے کچھ سماجی تقاضے اُن سے بھی ادا کروا لیتے تھے۔ شیخ سفر نے کئی مقامات پر اس جانب خصوصی توجہ دلائی ہے۔ امت کے یہ 'فاسق فاجر' بھی باطل کے ساتھ ہماری جنگ میں ایک فریق بن سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں کمیونی کیشن کا ڈھنگ آ جائے اور ہر آدمی کے لیے ہمارے پاس خدمتِ اسلام کا 'ایک ہی' پیکیج نہ ہو۔ ٹھیک ہے کچھ مخصوص لوگوں کے سامنے آپ یہ تقاضا رکھ لیں کہ ہماری جماعت میں آئیں اور اس کے پورے پروگرام کو سمجھ کر اختیار کریں اور اس کی 'منظم' جدوجہد میں باقاعدہ شریک ہوں۔ مگر سامنے کی بات ہے، یہ تقاضا تو چند ہزار لوگ ادا کر لیں تو بڑی بات ہے۔ آپ خود جانتے ہیں ایک بڑی تعداد اِس پر آنے

کی نہیں۔ آخر اُن کے لیے آپ کے پاس کیا ہے؟ کوئی ایسی چیزیں جو اُن کے بھی کرنے کی ہوں اور وہ چیزیں یہاں کی مجموعی تصویر پر اثرانداز ہونے والی بھی ہوں۔ اگر آپ ایک قیادت ہیں تو ہر کسی کو دینے کے لیے آپ کے پاس کچھ کام ہونا چاہئے۔ پوری قوم کی قیادت کیجئے۔ بصورتِ دیگر آپ اُن چند سو یا چند ہزار لوگوں کو بھی قوم سے کاٹ ڈالیں گے جو آپ کے ساتھ چلنا قبول کر چکے ہوں۔ اور عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے۔ یہاں ہر جماعت معاشرے سے کٹی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ہر جماعت کے پاس اپنے 'کارکن' کو دینے کے لیے کام ہے "معاشرے" کو دینے کے لیے کوئی کام نہیں۔ بھئی یہ عام آدمی آپ کی جماعت جوائن کرنے پر آمادہ نہیں۔ ووٹ آپ کو دینے والا نہیں۔ ہے یہ آپ کی امت۔ اللہ اور اس کے رسول سے محبت اس کو بھی ہے۔ کیا واقعتاً اس کو ایمان کے کچھ تقاضوں کے ساتھ اینگیج engage کرنے کی کوئی صورت آپ نہیں دے سکتے۔ یہاں آپ کو خاصا حوصلہ مند ambitious اور خاصا تخلیقی creative ہونا ہوتا ہے اور 'تنظیم' سے اوپر اٹھ کر "امت" کی سطح کے کچھ پروگرام اور منصوبے سامنے لانا ہوتے ہیں۔ "ایمان" اور "کفر" کی اس جنگ میں آپ کو لہجے ہی ایسے لانے ہوں گے جو معاشرے کے زیادہ سے زیادہ افراد کے حق میں شمولیت انگیز inclusive ہوں نہ کہ امتیازی اور باہر رکھنے والے exclusive۔ یہ بات ہو جائے تو بس یہ میدان آپ کا ہے۔ ان شاء اللہ

"کیوں وہ کہتے ہو جو کرتے نہیں"؟

مضامین

استفادہ: مریم عزیز

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصف:2)

"اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں"

كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصف:3)

"تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے"

شاذ و نادر ہی لوگ اپنی کہی ہوئی ہر بات پر پورا اُترتے ہیں۔ یہ ہماری انسانی کیفیت کا حصّہ ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ قریب قریب ہمیشہ اپنے قول کو سچ کر دکھاتے ہیں اس حد تک کہ ان کے قول اور فعل میں تضاد تقریباناپید ہوتا ہے۔ کچھ لوگ قول واقرار میں وقت ضائع کئے بغیر عمل میں جت جاتے ہیں۔ ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بولنے میں تو جلدی کرتے ہیں مگر جب کام کا وقت آتا ہے تو جیسے تیسے کر کے سر سے اتارنے کی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو واقعتا خلوصِ دل سے وعدہ کرتے ہیں مگر اسے پورا نہیں کر پاتے۔ اور پھر ایسے لوگ بھی جن کی بات کا اعتبار کرنا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے، کیونکہ ان کی نیت کبھی بھی سچی نہیں ہوتی۔

لوگوں میں پائے جانے والے قول و فعل کے تضاد کا یہ منطقی تجزیہ ہے۔ کچھ لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس میں تجزیہ کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ایسی وجوہات کا ہونا تو ظاہر سی بات ہے۔ تاہم فہم رکھنے والے اذہان اس مضمون کا عنوان پڑھ کر ہی غور و فکر میں ڈوب گئے ہوں گے۔ اور اس مضمون کے ابتدائی سطور پڑھ کر ہی کسی نہ کسی درجے کی ذاتی

کشمکش میں ضرور مبتلا ہو گئے ہونگے۔ ہمارا مقصود ہی یہی ہے۔ کسی زمانے کی کہاوت کا مفہوم ہے کہ اپنے نفس کی خود خبر لینے والا شخص ہی احترام کے لائق بنتا ہے۔

اکثر اوقات ہم کچھ کہنے یا کرنے سے پہلے کچھ خاص سوچنے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اپنے الفاظ اور عادات کو عقل کی ناپ تول سے گزارنا تو کجا ہم ہرگز خود کو خطا پر تصوّر نہیں کرتے۔ حالانکہ ایسا بالکل ممکن ہے کہ کبھی ہم بھول چوک کا شکار ہو جائیں۔ کبھی مشکل حالات مجبوری بن جائے یا خدانخواستہ کبھی گناہ کی جانب قدم بڑھا بیٹھیں۔ اللہ سبحانہ تعالی فرماتا ہے: "تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے " سورۃ الصف ۲،۳

عموما ایسے لوگوں کو ستائش کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو اپنی نصیحت پر سب سے پہلے خود عمل کیا کرتے ہیں۔ اسی لئے کسی کو "قول کا آدمی" کہنا بہت ہی اچھی تعریف میں شمار ہوتا ہے۔ کر دکھانے والے انسان کو ایک باتونی شخص سے بالکل مختلف نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ کرکے دکھانے والے کی عزت اور اعتبار ہوتا ہے۔ خلقِ خدا ایسے اچھے آدمی کے ساتھ خوشی سے معاملات کرتی ہے۔ لسان طرار شخص اپنے اعمال کی غیر موجودگی کے سبب لوگوں کی نظروں میں اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے۔ کیونکہ دنیا جان جاتی ہے کہ ایسے فرد کے الفاظ میں کوئی وزن نہیں۔

کام کے آدمی کو اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ عمل کرنے کی عادت بنالی جائے تو کوئی بھی وعدہ ایفا ہونے سے نہ رہے۔ فلسفیوں نے دنیاوی خوشی حاصل کرنے کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر سچّی بات تو یہ ہے کہ خوشی کامیابی کا دوسرا نام ہے۔ خوشی کا یہ تصوّر حرکت میں برکت کے اصول کے گرد گھومتا ہے۔ بارآور محنت کامیابی اور خوشی کی ضمانت ہے۔ ہمیں ضرور منصوبہ بندی کر کے کام میں لگنا چاہیئے مگر خام منصوبہ سازیوں میں سارا وقت ضائع نہ ہو۔ کئی ایسی مثالیں نظروں سے گزرتی ہیں جہاں میٹنگوں اور تقریروں میں قیمتی وقت برباد کیا جاتا ہے بغیر کوئی عملی صورت سامنے آئے۔

ہماری قوّت گویائی کوئی معمولی بات نہیں۔ بلاشبہ ہمارا انسان کہلانا ہماری گفتگو اور سوچنے سمجھنے کی اہلیت کی وجہ سے ہے۔ کلاسیکی فلاسفروں نے تو انسان کو "منطقی جانور" تک کہا ہے۔ تاہم اس متنازعہ بحث میں پڑنے کی بجائے صرف اتنا کہیں گے کہ اگر ہم انسان کی بولنے کی صلاحیت کو اس کے عمل کے ساتھ نہ جوڑیں تو ہمارا انسانیت کا زعم کھوکھلا ہے۔

وہ لوگ جو دنیا کے سامنے رول ماڈل کے طور پر آئیں، ان کی زندگیاں ان کے اعمال ہیں۔ اور اگر ان کے اعمال بد ہوں تو نہ صرف وہ اپنی اور دنیا کی نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں بلکہ شائد اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی۔

قول کے کھرے آدمی کے ساتھ لوگ اطمینان محسوس کرتے ہیں چاہے اُس کی کہی ہوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ وہ دھوکے میں نہیں رہیں گے۔ چنانچہ وہ اس کی خلاف توقع فیصلے کا بھی احترام کرتے ہیں۔

کام کا دھنی انسان اپنی اونچی سوچ کی وجہ سے محنتی ہوتا ہے۔ اونچی سوچ والا شخص دوسروں کی فکر اور خبر گیری کرنے والا مثبت روّیے کا حامل ہوتا ہے۔ اور وہ کم پر ٹرخانے کو پسند نہیں کرتا۔ نہ وہ دوسروں سے ایسا مطالبہ کرتا ہے جو وہ خود نہ کر سکے اور نہ ہی دوسروں کو ایسے کام سے منع کرتا ہے جسے وہ خود منع نہ ہوتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کو نصیحت کا کچھ یوں بتلایا:

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (هود:۸۸)

"میرا یہ ارادہ بالکل نہیں کہ تمہارا خلاف کر کے خود اس چیز کی طرف جھک جاؤں جس سے تمہیں روک رہا ہوں، میرا ارادہ تو اپنی طاقت بھر اصلاح کرنے کا ہی ہے۔ میری توفیق اللہ ہی کی مدد سے ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی

طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔

منزل کی طرف راہی اگرچہ ٹھوکر بھی کھالے، بیٹھے رہنے والوں سے بہتر ہی ہوتا ہے۔ دوڑنے والا شخص اگر گر بھی جائے تو کیا، اس کی سعی چلنے والے سے تو زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک کشتی سمندر میں ڈوبنے کے خطرے سے دوچار رہتی ہے، مگر سوچئے کشتی ساحل پر لگے رہنے کیلئے تو نہیں بنائی جاتی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين

"تکفیر" اور "عدم تیسیر" کا یہ ڈسکورس ظلم بھی ہے اور جہالت بھی

مضامین

حامد کمال الدین

تکفیر کی بات ہے تو یہ ظالم قادیانیوں کی تکفیر تک سے لوگوں کو بِد کا کر رہیں گے۔ کیونکہ ان شدت پسند حرکتوں کے نتیجے میں، دین میں جو جائز تکفیر ہے اس پر ہی بطورِ اصول سوالیہ نشان اٹھ آئیں گے، اور وہ 'جوابی بیانیہ' بروقت آٹپکے گا جس سے قادیانی بھی خدانخواستہ 'مسلم مسالک' میں سے ایک مسلک گنا جائے گا۔

جہاد کی بات ہے تو یہ انگریز کے خلاف ہوتے رہنے والے جہاد سے بھی آپ کی توبہ کروائیں گے، روس کے خلاف ہوتے رہنے والے جہاد سے بھی، اور ہندو اور صیہونی کے خلاف ہوتے چلے آنے والے جہاد سے بھی۔ اور آئندہ کے لیے استعمار کا راستہ صاف!

اسلامی اصطلاحات کی بات ہے تو یہ "حاکمیتِ خداوندی"، "شریعت"، "خلافت" وغیرہ ایسے سب الفاظ کو 'خودکُش بمبار' کا ہی ہم معنیٰ بنا کر چھوڑیں گے۔ یعنی ان لفظوں کا منہ پر آنا ہی خطرے کی علامت۔ واقعتاً ایسا کر بھی دیا گیا ہے۔ دیندارو! اس کے بغیر تم یہ الفاظ کب ترک کرنے والے تھے؟!

غرض وہ سب باتیں جو انگریز اور اس کے منظورِ نظر ٹولے کو عالم اسلام میں چُبھتی تھیں، مسلمانوں کو ان سے توبہ کروا دینے کا ایک نرالا طریقہ دریافت ہوا ہے: پہلے شدت پسند "سر پھرا بیانیہ"... اور

اس سے جب آپ ادھ موئے ہو چکیں تو پھر جدت پسند ”جوابی بیانیہ“۔ اور کلاسیکل اسلام کا دھڑن تختہ!

آپ غور فرمائیے تو **تکفیر اور عدم تیسیر** کی یہ شدت پسند تحریک بھی دراصل اسلام کے کلاسیکل علم و علماء کے خلاف ایک بغاوت ہے اور **'جوابی بیانیہ' والی یہ جدت پسند تحریک** بھی۔ درحقیقت یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اور اب تو مجھے یہ بھی بعید نظر نہیں آتا کہ ان دونوں کا 'مصدرِ الہام' بھی کوئی ایک ہی ڈیسک ہو۔

لوگوں کو اسلام سے خارج ٹھہرانا مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ سے ایک نازک مسئلہ کے طور پر لیا جاتا رہا ہے۔ عموماً؛ امت میں جتنا کوئی سنگین اور نازک مسئلہ پایا گیا اتنا ہی اس کی بابت زیادہ اونچی سطح کے علماء کی جانب رخ کیا جاتا رہا۔ اس پر زیادہ گہری نظر رکھنے والوں کی آراء طلب کی گئیں اور ایک زیادہ اونچی سطح پر علمی رائے پکانے کی کوشش کی گئی۔ غرض جتنا کوئی نازک مسئلہ، اتنا اونچی سطح کے فقہاء اور اتنا اونچی سطح کا اجتہاد۔ ”تکفیر“ کا یہ مسئلہ جو آج ہماری چوپالوں اور چیٹ روموں میں پھرتا ہے، بلاشبہ حق رکھتا تھا کہ اس کے ساتھ بھی یہی علمی معاملہ کیا جاتا۔ پھر جب اس کے ساتھ خون مباح کرنے کا رجحان بھی تیزی کے ساتھ بڑھا تو مسئلہ کی نزاکت دوچند ہو گئی۔

پھر اس کے ساتھ ایک اور جہت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ہمارے بعض اہل علم نے پچھلے کچھ عشروں کی پیشرفت کا بغور ملاحظہ کرنے کے بعد جو کچھ نتائج کشید کیے ہیں ان میں سے ایک یہ کہ مسلم نوجوان میں ”تکفیر“ کے رجحانات عام ہونے کے پیچھے دشمنانِ اسلام کی کچھ انجنئرنگ بھی ہوتی رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے مصر کی جیلوں میں یہ پودا جس محنت سے کاشت کروایا گیا اس کے ڈانڈے بہت پیچھے تک جاتے ہیں۔ خدانخواستہ، مقصد یہ نہیں کہ اس فکر

کے سب حاملین کسی کے پروردہ ہیں۔ بلکہ مقصد یہ کہ ہمارے ہاں فکری رجحانات کی ساخت کرنے میں ہمارے گھر کے بھیدیوں نے کچھ خاصے دُوررَس کام بھی انجام دیے ہیں۔ یہاں ایک ایسا ایندھن ایجاد میں آچکا ہے کہ وہ کسی بھی باریک اَن دیکھی 'تِیلی' لگنے سے جل اٹھتا ہے اور ہمارے وجود کے کچھ صالح ترین حصوں کو کو خاکستر کر جاتا ہے۔

کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ "تکفیر" اگر ان نازک مسائل میں سے ہے جن کے لیے ایک اعلیٰ سطحی اجتہاد درکار ہے تو آخر کس نے روکا تھا کہ امت میں اعلیٰ سطح کے علمی طبقے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ آخر انہوں نے کیوں اس پر امت کو کوئی راہنمائی نہیں دی؟ تاہم معاملہ یہ ہے کہ امت میں بڑی سطح کے علماء اول روز سے تکفیر کے ان رجحانات کو غیر علمی اور ناپختہ قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ بے شک تکفیر کی جانب مائل حلقوں میں نوجوانوں کو یہ بتایا جاتا رہا کہ: امت کے دامن میں آج کوئی بڑے علماء نہیں پائے جاتے، سوائے طاغوت کے خدمت گزار علماء کے، لہٰذا علماء اگر کچھ رہ گئے ہیں تو وہ 'ہمارے' ہی چند لوگ ہیں... مگر حق یہ ہے کہ ایسے علماء کی تعداد کوئی کم نہیں جو امت کے اندر اپنی سو فیصد آزاد رائے کے مالک ہیں اور بسا اوقات اپنی اس آزاد رائے کی مہنگی قیمت بھی دیتے ہیں۔ ایسے علماء نے بھی "تکفیر" کے اِن رجحانات کو علمی احاطے میں قبول نہیں کیا۔[1] لیکن یہاں 'مواقف' اور 'بدیہی امور' پہلے سے طے تھے۔ 'علماء' وہ ٹھہریں گے جو اِن 'علمی مواقف' اور اِن 'بدیہی اشیاء' سے کم از کم آگاہ تو ہوں اور ان کے مؤید بھی ہوں، اور وہ دو چار ہی ہیں؛ باقی وہ لوگ جو اِن 'علمی وبدیہی' اشیاء کو سمجھتے تک نہیں، یا سمجھتے ہیں مگر کتمانِ حق سے کام لیتے ہیں، انہیں 'عالم' کیسے مانیں! لہٰذا جب دنیا میں 'عالم' رہے ہی نہیں ہیں سوائے ان ایک آدھ

---

1 اور یہ وہ علماء ہیں جو جہادِ افغانستان کے پیچھے کھڑے رہے۔ جہاد فلسطین کے حق میں امت کو جگاتے رہے۔ چیچنیا، بوسنیا، کوسوا، کشمیر مسلمانوں کے ہر زخم کو محسوس کرتے اور کراتے رہے! خلیج میں امریکی بوٹ لگنے پر بلند ترین آواز میں بولتے رہے۔ وغیرہ

آدمیوں کے جو 'ہمارے' مؤید ہیں، تو آخر جائیں کس کے پاس؟!

چنانچہ علماء کے اور اِن مائل بہ تکفیر نوجوانوں کے مابین فاصلہ بڑھتا چلا گیا اور یہاں ''تکفیر'' کی پیچیدہ تر اور ترقی یافتہ تر صورتیں سامنے آنے لگیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا: ''تکفیر'' کے ساتھ ''خون مباح کر لینے'' کا معاملہ بھی خاصی حد تک نتھی ہی چلا آ رہا تھا۔ آخر یہ مسئلہ بڑھتا بڑھتا اور پیچ در پیچ اس سطح تک چلا گیا کہ علمائے دین اور جہاد کے لیے کام کرنے والی بہت سی جماعتیں تک ''تکفیر'' کے دائرے میں آنے لگیں۔ ہجرتیں کرنے والے، خدا کے راستے میں تکلیفیں جھیلنے اور قربانیاں دینے والے، شہادتوں کے متلاشی بھی رفتہ رفتہ اس زمرے میں آنے لگے جسے موت کے گھاٹ اتار کر اور زمین کو اس کے وجود سے پاک کر کے خدا کا تقرب حاصل کیا جائے! فحسبنا اللہ ونعم الوکیل

اگر یہ درست ہے کہ کچھ بڑے جھٹکے سمجھداروں کو سوچنے اور امور کا جائزہ لینے پر آمادہ کرتے ہیں... تو امید کرنی چاہیے، خود ان طبقوں میں مخلصین کی ایک تعداد آج کسی لمحۂ فکریہ پر پہنچ کر کھڑی ہو گی۔

*****

اِس امر کی نشاندہی کرتے چلیں کہ تکفیر کے بعض مسائل جب تک علمی (اکادیمی) آراء[2] کے دائرے میں رہیں اور ''فتویٰ'' کی زبان میں نہ ڈھلیں تب تک معاملہ یہ خطرناک

2 ''علمی آراء'' سے مراد مجرد نظری بحثیں نہیں۔ مراد یہ ہے کہ: معیّن افراد کو مرتد قرار دینے کا سلسلہ ہمیں ان اہل علم کے یہاں شروع ہوا نظر نہیں آتا۔ ورنہ یہ تو طے شدہ امر ہے کہ ایک بات کو ''فتویٰ'' کی زبان سے دور رہتے ہوئے جب ''عموم'' کے انداز میں کیا جائے تو وہ بھی سرزنش اور زجر و توبیخ کا ایک نہایت مؤثر معنیٰ دے رہا ہوتا ہے؛ بلکہ وہ فائدہ قولِ بلیغ کا یہ اسلوب اختیار کرنے سے ہی ملتا ہے۔ (ادھر بعض حضرات کا خیال کہ جب تک آپ معیّن کر کے افراد کو مرتد نہ کہیں تب تک عمومیات کے اسلوب میں گفتگو کا فائدہ ہی کیا!)

صورت نہیں دھارتا، اور اس انداز کا کلام اپنے اپنے دور کے فتنوں کی بابت اہل علم میں ہمیشہ ہوتا رہا۔ دورِ حاضر کے ایک بڑے فکری نام سید قطب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں ہمارے اِس عہد کے بعض مسائل کو کفر سے جوڑا گیا ہے تو وہ بھی ''فتویٰ'' کی زبان میں نہ تھا اور اِس وقت جاری لوگوں کو ''مرتد'' ٹھہرانے والی اپروچ سے بالکل ہٹ کر تھا۔ چنانچہ علماء کے ہاں ایک بڑی سطح پر اگر وہ اسلوب ''قبول'' نہیں ہوا تو بھی یہ کہنا چاہئے کہ وہ ''ہضم'' ضرور ہوا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات نے سید قطب کے لیے نہایت محبت کے جذبات ظاہر کیے، جبکہ **ایسا نہیں کہ سید قطب کی تحریریں ابن باز کی نظر سے گزری نہ ہوں**۔ بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سید قطب پر 'تنقید' کی وہ ضرورت بھی ابن باز کے حلقے میں شاید اس وقت محسوس کی گئی جب 'سید قطب' کے حوالے دینے والی شدت پسندی کی ایک رَو نوجوانوں میں سر اٹھانے لگی۔ ہم چاہیں گے کہ اس ایک ہی مثال سے آپ اُس اصل چیز کا کچھ اندازہ فرمانے کی کوشش کریں جو علمی حلقوں میں قبول ہوتی چلی آئی ہے۔ سید نے اپنی ان تحریروں سے ایک چیز کی شناعت سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر 'حکم' لگانے اور 'فتاویٰ' صادر کرنے کی جانب خود ہی کوئی پیش رفت نہیں کی ہے۔ وہ اِس رخ پر آئے ہی نہیں ہیں۔ نہ وہ اس میدان کے تھے۔ وہ ایک علمی دائرے میں، یا پھر احساس دلانے والے اسلوب میں ایک چیز کی سنگینی محسوس کراتے رہے ہیں؛ اور اس سے ایک بڑا طبقہ متاثر ہوا۔ سید قطب کے اِن افکار کو جانتے بوجھتے ہوئے، علماء حتیٰ کہ ابن باز ایسا ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ رکھنے والا عالم سید کے لیے اعلیٰ ترین کلمات کہتا ہے۔ یہاں تک کہ ابن باز جو کہ محض ایک عہدیدار نہیں جزیرۂ عرب کا ایک عظیم مدرسہ ہے، اپنے نوجوانوں کو یہ کتابیں پڑھنے کے لیے تجویز کرتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ سید کے ''مدرسہ'' کو حجاز میں باقاعدہ لاکر بٹھاتا ہے؛ سید کی بابت کسی سادگی اور لاعلمی کی بنیاد پر نہیں بلکہ ازراہِ محبت و تعلق خاطر، جو کچھ نہ کچھ اختلاف ہونے کے باوجود ان مدارس کے مابین چلتا ہے؛ اور جو کہ ایک بے حد صحتمند

فنا مناہے گو اَب حالیہ رجحانات اس کو ختم کروا دینے کے درپے ہیں۔[3] البانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ پورا ایک مدرسہ ہے، سید کے لیے بہترین کلمات بولتا اور اس کی کتابیں اپنے حلقے کے لوگوں کے لیے گاہے گاہے پڑھ لینا تجویز کرتا ہے۔ اور ان دونوں کے علاوہ علمائے کبار کی ایک بڑی تعداد۔ کیا ان واقعات کی آپ کوئی دلالت دیکھ رہے ہیں؟ کیا علمی حلقوں میں کوئی قربت اور الفت برقرار پا رہے ہیں...؟

تا آنکہ سید قطب کے ان مباحث کو "علمی آراء" کے دائرہ سے اٹھا کر "فتاویٰ" کی شیلف میں دھر دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد معاملہ بالکل ایک اور رخ اختیار کر جاتا ہے!

چنانچہ "حکم بغیر ما انزل اللہ" کی بحثیں سید قطب سے پہلے احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہیں۔ سید قطب کے بعد سفر الحوالی حفظہ اللہ نے کی ہیں۔ حتیٰ کہ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے اِسی سرکاری کرسی پر بیٹھنے والا ایک مردِ صالح جسے مفتی محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کہا جاتا ہے، اور جس کے رسائل ہمارے مائل بہ شدت حلقوں کے کم از کم ایک حصے میں ضرور حوالہ کے طور پر لیے جاتے ہیں... بلادِ حرمین کا یہ مردِ صالح اور اپنے دور کا ایک عظیم عالم اِسی "حکم بغیر ما انزل اللہ" کے موضوع پر کمال گفتگو کرتا ہے... مگر یہ سب لوگ اپنے دور کے فتنوں پر اِس "علمی گرفت" اور اس "اصولی سرزنش" کو "فتویٰ" میں کنورٹ convert نہیں کرتے اور ساتھ میں "خون" مباح کرنے کی وہ نہ رکنے والی چابی نہیں گھماتے جو پورے کے پورے انتظامی اداروں، افواج

---

[3] ان رجحانات کی سطحیت کا تو یہ حال ہے کہ کوئی ایک کلمۂ خیر کسی کے لیے کہہ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اُس کے 'ہم خیال' ہوئے! اور کوئی ایک تنقید کا جملہ لکھ دینے کا معنیٰ یہ کہ آپ اُس کے 'شدید مخالف' ہوتے ہیں! اس کے بعد مسلمانوں کے مابین کیا علمی باتیں ہوں اور کیا خیر اندیشی! سب کچھ اِس نئے کلچر کے ہاتھوں ختم ہونے کو ہے۔ شاید ایک ہی چیز باقی رہ جائے اور وہ جارج بش کا اصول: یا آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف، تیسرا کوئی خانہ یہاں آپ کی سہولت کے لیے رکھا نہیں گیا ہے!

اور محکموں اور نہ جانے کن کن شعبوں کو اپنی زد میں لیتی چلی جاتی ہے۔ یہ کام اُن لوگوں کے ہاتھوں ہوتا ہے جو اِن علمی حلقوں میں کسی علمی حوالے سے ذکر ہی نہیں ہوتے!

جہاں تک افراد کو معیّن کرکے "مرتد، خارج از اسلام" قرار دینے کا منہج چلائے بغیر "حکم بغیر ما انزل اللہ" کی شناعت بیان کرنا ہے... تو حق یہ ہے کہ خود مدرسہٗ حجاز و نجد اس میں کسی سے پیچھے نہیں۔ صرف ماضی میں نہیں؛ آج بھی۔ چند سال پیشتر کی بات ہے سعودی عرب میں سرکاری فتویٰ کمیٹی کے باقاعدہ دستخط کے ساتھ مسمیٰ خالد العنبری کی ایک کتاب بین کروائی گئی جو "حکم بغیر ما انزل اللہ" کو کفر قرار دینے کے لیے دل کے اعتقاد کی شرط لگاتی تھی؛ جس کی وجہ سے "حکم بغیر ما انزل اللہ" بھی عام گناہوں جیسا ایک گناہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ کتاب پر مفتیانِ نجد کے اعتراض کا چوتھا پوائنٹ تھا:

دعواه إجماع أهل السنة على عدم كفر من حكم بغير ما أنزل الله في التشريع العام إلا بالاستحلال القلبي كسائر المعاصي التي دون الكفر . وهذا محض افتراء على أهل السنة ، منشؤه الجهل أو سوء القصد نسأل الله السلامة والعافية[4]

> مؤلف کا یہ دعویٰ کرنا کہ اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ قانون عام میں اللہ کی شریعت کے بغیر حکم چلانے والا کفر کا مرتکب نہیں تاوقتیکہ وہ اس عمل کو دل سے جائز نہ سمجھتا ہو، جیسا کہ ان عام گناہ کے کاموں کے معاملہ میں ہے جو کفر تک نہیں پہنچتے۔ حالانکہ یہ اہل سنت پر نرا بہتان ہے؛ جو کہ جہالت کا شاخسانہ ہے یا بدنیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے عافیت بخشے۔

ہمیں معلوم ہے؛ حکمِ معیّن میں 'تاخیر' پر تعجب کرنے والا ذہن یہاں سوال اٹھائے گا...: مسئلہ جب اتنا واضح ہے تو پھر دیر کیسی! کیا باقی ہے جو اتنے سارے لوگوں کو مرتد کہنے میں تاخیر ہو رہی ہے؟!

---

4 فتویٰ کی عبارت اس ویب سائٹ سے دیکھی جاسکتی ہے: http://goo.gl/XCk7ey

مگر سوال یہ بھی ہے کہ فتویٰ کمیٹی کو آخر شوق کیا ہے ایسا فتویٰ دینے کا؟ وہ ایک ایسی کتاب کو بین کروانا چاہ رہی ہے جو "حکم بغیر ما انزل اللہ" کو "کفر" سے کم کر کے عام گناہ کے درجے پر لے آنا چاہتی ہے۔ ایسی کتاب اگر چھپتی رہے تو کیا اس پر وقت کے حکمرانوں کو اعتراض ہو گا!؟ کیا مثلاً حکمران طبقوں نے فتویٰ کمیٹی کو مجبور کیا ہو گا کہ وہ اس کتاب کو بین کرنے کا فتویٰ دے!؟ کمیٹی کے علماء کی بابت آپ جو بھی رائے رکھیں، کم از کم وہ اتنا تو جانتے ہیں کہ ایک ایسا فتویٰ دینے سے (جس پر ان کو ظاہر ہے کسی نے مجبور نہیں کیا) وہ آپ ہی اپنے لیے بہت سارے سوال کھڑے کر رہے ہیں۔ اگر واقعتاً یہ کوئی علمی بات ہے کہ "حکمِ مطلق" اور "حکمِ معیّن" کے مابین اتنا فاصلہ (gap) رہنا درست ہی نہیں... تو علماء پھر یہ حکمِ مطلق بھی کیوں بیان کرتے ہیں جب تک کہ وہ "افراد" پر حکم لگانے کا باقاعدہ کوئی سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے!؟ کیا ایسا تو نہیں کہ 'ہم' ہی غلط ہوں؟ حکمِ مطلق اہل علم کے ہاں عین اِسی طرح بیان کیا جاتا ہو جس طرح کہ صورتِ مذکورہ میں ہوا... جبکہ حکمِ معیّن کی جانب صرف خاص (بلکہ بہت خاص) صورتوں میں ہی رخ کیا جاتا ہو؟ خاص استثنائی صورتوں کے بغیر، حکمِ عام بیان کرتے چلے جانے سے ہی — اہل علم کے ہاں — دین کے کچھ مقاصد پورے کیے جاتے ہوں؟[5]

چنانچہ حکم بغیر ما انزل اللہ وغیرہ سے متعلق "علمی آراء" رکھنا کسی کے ہاں بھی[6] اُس "تکفیر" میں نہیں آتا جو اِس وقت ایک بحران کی صورت ہمارے عمل پسند طبقے کو نگلتا جا رہا ہے بلکہ جو دین کے لیے سرگرم جماعتوں کے مابین ایک نہ بجھنے والی آگ بھڑکانے کے قریب

---

5 کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ شریعت میں "حکمِ معیّن" نہیں ہے۔ تاہم حکمِ مطلق لگانے سے حکمِ معین کا لازم آنا ہر حال میں ضروری نہیں۔

6 سوائے چند ارجائی طبقوں کے جو احمد شاکر اور مفتی محمد ابراہیم کے طرزِ فکر کو بھی "تکفیر" کے کھاتے میں ڈالنے پر مُصر نظر آئیں گے۔

ہے (دشمن کا اگلا حربہ خدانخواستہ یہی ہے)۔ بلاشبہ وہ علمی آراء اور مواقف جو مدرسۂ قطب یا مدرسۂ نجد وغیرہ کے ہاں بیان ہو رہے تھے، اپنی جگہ درکار تھے اور معاشرے میں ایک بہت اعلیٰ سطح پر اذہان کو متاثر بھی کر رہے تھے۔ خاص طور پر جب سے ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ دین میں ایک غیر معمولی رغبت ظاہر کرنے لگا ہے اور جب سے یہاں پر مغربی نظاموں اور فلسفوں کا فسوں ٹوٹا ہے۔ تاہم مغربی نظاموں سے بددل ہو کر آنے والے ہمارے پڑھے لکھے دماغوں کو "اسلام" کی بابت اپنے اشکالات دور کرنے اور اسلامی موضوعات میں گہرا جانے کے لیے ابھی کچھ وقت چاہیئے تھا۔ مگر "تکفیر" کے حالیہ رجحانات اور ان سے پیدا ہونے والے فکری بحرانات نے نہ صرف ان سوالات کو بے طرح الجھا دیا ہے بلکہ وہ علمی مناہج بھی جو اِن جدید اذہان کو کامیابی کے ساتھ متاثر کر رہے تھے اب ان کو خطاب کرنے میں کچھ اضافی مسائل کا سامنا کرنے لگے ہیں۔

پس "حکم بغیر ما انزل اللہ" وغیرہ ایسے ابواب میں بیان ہونے والے وہ علمی مواقف تو جو مدرسہ مودودی و سید قطب یا مدرسہ حجاز و نجد وغیرہ کے ہاں پائے گئے – کم از کم جب تک "تکفیر" کے یہ عشرے شروع نہیں ہوئے تھے – اپنے ایک انداز سے معاشرے کے اعلیٰ طبقوں کو متاثر کر رہے تھے اور مغربی پیراڈائم کو یہاں کے علمی حلقوں کے اندر ایک اعلیٰ سطح کی مزاحمت دینے میں کامیابی بھی پا رہے تھے۔ لہٰذا ہمارا مسئلہ اُس حکمِ مطلق والی اپروچ کے ساتھ نہیں۔

یہاں ہمارا مسئلہ اس نئی رَو کے ساتھ ہے جو:

} لوگوں کو معیّن کرکے "کافر مرتد" کہنے کی ایک باقاعدہ تحریک کی صورت برپا ہے۔ جس کے باعث علمی حلقوں تک کے لیے آج یہ مشکل ہو گیا ہے کہ یہ اپنے وہ علمی مباحث اُسی معمول کے ساتھ بیان کریں جو اس سے پہلے تھا (کہ اُس وقت ایک چیز کے غلط استعمال کا اس قدر امکان نہیں بڑھا تھا۔ البتہ اب

تو یہ شاید 'فتنہ کے وقت اسلحہ بیچنے' کے مترادف ہو گیا ہو)۔

- ساتھ میں 'خون' مباح کرنے کا عمل جڑا ہے۔
- اور اس تمام پروسیجر کے عمل پانے کے لیے اپنے اعتماد کے چند ایسے لوگ کافی ہیں جنہیں 'علماء' باور کر لیا گیا ہو۔ اِس آخری چیز نے سمجھداروں کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ آخر کیا مشکل ہے کہ ہر نیا گروپ اپنے اعتماد کے چند علمی نام پیش کر دے اور امت کے زیادہ سے زیادہ طبقوں کا خون مباح کرنے لگے؟ لا محالہ؛ یہاں جو مسائل "امت" کی سطح کے ہیں- خلافت کی غیر موجودگی میں- ان کی بابت "فتویٰ" کے لیے "امت" کی سطح کے کچھ سٹینڈرڈ رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ یقینی ہے کہ چند ناپختہ ذہن پوری امت کو ایک نہ ختم ہونے والی خونریزی ایسے کسی بھی معاملہ میں الجھا سکتے ہیں جسے روکنے کی کوئی دلیل آپ اس لیے اپنے پاس نہ رکھیں گے کہ یہ اصول پہلے سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آپ اپنے اعتماد کے کسی ایک آدھ بندے کو عالم سمجھتے ہوئے یا خود کو اس پوزیشن میں پاتے ہوئے "تکفیر" اور "خون" کے معاملات نمٹا دیا کریں اور امت میں باقی علماء کو غیر موجود تصور کر لیا کریں!

یہ ایک بڑی ہی خطرناک سمت تھی جس کے لیے زمین پختہ کرائی جاتی رہی... اور ناصحین کے انتباہات بھی شاید سنے ان سنے ہوتے رہے۔

پھر اس کے ساتھ... امت کے فقہی کنونشنز کو چٹکیوں میں اڑا دینے کی روش۔

خاص طور پر ہمارے فقہاء کا منہج تیسیر۔ (فقہ میں معاملات کو آسانی کے رخ پر چلانا)

آپ ایک بات کے قائل نہیں تو بھی شاید اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ لیکن دوسرے اگر متقدمین فقہاء میں سے جمہور کی آراء پر چلتے ہیں جبکہ معاصر فقہاء کے جمہور بھی اسی رائے پر ہوں تو اس کو ایک معتبر علمی رائے ہونے کی چھوٹ تو کم از کم دیں! اور اس کو 'دلیل' سے اڑا کر رکھ دینے کا

وہ اسلوب تو اختیار نہ کریں جو جمہور فقہاء کی رائے پر چلنے والوں کو "باطل پرست" رنگ میں پیش کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں "اخف الضررین" اور "مصالح ومفاسد کا موازنہ" کچھ علمی طریق استدلال ہیں خاص طور پر جب وہ علماء کے ہاتھوں انجام پارہے ہوں۔ کافر سے استعانت کا مسئلہ ایک علمی موقف ہے اور روس کے خلاف جہاد کے وقت سے امت کے چوٹی کے علماء کے ہاں روبہ عمل ہے۔ غرض اسی طرح کی کچھ دوسری مثالیں۔ جن میں آپ ایک بات سے متفق نہیں تو بھی مخالف کو اجتہادی روش پر ہونے کی حیثیت دیں۔ مگر یہاں زیادہ تر ان کو 'باطل پرستوں' کی صف میں ہی کھڑا کر کے دیکھا گیا، الا ماشاء اللہ۔

*****

اس فکر کے رجال اپنے اخلاص، محنت اور قربانیوں کے لیے یقیناً لائقِ احترام ہیں۔ تاہم اگر ان اشیاء کو علمی حوالوں سے دیکھا جائے، تو خود یہ افکار اور اِس کے رجال... عین ابتداء میں جہاں سے نمودار ہو کر آئے وہ کسی معروف فقہی مدرسہ کا تسلسل نہیں تھا۔ بے شک یہ ڈسکورس اپنی بعض بنیادیں ابن تیمیہ کے مدرسہ میں دیکھ رہا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم اپنے اداریہ میں اس طرف نشاندہی کر آئے ہیں؛ ہر مدرسہ اپنے یہاں "سخت" اور "نرم" کا پورا ایک پیکیج رکھتا ہے اور وہ اپنی اُس "کلیت" کے ساتھ ہی ایک مدرسہ ہوتا ہے۔ تاہم اگر آپ اس کی کسی ایک خاص جہت پر ترکیز کر لیں تو باوجود اس کے کہ اس کے حوالے دینے میں آپ غلطی نہیں کر رہے ہوتے مگر اس کی ایک کلی تصویر پیش کرنے میں آپ بے حد غلط ہوتے ہیں۔ یہ ملاحظہ قوی طور پر آپ کو یہاں بھی پیش آتا ہے۔ ابن تیمیہ کا "منہجِ تیسیر" خصوصاً مصالح کا اعتبار، مثالیت سے دور رہنے اور واقعیت کو اختیار کر رکھنے، ایک بری سے بری سماجی صورتحال کے گھمسان میں جا اترنے، اس کے اندر جا کر اصلاح کرنے اور 'عزلت وعلیحدگی' کی نفسیات کو شدید رد کرنے ایسی اشیاء کو "ابن تیمیہ کے منہج" سے نکال دیں تو اس منہج کا دوسرا پہلو (عقائدی شدت وصلابت) خود بخود اپنا وہ نسبت تناسب کھو دیتا ہے جو

اس کی ایک مجموعی ہیئت برقرار رکھے ہوئے تھا... یا پھر وہ "ابن تیمیہ کے منہج" کو کوئی اور منہج بنا دیتا ہے! جس کی بہر حال یہ کوئی واحد صورت نہیں؛ آج بہت سے 'اور مناہج' اپنے آپ کو 'ابن تیمیہ کے منہج' کے طور پر ہی پیش کر رہے ہیں۔

ستم بالائے ستم.. "تکفیر"[7]، اس کی بنیاد پر "مسلم ملکوں کے اندر قتال" اور "فقہی عدم تیسیر" کی یہ روش سب سے زیادہ ابن تیمیہ کے مدرسہ میں اپنے جڑیں رکھنے کا دعویدار ہے۔ اس کے بعد یہ ڈسکورس شاید کچھ اور اہل سنت مدارس میں بھی اپنی بنیادیں دیکھنے لگا ہے، مثال کے طور پر برصغیر کے اکابر دیوبند۔ مگر یہاں بھی ہمارے خیال میں ایک مدرسہ کی "کلیت" اس بات کی مؤید نہ ہوگی۔ اور اصل چیز "کلیت" ہے۔ برصغیر کے اکابر دیوبند یا اکابر اہلحدیث نے انگریزی سرکار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے جو تاریخ ساز کارنامے انجام دیے اور بلاشبہ کاتبِ تاریخ کے سامنے "مسلم ہند" کو سرخرو رکھا... تو وہ جہاد کا وہی روایتی تصور ہے جس کی ایک جھلک ہمیں اپنے اِس دور میں ملتی ہے تو وہ عبد اللہ عزام مع قائدینِ افغان جہاد (قائدین افغان جہاد کی بعض شخصیات بعد ازاں امریکی حملہ آور کی جھولی میں جا گریں، تو یہاں البتہ وہ اکابر دیوبند کی راہ پر نہ رہیں؛ ان کے ہاتھ سے استقامت کا سرا یقیناً چھوٹ گیا)، ملا عمر اور ان کے رفقائے کار جو کافر امریکی حملہ آور کے خلاف مصروفِ جہاد ہیں اور تحریکِ حماس و دیگر فلسطینی مجاہد تنظیمیں جو کافر یہودی قبضہ کار کے خلاف مصروفِ جہاد ہیں، یا کشمیر میں ہندو کافر کے خلاف جہاد کرنے والی جماعتیں، وغیرہ۔

واضح کر دیں، افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ روسی حملہ آوروں کے خلاف، یا ملا عمر کے شانہ بشانہ امریکی حملہ آوروں کے خلاف جس بھی مسلمان نے جہاد کیا وہ اپنے عمل میں اس حد تک لائقِ ستائش ہی قرار پائے گا۔ کچھ غلط ہے تو وہ یہ کہ اگر کسی نے بعد ازاں عالم اسلام

---

7 جس کی صورت اوپر بیان ہوئی۔ اس کو کسی مطلق معنیٰ میں نہ لیا جائے۔

کے داخلی محاذ پر جنگ اٹھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ البتہ ایک تباہ کن چیز ہے خواہ اس کا کرنے والا کوئی ہو۔ اس کے نتائج اِس وقت ہم عالم اسلام میں بچشمِ سر دیکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ نہ صرف پورے کے پورے معاصر جہاد پر انگلی اٹھ جانے کی نوبت پیدا ہو گئی ہے بلکہ عالم اسلام کا پورا مزاحمتی عمل ہی اڑا کر رکھ دیا جانے لگا ہے۔ نیز عالم اسلام میں باطل کو رد کرنے والے تمام افکار اور تحریکیں تخریب کاری کے ساتھ جوڑی جانے لگی ہیں۔ جس سے 'مفاہمتی اسلام' والی جدت پسند آوازوں کی چاندی ہو گئی ہے۔

اس وجہ سے ہم بے حد زور دیں گے: جہاد کا صرف اور صرف روایتی ڈسکورس۔

برصغیر کے اکابر دیوبند یا اکابر اہلحدیث کا جہادی ڈسکورس، جسے ہم فی زمانہ سب سے بڑھ کر عبداللہ عزام، ملا عمر اور احمد یاسین و محمد الضیف وغیرہ ایسے راہنماؤں کے ہاں پاتے ہیں، اسے ہم ''روایتی'' اس لیے کہتے ہیں کہ...:

1. ایک تو یہ اس کافر کے خلاف ہے جسے سیدھا سیدھا کافر کہنے میں امت کا کوئی نزاع نہیں، نہ تعمیم (عمومی قاعدہ بیان کرنے) میں اور نہ تعیین (ان میں سے ایک ایک کو معیّن کر کے کافر کہنے) میں۔ (جبکہ ایک ایسے دور میں جب امت کو اپنے روایتی مسلّمات پر کھڑا رہنا ہی دشوار ہو رہا ہو، ''تکفیر'' سے متعلق کچھ نئے چیپٹر پڑھانا اور پھر اس بنیاد پر ساتھ ہی اس کو ''جہاد'' کا ایک چیپٹر بھی کھول دینا اسے لامتناہی الجھنوں میں جھونکنے کے مترادف ہو گا)۔ جبکہ اکابر دیوبند و اہلحدیث اور ان کی راہ پر چلنے والی حالیہ جہادی تحریکوں کی اس بات کو ہم نہایت استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ امت کو اس کے پرانے روایتی مسلّمات کی بنیاد پر ہی ''عمل'' اور ''جہاد'' کا ایک نقشہ دے رہے ہیں اور کسی نئی بحث میں نہیں لگا رہے۔

2. دوسرا، ان کے ہاں وہ روایتی فقہی تیسیر بھی برقرار ہے جو سیاسۃ شرعیۃ میں ازحد ضروری رہتی ہے، خصوصاً ایک ایسے وقت میں جب امت لخت لخت ہو اور جب

"اضطرار" کی صورتحال ہمارے پہلے کسی بھی دور سے بڑھ کر ہو۔ چنانچہ ایک کافر کے مقابلے پر دوسرے کافر سے مدد یا تعاون لینے میں ان (دیوبندی و اہلحدیث) بزرگوں کے ہاں وہ سوالات کبھی نہیں اٹھے جو ہمارا حالیہ شدت پسند ڈسکورس اٹھا رہا ہے۔ مثلاً انگریز کے خلاف برسرِ جہاد اکابر دیوبند و اہل حدیث کو اس بابت کبھی اشکال نہیں آیا کہ اس قابض و متمکن انگریز دشمن کے خلاف جرمنوں سے مدد لینے کے امکانات تلاش کیے جائیں۔[8] یہاں تک کہ ہر دو (دیوبند و اہلحدیث)[9] کی بعض شخصیات کا اڈولف ہٹلر کے ساتھ ملاقات کر کے آنا اور یہاں سے انگریز کے خلاف مسلم ہند میں کوئی بڑی تبدیلی اٹھانے کی اسکیمیں بنانا تاریخ کا حصہ ہے۔ یہی چیز ہمیں عبد اللہ عزامؒ کے ہاں نظر آتی ہے جو اُس جہاد کے حق میں مراکش تا یمن اور ترکی تا انڈونیشیا مسلم نوجوان کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوئے جو اس سات جماعتی اتحاد کی قیادت میں ہو رہا تھا جسے سوویت یونین کے خلاف پورے مغربی بلاک کی حمایت حاصل تھی۔ اسی جہاد کی کوکھ سے ملا عمر کی تحریک جہاد پیدا ہوئی جس نے آج تک اپنے اُس جہاد پر استدراک نہیں کیا جو سوویت یونین کے خلاف لڑا گیا۔ اسی طرح حماس کے ہاں ایران سے کچھ مدد لے لینے میں وہ اشکال سرے سے کھڑا ہی نہیں ہوا جو ہمارے اِس شدت پسند ڈسکورس میں کفر اسلام کے فیصلے کر ڈالنے کی بنیاد ہے!

غرض یہ (شدت پسند ڈسکورس) ایک طرزِ فکر ہی بالکل اور ہے جو ان سب معاملات میں فوراً آپ کو "تکفیر" یا "تفسیق" کے سوال پر لے آتا ہے۔ اچھے اچھے نوجوان بیچارے

---

8 تدبیری طور پر یہ بات کہاں تک صائب تھی، یہ بحث الگ ہے۔ یہاں مقصود مسئلہ کی شرعی جہت ہے، جو ان بزرگوں میں سے کسی کے ہاں محل اشکال نہ تھی۔

9 دیوبند سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور اہلحدیث سے مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ۔ دونوں کا آزادیِ ہند کے سلسلہ میں ہٹلر سے رابطے ہونا تاریخ میں مذکور ہے۔

یہ سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ میں فلاں کو رحمہ اللہ کہوں یا 'احتیاط' افضل ہے!

ہمارے نزدیک اِس پورے ڈسکورس کو ایک مراجعہ سے گزرنے کی ضرورت ہے۔ یہ درست راہ پہ آجائے تو اس میں امت کی تعمیر کے لیے بے حد پوٹینشل ہے۔ اخلاص غیر معمولی ہے۔ قربانیوں کا کوئی حد و حساب نہیں ہے۔ تاہم اس کو مدارس اہل سنت کی مین سٹریم کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں کہ انحطاط کے ان ادوار میں:

- "ایمان"، "عبادت" اور "جہاد" وغیرہ کے انہی ابواب اور مباحث تک محدود رہا جائے جنہیں اہل سنت کے کچھ بڑے بڑے مدارس کے ہاں پوری طرح اون own کیا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ اِن مدارس کی بعض اشیاء کو اپنے ہاں پائے جانے مباحث سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہو؛ جس سے لا محالہ کچھ نئی بحثوں کا آغاز ہو؛ اور ان بحوث کا اِس وقت کی مغلوب، مصروف اور الجھی اور بکھری ہوئی صورتحال میں خواص بھی حق ادا نہ کر پاتے ہوں؛ کجا یہ کہ عوام کو ان بحوث میں الجھایا جائے۔ عوام کو تو (کسی قسم کی بحثوں اور اختلافات میں الجھائے بغیر) آج کبار علماء کے پیچھے چلا لیا جائے تو بڑی بات ہے اور ان شاء اللہ خیر کا ایک بہت بڑا موجب۔ (ان حرکتوں کے باعث، اور کچھ دیگر عوامل کے تحت، "عوام" تو سرے سے دینی طبقوں سے دُور ہو چکے)۔ معلوم نہیں کس برتے پر یہاں ہر نیا طبقہ ایک 'سولو فلائٹ' لینے کی راہ چل پڑتا ہے۔
- اُن فقہی کنونشنز کو نہ چھیڑا جائے، کم از کم عوام کی سطح پر نہ ہلایا جائے، جو اِن مانے ہوئے established سنی مدارس کے ہاں معروف یا معمول بہ چلے آتے ہیں۔ تاکہ وہ یکسوئی کم از کم باقی رہے جسے انحطاط کے اِس وقت بر قرار رکھا جا سکتا ہے۔

اِن معاشروں کی قسمت بدلنے کے لیے ہمیں ایک ایسے منہج کی ضرورت ہے جو کسی خطے کے سنی عوام کو کم سے کم تبدیلیوں سے گزار کر وہاں پر معاملے کی بساط الٹ دے۔

کیا تکفیری طے کریں گے
مرجئہ کون ہیں؟

حامد کمال الدین

مضامین

2009ء کے شروع میں، ایقاظ میں ایک مضمون دیا گیا تھا "کیا مرجئہ طے کریں گے تکفیری کون ہیں"۔ اس سے چھ آٹھ ماہ بعد ایک معزز قاری کی جانب سے ہمیں اپنے اُس مضمون پر چند اعتراضات موصول ہوئے، جن کا جائزہ لینے کے لیے 2009ء کے آخری شمارہ میں "کیا مرجئہ طے کریں گے تکفیری کون ہیں 2" کے زیر عنوان ایک مضمون دیا گیا۔ چنانچہ دوسرا مضمون ازالۂ اعتراضات کی خاطر آیا۔ البتہ پہلے مضمون کا پس منظر بیان ہو جانا اُس کا سیاق واضح ہو جانے کے لیے ضروری ہے:

مسلم ملکوں میں 'شریعت' کے نام پر مار دھاڑ اور خونریزی کا جو ایک بازار گرم ہے، اس کا سدباب ایقاظ کی تحریروں میں اُس وقت سے ہو رہا ہے جب کم از کم ہمارے ملک پاکستان میں 'شریعت' کے نام پر ابھی کسی مسلح حرکت کا نام ونشان نہ تھا۔ اس 'مسلح' فکر کا آغاز چونکہ مصر سے ہوا، اور مصر وہ ملک ہے جہاں سے اٹھنے والے افکار و رجانات بالعموم عالم اسلام میں مقبولیت پالیتے رہے ہیں، لہٰذا ایک فکری مجلہ ہونے کے ناطے ہم نے مصر کی ایک علمی شخصیت اور وقت کے ایک عظیم فکری نام محمد قطب کی تحریرات اس خونریزی منہج کے رد پر ایقاظ شروع ہونے کے دوسرے ہی سال (2002ء) سے دینا شروع کر دی تھیں۔ اور ہماری خواہش تھی کہ ایسے کسی فتنہ کے خدانخواستہ اِس ملک میں قدم رکھنے سے پہلے ہی یہاں کی فکری دنیا میں اس سے متعلق ایک شعوری آگہی فراہم کر دی جائے۔ محمد قطب کی ان تحریروں میں مصری نوجوانوں کے مابین تکفیر (مسلمانوں کے

مختلف طبقوں کو اسلام سے خارج ٹھہرانے) ایسے رجحانات پر بھی تنبیہ ہوئی تھی اور یہ واضح کیا گیا تھا کہ یہاں ہمارا کام اور منصب لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا ہے نہ کہ اسلام سے خارج ٹھہرانا۔ ہمارے کرنے کا کام یہاں لوگوں پر کفر اور شرک کی حقیقت واضح کرنا اور ایسے خطرناک گڑھوں میں جا پڑنے سے ان کو خبردار کرنا ہے نہ کہ لوگوں کو بالفعل کافر و مشرک ٹھہرانے چل دینا۔ ایقاظ کے ابتدائی سالوں میں شائع ہونے والی یہ تحریرات بعدازاں ''دعوت کا منہج کیا ہو؟'' کے زیر عنوان کتابی شکل میں بھی شائع ہوئیں اور یہ تالیف کتب خانوں پر برابر دستیاب رہی۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ عمومیات کی حد تک تھا۔ عملاً یہ چیز یہاں پر پائی ہی نہ گئی تھی، لہٰذا مخصوص طور پر ان چیزوں کا رد کرنا یہاں اُس وقت کے حساب سے غیر ضروری تھا۔

جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے، تو ریاست کے ساتھ تصادم کا آغاز یہاں ایک طرح سے لال مسجد واقعے کے ساتھ ہوا، یعنی 2007ء کے وسط میں۔ اور 2008ء تک یہ فتنہ ملک میں اچھا خاصا زور پکڑ چکا تھا۔ نوٹ کرنے کی بات یہ ہے، لال مسجد والوں کی جانب سے قانون کو ہاتھ میں لینے کے واقعات تو مبینہ طور پر پیش آئے اور ریاست کے مقابلے پر ہتھیار اٹھائے گئے بھی ان کے ہاں تصویروں میں دیکھے گئے، تاہم ''تکفیر'' (یعنی لوگوں کو کافر کہنا) وغیرہ ایسے مباحث لال مسجد والوں کی زبان پر بھی کم از کم اُس وقت تک (2007ء) ہمارے دیکھنے سننے میں نہیں آئے۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ یوں گزرا کہ مار دھاڑ کے واقعات کی ذمہ داری قبول کرنے والوں کی جانب سے تکفیر (لوگوں کو کافر بنانے) وغیرہ سے متعلقہ کوئی قابل ذکر اقوال سامنے نہیں آئے۔ کم از کم 2008ء تک ہمارے سننے پڑھنے میں ایسی چیزیں نہیں گزریں۔ ہمارا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ ''تکفیر'' کا وہ خاص ڈسکورس جو مصر سے ''ترجمہ'' ہو کر یہاں پہنچا 2008ء تک بھی نہ تو لال مسجد والوں کے بیان میں سنا گیا اور نہ شمالی علاقوں میں اٹھنے والی شدت پسند آوازوں میں۔ شاید انہیں اس

تک ابھی رسائی بھی نہ ہوئی تھی۔ یہاں علم اور علماء سے کٹی ہوئی محض ایک جذباتی اور انتقامی انداز کی ایک رَو تھی، البتہ کسی 'فکری محنت' indoctrination کے تانے بانے ابھی اس کے اندر نظر نہ آتے تھے۔ کم از کم ظاہر یہی تھا۔ دونوں کا مرکزی خیال "ریاست کے ساتھ تصادم" کے گرد گھومتا تھا۔ تکفیر (حکمرانوں یا اداروں کو کافر ٹھہرانا) ان لوگوں کے یہاں ایک باقاعدہ نظریے کے طور پر ذرا دیر بعد دیکھنے میں آیا۔ ایقاظ میں بھی وہ تمام عرصہ اس خونریزی کے رد پر ہی تحریریں آتی رہیں:

2007ء میں ہی ہماری تالیف "روبہ زوال امیریکن ایمپائر" منظر عام پر آئی، جس کے بہت سے اجزاء ایقاظ میں بھی شائع ہوئے۔ اس کے اقتباسات شاید کئی دوسرے مجلات نے بھی شائع کیے۔ ہماری یہ تالیف جہاں افغانستان و عراق وغیرہ پر صلیبی یلغار کے خلاف ایک فکری مزاحمت تھی وہاں مختلف زاویوں سے مسلم ملکوں میں شروع ہو چکی عسکریت پسندی کے راستے میں کچھ فکری بند باندھنے کی بھی ایک کوشش تھی (ہم ایک فکری مجلہ ہیں؛ لہٰذا ایک فکری بند ہی باندھ سکتے تھے؛ عملی بند باندھنا اُن قیادتوں کا کام ہو سکتا تھا جو لوگوں پر ایک براہِ راست تاثیر رکھتی ہیں)۔ نیز (اپنی اُس تحریر میں) ہم نے اس بات پر زور دیا تھا کہ عالم اسلام پر امریکی حملہ آوروں کا راستہ روکنے کی صحیح صورت یہ ہے کہ مسلمان اپنی ہر ضرب (افغانستان اور عراق وغیرہ ایسے ملکوں میں) ان بیرونی حملہ آوروں پر ہی مرکوز کیے رکھیں اور اس ایک ہدف سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہ ہٹیں، خواہ اس کے لیے کتنا ہی جال (bate) آپ کے آگے پھینکا جائے؛ اور اُن کے پھینکے ہوئے اِس جال میں نہ آنے کے لیے خواہ کتنا ہی آپ کو صبر و برداشت سے کام کیوں نہ لینا پڑے، مگر آپ کو صبر ہی کرنا ہوگا۔ (کیونکہ امریکیوں کی کوشش ہی یہ تھی کہ وہ اس جنگ کو 'اپنی' بجائے کسی 'اور' کی جنگ بنا دیں اور پھر یہاں پیسہ و اسلحہ پھینک کر تماشا دیکھنے والا 'monitoring' فریق بن جائیں، جو کہ دنیا میں اُن کا من پسند مشغلہ ہے۔ لہٰذا ان حملہ آوروں کو ناکام کرنے کی واحد

صورت یہ تھی کہ وہ مسلم مزاحمت کار جو واقعتاً صلیبی حملہ آور افواج ہی کو مسلم سرزمینوں سے نکالنے پر کمربستہ ہیں، ہرگز ہرگز اُن صلیبی حملہ آوروں کو چھوڑ کر کسی 'ٹرک' کی بتی کے پیچھے نہ لگیں)۔ غرض جہاد کی اُسی معلوم معروف صورت پر رہیں جو اس سے پہلے کشمیر اور فلسطین وغیرہ میں مسلم مقبوضہ جات کی خلاصی کے لیے بڑے عشروں سے مسلمانوں کے یہاں جانی پہچانی رہی ہے۔ تالیف میں ہم نے خصوصی طور پر متنبہ کیا تھا کہ یہاں کوئی طبقہ 'جہاد' کے نام پر کسی ایسی چیز کی رِیت نہ ڈالے جس پر اعلیٰ سطح کے علمائے اسلام high level scholarship of the Muslim world کی جانب سے نہ صرف کبھی صاد نہیں ہوا بلکہ وہ ان (عالم اسلام کے علمائے کبار) کے ہاں واضح واضح ردّ ہے۔ ایقاظ کے اُسی خصوصی شمارہ میں ایک عرب شخصیت (عبدالمنعم ابو حلیمہ) کا مضمون بھی دیا گیا جو اُس وقت تک تنظیم القاعدہ کے یہاں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور بعد ازاں القاعدہ کے ایک بڑے ناقد کے طور پر سامنے آئی [کیونکہ 2007ء تک القاعدہ کے یہاں مسلم ملکوں کے اندر داخلی محاذ نہیں کھولا گیا تھا، اور اس کا یہ پرانا تاثر earlier image (صرف امریکہ کے خلاف محاذآرا ہونا) ہی بہت سے اذہان پر ایک عرصہ تک باقی رہا]۔ عبدالمنعم ابو حلیمہ کے اس مضمون میں (جو انٹرنیٹ سے حاصل کر کے ایقاظ کے اُس خصوصی شمارہ میں اردو خلاصہ کر کے دیا گیا تھا، اور خاص ان کے نام سے اس لیے دیا گیا کہ اس طبقہ میں تب ان کا ایک خصوصی احترام تھا لہٰذا ان کی تنبیہ و نصیحت کا ان نوجوانوں پر اثر ہونے کا امکان زیادہ تھا)... عبدالمنعم ابو حلیمہ کے اس مضمون میں مسلم نوجوانوں کو اس بات سے شدید تنبیہ ہوئی تھی کہ اگر وہ پاکستان میں عسکریت پسندی کی طرح ڈالتے ہیں تو معاصر جہاد کی تاریخ میں یہ ایک تباہ کن غلطی ہو گی۔ نیز ان کو تاکید ہوئی تھی کہ وہ ان نئے راستوں پر چلنے کی بجائے شیخ عبداللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ کی چھوڑی ہوئی راہ پر رہیں جنہوں نے مجاہدین کی ہر ضرب پوری ترکیز کے ساتھ روس پر ہی لگوائی اور وہ بھی افغانستان میں ہی؛ اور

اس ایک ہدف اور ایک میدان سے ان کی توجہ کسی طرف ہٹنے نہیں دی۔ یہاں تک کہ روس کے پاکستان میں سفارت خانے کو بھی کبھی ہدف نہ بننے دیا کیونکہ اس سے مجاہدین یہاں پاکستانی حکومت اور عوام کا اعتماد کھو بیٹھتے، جو ایک فاش غلطی ہوتی۔ نیز انہیں نصیحت کی گئی تھی کہ احمد یاسین رحمۃ اللہ علیہ کے چھوڑے ہوئے راستے پر رہیں جنہوں نے یہود کے ساتھ اپنی جنگ کو ارضِ فلسطین سے باہر کبھی نہ نکلنے دیا باوجود اس کے کہ یہودی صیہونیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کو امریکی سرزمین میں بھی کی جا سکتی تھی مگر ایسا کرنے سے فلسطینی مجاہدین دنیا میں اپنے بہت سے خیر خواہوں کا اعتماد کھو بیٹھتے اور اپنے بہت سے راستے اپنے اوپر تنگ کر لیتے، جس کا فائدہ ان کا دشمن اٹھاتا۔

غرض 2008ء تک یہی تصویر سامنے آئی تھی۔ اور اسی کے مطابق ہم نے یہاں پر درکار فکری راہنمائی کے سلسلہ میں اپنا ناچیز حصہ ڈالنے کی کوشش کی۔

تا آنکہ 2008ء کے اواخر تک 'تکفیر' (لوگوں / اداروں وغیرہ کو کافر ٹھہرانے) اور اس کا 'جوابی بیانیہ' یہاں کے ابلاغیاتی افق پر ایک ساتھ نمودار ہونے لگے۔ حق یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں تیار حالت میں ready-made باہر سے امپورٹ ہوئی تھیں۔ نہ "تکفیری بیانیہ" یہاں کی مقامی ایجاد تھی اور نہ اس کا "جوابی بیانیہ"۔ دونوں 'کہیں اور' سے ہمارے لیے درآمد کیے جا رہے تھے۔

دونوں بیانیوں کا موضوع ظاہر ہے "تکفیر" تھا۔ یا یوں کہیے اول الذکر کا موضوع "تکفیر" تھا اور ثانی الذکر کا موضوع "تکفیری"۔ یہ دونوں ہمیں تہس نہس کر ڈالنے والے بیانیے تھے۔ نہ اُس میں ہمارے لیے کوئی خیر تھی اور نہ اِس میں۔ (وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات ضرور آپ پر کھل جائے گی، اگر اب تک کھل نہیں چکی)۔ غرض موضوع اُس وقت تک یہی دو تھے۔ چنانچہ ہمارے جنوری تا مارچ 2009ء کے شمارہ میں ان دونوں کو بیک وقت موضوع بنایا گیا۔ "تکفیری بیانیہ" بھی اُس ایک ہی شمارہ میں ہمارے زیرِ بحث آیا

اور اس کا ''جوابی بیانیہ'' بھی:

۱) ''تکفیری بیانیہ'' کی نقاب کشائی کے لیے ہم نے اس گمراہ فکر کی اصل خالق مصر کی جماعۃ التکفیر والہجرۃ پر ایک مضمون دیا۔ یہ مضمون بعض عرب اہل علم کی جانب سے دورِ حاضر کے گمراہ افکار و فرقہ جات پر تیار کردہ ایک انسائیکلوپیڈیا ''الموسوعة المُیَسَّرَة فی الأدیان والمذاهب والأحزاب المعاصرة'' سے ایک فصل تھی جو اردو استفادہ کی صورت ایقاظ میں پیش ہوئی تھی، اور باقاعدہ حوالہ کے ساتھ۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ اس رُوٹ پر چل کر لوگ اس نوبت کو جا پہنچتے رہے ہیں؛ لہٰذا اس کو شروع کرنے سے ہی خبردار رہا جائے۔ نیز یہ کہ خرانٹ 'جوابی بیانیہ' تو باری باری یہاں ہر کسی کو تکفیری قرار دینے چل پڑے گا، یوں بھی ہمارے اِس ماحول کے لیے یہ لفظ ہی ایک نیا ہے جس کا صحیح اطلاق بھی لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ کس پر بولا جائے، البتہ وہ آزاد عرب علمائے سنت (جو سلاطین کے زیر اثر نہیں) 'تکفیری' کا لفظ بنیادی طور پر انہی طبقوں کے لیے بولتے ہیں جو ''الموسوعة المُیَسَّرَة'' میں محوّلہ جماعۃ التکفیر والہجرۃ ایسی فکر پر یا اس کے کچھ قریب ہو۔

۲) 'تکفیر' کا 'جوابی بیانیہ' جو ہمیں بی بی سی نے بہت بروقت پڑھانا شروع کر دیا تھا، اور اس کے ساتھ میں این جی اوز، پھر یہاں کے جدت پسند، نیز عرب ملکوں میں جملہ اسلامی تحریکوں کی شدید ترین مخالفت میں سامنے آنے والی اور ان میں سے ایک ایک کو 'تکفیری' ٹھہرانے والی ایک فکری رَو جو کہیں پر 'مدخلی' کے نام سے معروف رہی ہے تو کہیں پر 'جامی' کے نام سے، اور جس کے لوگوں نے بڑے عرصے سے برصغیر پاک و ہند میں دیوبندیوں

سے لے کر جماعتِ اسلامی، ذاکر نائیک، تنظیم اسلامی، تبلیغی جماعت، جماعۃ الدعوۃ اور نہ جانے کس کس کے خلاف فتویٰ کا بازار گرم کر رکھا تھا، ہر ایک کو 'منہجِ سلف سے منحرف' اور 'ولی الامر کی بیعت میں نہ رہنے' کی بنیاد پر گمراہ ٹھہرا رکھا تھا[اور یہ (مدخلی / جامی) واحد گروہ تھا جس نے جملہ اسلامی تحریکوں کے خلاف کچھ تحریری محنت کر رکھی اور ان میں سے ایک ایک کو 'تکفیری' کے خانے میں ڈالنے کے 'دلائل' تیار حالت میں مہیا کر رکھے تھے، تاکہ جس بھی ملک میں 'تکفیری بیانیہ' سے پریشان ہو کر لوگ بھاگیں تو آگے انہیں مدخلی / جامی بیانیہ دستیاب ملے (جہاں وہ 'تیار' دلائل سے استفادہ کریں!) یہ مدخلی / جامی بیانیہ ایک بار امپورٹ ہو جائے تو اصل 'خرابی کی جڑ' خودبخود وہ اسلامی جماعتیں نظر آنے لگیں گی جن کا مدعا کسی نہ کسی انداز میں یہ ہے کہ **یہاں اسلام نہیں اور وہ یہاں اسلام لانا چاہتی ہیں** ('شدت پسندی' کے خلاف مہم میں آگے چل کر ان میں سے ایک ایک جماعت کی باری آنے والی تھی۔ یہ تھی 'جوابی بیانیہ' کی اصل غرض وغایت۔ 'تکفیری' تو اس میں سائڈ پر رہ جانے تھے۔ 'تکفیریوں' کو تو شروع کے کچھ سال محض اِس مسئلہ کا 'عنوان' بنایا جانا تھا البتہ میڈیا ٹرائل اپنے اپنے وقت پر بہت سوں کا ہونا تھا۔ غرض 'تکفیریوں' پر تھوڑا وقت لگا لینے کے بعد اصل رخ ان بھلی جماعتوں کی طرف ہونا تھا جو مغرب کے دیے ہوئے 'جدید ریاست' کے تصور پر دل سے ایمان لانے میں ابھی تک قاصر رہی ہیں)۔ یہاں ہم قاری پر واضح کر دیں، اس مدخلی بیانیہ کی رُو سے (جو عرب سے امپورٹ ہوا) اخوان اور جماعتِ اسلامی مسلمانوں کی معاصر تاریخ میں ''تکفیر'' کی امام ہیں۔ ہر وہ جماعت جس نے اپنے ملک

کے حکمران کی بیعت نہیں کر رکھی اور وہ حکمران پر سرِعام تنقید بھی کر لیتی ہے، ان کی لغت میں 'تکفیری' ہے۔یہی بات اس سے ایک زیادہ گھناؤنے انداز میں آپ کو غامدی بیانیہ میں نظر آتی ہے جس نے پاکستان کے دینی مدارس میں پڑھانے والے سب لوگوں کو بلا استثناء 'دہشتگردی' کی تعلیم دینے والا قرار دے رکھا ہے۔ان کا کہنا ہے ہر وہ شخص جو 'نیشن سٹیٹ' کے تصور کو خلاف اسلام کہتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی پر امن کیوں نہ ہو اور اسلام کے نام پر ہونے والی اس خونریز کا کتنا ہی بڑا مخالف کیوں نہ ہو، دہشتگردی کا پرورش کنندہ ہے۔ جبکہ اِس ٹیم کے تیسرے کھلاڑی لبرلز / این جی اوز کا 'تصورِ تکفیر' یہ کہتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھنے والی وہ دینی جماعتیں جو بڑی گرمجوشی کے ساتھ جمہوری عمل میں بھاگی دوڑی پھرتی دکھائی نہیں دیتیں اور جدید اصطلاحات کو پورے اخلاص کے ساتھ نہیں جَپ رہیں، پھر وضع قطع میں بھی ذرا ایک پرانا نقشہ پیش کرنے کے باعث ایک پرانے دور کی یاد دلاتی ہیں، ان سب کے ہاں ہی معاملہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور ان کو 'سیدھا' کرنا ضروری! یہ تینوں دھارے (مدخلی، غامدی اور لبرل) مل کر ایک جوابی بیانیہ کی تشکیل کر رہے تھے]۔ غرض ایسے بہت سے لوگ جو اس تاریخی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے گھر میں ایک بڑی واردات کرنے چلے آئے، اور اس افراتفری میں ہمارے بہت سے مسلَّمات ہی ہمارے ہاتھ سے چھڑوانے کے لیے ایک 'جوابی بیانیہ' ہمارے منہ میں دے رہے تھے... اِس پر متنبہ کرنے کے لیے ہمارے اُس شمارہ میں مضمون دیا گیا "کیا مرجئہ طے کریں گے تکفیری کون ہیں"۔ اس میں ہم نے خبردار کیا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ایک ایسا

بیانیہ بیچا جا رہا ہے جس میں ہندو تک کو کافر اور مشرک کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی اور جس کی نئی نسل باقاعدہ فتویٰ کی زبان میں یہ کہنے لگ گئی ہے کہ مسلمان عورت کے ہندو مرد سے نکاح کو حرام کہنے کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں، کیونکہ مشرک آج کے زمانے میں ہندو تو کیا کسی بھی ابن آدم کو نہیں کہا جا سکتا! غرض ہندو تک کو کافر کہنا اس (غامدی) بیانیہ کے تحت عنقریب 'شدت پسندی' کے زمرے میں آنے والا ہے۔ نیز اللہ کی شریعت کے مقابلے پر کوئی اور شریعت لانے ایسے فعل پر کفر کا اطلاق کرنے والے کو بھی 'تکفیری' کے خانے میں ڈلوا کر ایک چیپٹر کلوز کروانے کی تیاری ہے جبکہ ہمارے جہابذۂ علم کی ایک تعداد نے اس چیز پر کفر کا اطلاق کیا ہے مانند ابن کثیر، علامہ احمد شاکر اور مفتی ابراہیم وغیرہ۔ (اُس مضمون میں ہم 'اعتقاد' اور 'عدم اعتقاد' کی بحث میں نہیں پڑے، صرف ایک اصولی بات کی تھی۔ البتہ اتنی وضاحت پھر بھی کر دی تھی کہ حکمِ مطلق اور حکمِ معیّن کے مابین فرق کرنا اصولِ اہلسنت میں ایک باقاعدہ اصول ہے (جس کو ہمارے معترضین نے سراہا بھی)۔[1] مراد یہ کہ ایک

[1] ہمارے حوالے سے اس قاعدہ کو سراہنے کے باوجود (جو کہ ہمارا نہیں، علمائے سنت کے ہاں بیان ہونے والا ایک معروف قاعدہ ہے) بعض حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خود ہم بھی حکمرانوں کی تکفیر کرتے ہیں اور اگر جان بخشی کے قائل ہیں تو صرف عوام کی! (یعنی ہمارے اس قاعدہ کو بیان کرنے اور ان کے اسے سراہنے کا کچھ فائدہ نہ ہوا!) حالانکہ جو بات ہم نے کہی وہ یہ کہ: ''تکفیری'' کی اصطلاح (غیر علمائے سلطان) عرب حلقوں میں عموماً ان طبقوں پر بولی جاتی ہے جو صرف حکمرانوں کو نہیں بلکہ عام معاشروں کو اپنی تکفیر کی زد میں لاتے ہیں۔ البتہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہمارے ایک دوسرے شمارہ میں ایک مضمون علیحدہ سے اس صریح عنوان کے ساتھ دے بھی رکھا گیا ہے کہ

"ہم حکمرانوں کی معیّن تکفیر کیوں نہیں کرتے"۔ بھئی جب ہم یہ قاعدہ بیان کر رہے ہیں کہ حکمِ مطلق حکمِ معیّن کو خود بخود لازم نہیں (بلکہ ثانی الذکر کسی اجتماعی فتویٰ کی صورت میں جب تک علمائے امت کی طرف سے ہی نہیں آتا تب تک کسی معیّن شخص یا ادارے پر وہ حکم نہیں لگایا جاسکتا، یہ بات ہمارے مضامین میں بکثرت دہرائی گئی ہے) تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم تو علماء کے کسی اجتماعی فتویٰ کے بغیر کسی معیّن شخص یا ادارے یا گروہ کی بابت ایسی کوئی بات کہنے کے روادار نہیں۔

بعض معترضین کی یہ منطق بھی عجیب رہی کہ جو حکم حکمرانوں کا عین وہی حکم عوام کا ہونا لازم ہے (اغلباً ان کو منتخب کرنے کی وجہ سے)، ورنہ یہ 'کھلا تضاد' ہوگا! جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم تو حکمرانوں کو معیّن کر کے نہ کافر کہتے ہیں اور نہ فاسق، بلکہ ایسی کسی بھی بات کے لیے علمائے امت کی جانب سے کوئی اجتماعی فتویٰ آنے کی شرط ہی لگاتے ہیں، اور اگر ایسا کوئی اجتماعی فتویٰ ہمارے علم میں نہ ہو تو کچھ اپنے پاس سے نہیں کہتے اور حکمرانوں سمیت سب کا اصلی حکم مسلمان ہی مانتے ہیں، اور وہ حکم اپنے اصل پر باقی ہے۔ البتہ ان معترضین میں سے کئی ایک کو ہم نے حکمرانوں کو فاسق کہتے سنا ہے۔ تو کیا یہ انہیں منتخب کرنے والے عوام الناس کو فاسق کہتے ہیں؟ کہ جو حکم حکمرانوں کا وہ عوام کا!

بھائی یہ (حکمِ مطلق و حکمِ معین میں فرق) والا قاعدہ یہ بحثیں ہی تو ختم کراتا ہے، حکمرانوں کی بابت بھی اور عوام الناس کی بابت بھی۔ بلکہ ہر کسی کی بابت۔ اِس قاعدہ کے بغیر آپ عوام کی بابت اپنا 'تضاد' دور فرما کر دکھا دیجئے: علمائے توحید کا "غیر اللہ کو پکارنے والے کو مشرک کہنا" عوام کی کتنی بڑی خلقت کو اپنی زد میں لے سکتا ہے؟ اِلا یہ کہ آپ غیر اللہ کو پکارنے کو شرک ہی نہ کہتے ہوں! (یا اسی طرح کے کچھ دیگر شرکیہ اقوال وافعال جو عوام الناس کی ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں)۔ تو کیا اگر آپ ایسے کسی قول یا فعل کو شرک سمجھتے ہیں، ہم یہ کہہ دیں کہ پاکستان کے کروڑوں لوگوں کو آپ مشرک سمجھتے ہیں؟ ظاہر ہے یہاں ہم (حکمِ مطلق اور حکمِ معیّن میں فرق والے) اس قاعدہ کی بنیاد پر ہی آپ کی بابت ایسا نہیں سمجھیں گے، ورنہ آپ کروڑوں انسانوں کی تکفیر کرنے والے ہوئے۔ یہ قاعدہ جب بار بار ہم بیان کرتے ہیں تو آخر ہمیں ہی اس کا فائدہ کیوں نہیں مل سکتا اور ہماری بابت یہ اصرار کیوں کہ ہم بغیر فتوائے علماء کسی کی تکفیر کرتے ہیں، جبکہ ہم مسلسل اس بات سے انکاری ہیں؟

قول یا فعل یا رویے کو اصولی انداز میں کفر کہنا محض ایک وعید، تنبیہ اور سرزنش ہوتی ہے؛ کہ لوگ اس کی سنگینی سے خبردار رہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ اس کے قائل یا مرتکب کو معیّن کر کے اس پر کفر کا وہ حکم لگا بھی دیں۔ ہاں معیّن شخص پر حکم لگانے کے لیے الگ سے ایک پراسیس ہے (اور نہایت دقیق اور مشکل ہے) جو علمائے امت کے انجام دینے کا ہے، عامۃ الناس یا طلبۂ علم کا یہاں کوئی کام ہی نہیں ہے۔ نیز اس جانب بھی اشارہ کر دیا تھا کہ تکفیری طبقوں کے ہاں اس قاعدہ کا التزام نہیں کیا جاتا اور وہ محض کچھ عمومیات کی بنیاد پر لوگوں، اداروں اور اشخاص کو معیّن کر کے انہیں کافر قرار دینے چل پڑتے ہیں)۔ یہ تھا ہمارے اُس مضمون کا اصل سیاق۔

۳) پھر اس موضوع پر ایک منہجِ وسط بتانے کے لیے کویت کے ایک عالمِ دین شیخ حامد العلی کا ایک مضمون ”تکفیر جو حق ہے اور تکفیر جو ناحق ہے“ بھی اردو استفادہ کی صورت ہمارے اسی شمارہ میں دیا گیا۔ جس میں واضح کیا گیا تھا کہ کلچرل گلوبلائزیشن کی ایک عالمی تحریک مسلمانوں کے یہاں پائے جانے والے ”کافر و مسلم کے فرق“ کو ملیامیٹ کروا دینے کے لیے حالیہ صورتحال کو بڑی چالاکی کے ساتھ استعمال کر رہی ہے۔ ایک صالح معنیٰ میں ”تکفیر“ اسلام کی ایک مضبوط فصیل بھی ہے جسے گرا کر یہ (کلچرل گلوبلائزیشن کی تحریک) سب معاملہ چوپٹ کر دینا چاہتی ہے: ہندو اور یہود و نصاریٰ کو کافر جاننا ہمارے دین کا حصہ ہے۔ اسی طرح قادیانیوں وغیرہ ایسے طبقوں کو دین سے خارج قرار دینا ہمارا ایک مسلّمہ قاعدہ ہے، جسے (تکفیریوں کی کچھ بے ضابطگیوں کا فائدہ اٹھا کر) آج ہمارے یہاں سرے

سے متروک کروانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دوسری جانب اسی مضمون میں اُس تکفیر کی بھی کچھ وضاحت کی گئی جو ناحق ہے اور جس کا آغاز مصر کی جیلوں سے ایک تشدد کے نتیجے میں رد عمل کے طور پر ہوا اور پھر ہوتے ہوتے باقاعدہ ایک فتنے کی صورت اختیار کر گیا اور دینی جذبہ رکھنے والے کم علم نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہاں اس سے متنبہ ہونے کی شدید ضرورت ہے۔

یہ تھا ہمارا وہ خصوصی شمارہ (جنوری تا مارچ 2009) جو [(1) تکفیر] اور [(2) اس کے گلوبلسٹ / ارجائی بیانیہ] ہر دو کے ردّ پر دیا گیا۔ ان میں سے ایک ہی بیانیہ کا رد کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ دوسرے بیانیہ کے ہاتھ مضبوط ہونے دیں۔ "فکری راہنمائی" ظاہر ہے اسے نہیں کہیں گے (یہ تو میڈیا کی تھاپ پر رقص کرنے کے مترادف ہوتا، جو افسوسناک طور پر بعض دینی طبقوں کی جانب سے ہوا بھی)۔ ہمیں ان دو فتنوں کو عالم اسلام پر حملہ آور ہوتے ہوئے بیک وقت دیکھنا اور قوم کو دکھانا تھا۔ شاید اب جا کر کچھ لوگوں کو اندازہ ہونے لگا ہو کہ اس دوسرے فتنے ('جوابی بیانیہ') سے قوم کو بروقت خبردار کرنا بھی کس قدر ضروری تھا اور اس میں ہو جانے والی تاخیر کی بھی آج ہمیں کیسی کیسی قیمت دینا پڑ رہی ہے۔[2] (اس کے نتیجے

[2] حق یہ ہے کہ ہر دو بیانیہ کے رد میں ہم (اسلامی سیکٹر) سے بہت تاخیر اور تقصیر ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ کہ اسلامی سیکٹر اس وقت دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔ اس سے براوقت دینی طبقوں پر اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اِس 'جوابی بیانیہ' کے آڑے آنے کا بھی صحیح طریقہ یہی تھا کہ 'تکفیری بیانیہ' کے راستے کی سب سے بڑی دیوار بن کر یہاں اسلامی سیکٹر ہی سامنے آتا اور وہ بھی ایک ایسی خوش اسلوبی سے کہ نوجوانوں کی اتنی تعداد 'تکفیر' کی جانب لڑھکنے ہی نہ پاتی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے یہاں تکفیری بیانیہ کا علمی رد ہی مفقود تھا۔ اور جو تھا وہ نادانستہ 'جوابی بیانیہ' کے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا۔ اس کے نقصانات پر اداریہ کی بعض فصول میں ہم نے کچھ تفصیل سے بات کی ہے۔

میں صورتحال آج یہ ہو چکی ہے کہ لبرل شیاطین نے ان طبقوں تک کو صاف دھر لیا ہے جن کے ہاں ثالثی عدالتوں کی ملکی دستور میں باقاعدہ گنجائش استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے کچھ معاملات شریعتِ محمدی کے مطابق حسبِ استطاعت سلجھا لیے جاتے تھے۔ (کہ یہ بھی کیوں ہے اس لبرلسٹ راج میں؟!) ظالم اس کو بھی اُس چیز سے جوڑنے لگے جس کے خلاف کلچرل گلوبلائزیشن کی جانب سے جنگ کے طبل بجا رکھے گئے ہیں)۔

دوبارہ واضح کر دیں، ابن کثیر، احمد شاکر اور مفتی محمد ابراہیم وغیر ھم رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال ہمارے اُس مضمون میں محض اس سیاق کے اندر دیے گئے تھے کہ امت کو شناخت کروادی جائے کہ یہ اہل علم کے ہاں پائے جانے والے کچھ باقاعدہ مباحث اور اقوال ہیں جنہیں عنقریب 'تکفیری' بیانیہ کے ساتھ خلط کر دیا جانے والا ہے (بلکہ بعض عرب ملکوں میں ایسا کر دیا گیا ہے)۔ ہاں ان اقوال کی پوری تفسیر کیا ہے، اور آیا اس میں 'اعتقاد' کی شرط مضمر ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو اس کی صحیح صورت کیا ہے... تو ظاہر ہے یہ وہاں ہمارا موضوع نہ تھا۔ بس یہ تنبیہ کافی تھی کہ جہاں تک ان اشیاء کو کسی واقعاتی صورتحال پر لاگو کرنے کا تعلق ہے تو (حکم مطلق و حکم معین میں فرق والے اصول کے تحت) یہ علمائے امت پر چھوڑ دینے کی باتیں ہیں، کیونکہ امت کی سطح کے مسئلے ہیں، عامی یا کسی اِکا دُکا عالم کے اپنے ہاتھ میں لینے کی چیز نہیں۔ اور پھر خونوں کو مباح کرنے کا مسئلہ تو اور بھی سنگین ہے۔ مسئلۂ 'حاکمیت' اُس مضمون میں البتہ ہمارا موضوع نہ تھا۔ اس سے متعلقہ کچھ چیزیں آئیں تو صرف اِس سیاق میں کہ یہ علمائے سنت کے ہاں متداول کچھ مباحث ہیں جن پر 'تکفیری' کے کھاتے سے ایک قینچی پھرنے والی ہے۔ ان مباحث پر اگر سب علماء کا اتفاق نہیں بھی ہے (مفروضتاً بات ہو رہی ہے) یا اس اجمال کی اگر کچھ اور تفصیل بھی ہے... تو بھی اسے علماء کے ایک فریق کی رائے کے طور پر یا علماء کے ہاں پائی جانے والی ایک مجمل عبارت کے طور پر کم از کم دیکھا جائے۔ نہ کہ اُس 'جوابی بیانیہ' کی رَو میں بہہ کر یہ سب کچھ 'تکفیر' کی ٹوکری میں پھینک دیا

جائے، اور جو کہ بلاشبہ اس (’جوابی بیانیہ) کا ایک بڑا ہدف ہے۔ بلکہ یہاں تو ہندوؤں اور قادیانیوں کی تکفیر تک کو ’خلافِ شریعت‘ ٹھہرایا جانے والا ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے۔

*****

یہ تھی اُس وقت تک کی صورتحال جب ہمارا وہ مضمون لکھا گیا۔ جنوری 2009ء۔ اُس وقت موضوع ”تکفیر“ اور ”تکفیری“ ہی تھے۔ لہٰذا ان دونوں کی بابت ہمارے اُس شمارہ میں کچھ گفتگو ہوئی۔ ”ارجاء“ یا ”مرجئہ“ اُس وقت تک موضوع نہیں تھے۔ اس کا کچھ ذکر ہمارے ہاں ’جوابی بیانیہ‘ پر نقد کے باب سے جانبی طور پر آیا تھا نہ کہ بذاتِ خود کسی موضوع کے طور پر۔

پھر یہ بھی واضح ہے کہ ہمارے مضامین میں یہاں کی ان سب جماعتوں کو وقت کی اہل سنت قوتوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے: جماعتِ اسلامی، جماعۃ الدعوۃ، تنظیمِ اسلامی، تبلیغی جماعت، الہدیٰ وغیرہ۔ ایقاظ کی یہ ٹون tone ہمیشہ واضح رہی ہے اور ہر ابہام سے بالاتر۔ نوجوانوں کو اِن جماعتوں کا دست و بازو بننے کی ہمارے یہاں ہمیشہ ترغیب دلائی گئی ہے۔ جب ہم جابجا ان کو اہل سنت جماعتوں کے طور پر پیش کرتے ہیں... تو ان میں سے کسی کو ’خارجی‘ یا کسی کو ’مرجئہ‘ کے طور پر پیش کرنے کا سوال ہی نہیں۔ ہم ان میں سے اور یہ ہم میں سے۔ بے شمار مواقع پر ان کے ساتھ ہمارا یکجہتی کا یہ اسلوب کھل کر سامنے آیا ہے۔ پس واضح ہو، 2009ء کے ہمارے اس (محولہ بالا) مضمون کی اگر کوئی چوٹ ہے تو وہ لبرل / مدخلی / غامدی بیانیہ پر ہے۔ ہاں ان کی بابت ہمارے یہاں ایک شدید اسلوب آپ کو اور بہت سے مقامات پر ملے گا۔ قاعدہ بھی یہی ہے کہ قائل کی ایک بات میں اگر کوئی اجمال رہ گیا ہو تو اسے ان مفصل مقامات کی روشنی میں سمجھ لیا جائے جو اس نے کچھ اور موقعوں پر لکھ یا بول رکھے ہوں، یا جو بات وہ بکثرت کرتا ہو۔ یہ وضاحت اس لیے کہ یہاں کے وہ دعوتی یا جہادی یا سیاسی حلقے جنہیں ہم اہل سنت جماعتیں گنتے ہیں کسی بھی طور ہمارے

اُس مضمون کا ہدف نہیں تھے۔ اور نہ ہو سکتے تھے۔ ایقاظ کے ایک قاری سے یہ بات کبھی مِس miss نہیں ہو سکتی۔

*****

بعد ازاں یہ ہوا کہ تکفیر اور مار دھاڑ کی فکر پھیلانے والے عناصر ان اہل سنت طبقوں یا ان میں سے بعض کے لیے "مرجئہ" ایسے القابات نشر کرنے لگے۔ ستم ظریفی دیکھیے، مدخلی بیانیہ کے لوگ ان جماعتوں (مانند جماعۃ الدعوۃ، جماعتِ اسلامی، تنظیم اسلامی وغیرہ) کو تکفیری گنتے رہے کیونکہ یہ 'ولی الامر' کی بیعت نہیں۔ غامدی بیانیہ انہیں فساد اور دہشتگردی سے جوڑتا رہا کیونکہ غامدی کی اسلامائز کر دی گئی بہت سی چیزوں کو یہ سارا طبقہ خلافِ اسلام جانتا اور ان کے مقابلے پر قوم میں اسلامی حمیت اور ایک فکری مزاحمت پیدا کراتا ہے، نیز قادیانیوں کو کافر قرار دے رکھنے یا ناموسِ رسالت وغیرہ ایسے قانون کے تحفظ میں ایک اہم کردار رکھتا ہے۔ دوسری جانب ملک میں خونریزی کے داعی طبقے ان کو مرجئہ گنتے رہے، کیونکہ یہ ملکی سالمیت کی روحِ رواں جماعتیں ہیں اور ملکی اداروں کے ساتھ خاص اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی خاطر (نہ کہ کسی خلافِ شریعت معاملہ میں) حسب ضرورت تعاون کرتی ہیں۔ بلکہ یہ وہ خاص وجہ ہے (ملکی سالمیت کی روحِ رواں جماعتیں ہونا، نیز ملکی اداروں سے ایک درجہ میں متعاون ہونا) جس کے باعث یہاں کے لبرل بھی سب سے زیادہ انہی کے مخالف ہو گئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ بے شمار اشارے اس بات پر موجود ہیں کہ 'لبرل' اور 'تکفیری' مل کر اِس ملک کا کام تمام کرنے کے خواب دیکھتے ہیں، اور اپنی حد تک اس کی کوشش بھی۔ (انصاف کے لیے، ضروی نہیں سب لبرل اور ضروری نہیں سب تکفیری۔ مگر ان ہر دو طبقوں کی ایک تعداد، جو اپنے تصرفات میں ان آخری سالوں کے دوران خاصی نمایاں بھی ہو چکی ہے)۔

*****

مسلم معاشرے میں کسی شخص یا ٹولے کا علمی محاکمہ کرنے کا مجاز کوئی طبقہ ہے تو وہ علماء ہیں۔ انہی کو اللہ نے وہ علم دیا ہے کہ یہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ سے استدلالات کی صحت اور سقم کا فیصلہ کر سکیں۔ آپ ہمیشہ دیکھیں گے اہل بدعت کی چپقلش سب سے بڑھ کر اگر کسی کے ساتھ ہوتی ہے تو وہ علمائے امت ہیں۔ چنانچہ جدت پسندوں کو دیکھیں تو سب سے زیادہ ان کے مسئلے علماء کے ساتھ نظر آئیں گے۔ دوسری جانب شدت پسندوں کو دیکھیں تو سب سے زیادہ ہدفِ تنقید ان کے ہاں علماء دیکھے جائیں گے۔ علماء کے بعد پھر وہ طبقے ہیں جو علماء کے کہنے میں ہیں اور ان نئی نئی چیزوں کو ردّ کرنے میں جو ایک طرف جدت پسندوں کی طرف سے ایجاد کی جارہی ہیں تو دوسری طرف شدت پسندوں کی طرف سے نکالی جارہی ہیں، یہ علمائے امت کی طرف رجوع کرتے اور ان اشیاء کے مقابلے پر مسلمانوں کی علمی روایت کا احترام قائم کرواتے ہیں۔

غرض جن علماء نے ان انحرافات کا علمی محاکمہ کرنا تھا، انہی کی حیثیت متنازعہ کر رکھنا ان ٹولوں کا ایک معروف طریقۂ ورادت ہے۔ چنانچہ یہ دونوں فریق ایسے ہیں جو علماء کا مقدمہ 'عوام کی عدالت' میں لے جانے کے لیے پر تولیں گے۔ نیز عوام میں ان (علمائے امت) کو برا بھلا جاننے کی ایک ریت ڈالیں گے کہ یہ تو کسی قابل ہی نہیں۔ (یہ اس قابل ہوتے تو بھلا ہم ان سے الگ تھلگ فتوے دیتے تم کو نظر آتے؟!) وجہ وہی کہ علماء کے پاس ان دونوں کی دال نہیں گلتی۔ لہٰذا یہ دونوں ہمیشہ علماء کو بائی پاس کرتے ہوئے عامی طبقوں کو اپروچ کرتے نظر آئیں گے، جہاں کہیں نہ کہیں ان کو اپنے پیروکار مل ہی جاتے ہیں۔ اور پھر ان (عامی) طبقوں کے ہاں یہ اپنی ایک علمی اتھارٹی قائم کر کے خود اپنے آپ ہی کو 'علماء' کے طور پر پیش کر لیتے ہیں... تا آنکہ ایک باقاعدہ فرقہ بن جاتے ہیں جو ہر چیز میں خاص اپنے مراجع اور اپنے معیارات وروایات conventions رکھنے لگتا ہے۔ آخر آسانیِ مبحث کی خاطر پیروکار اسی کے حوالے دے لیتے ہیں (ویسے ہوتی وہ بات 'کتاب وسنت' کی ہے)!

ایسے فکری ٹولے ہزاروں کے حساب سے امت میں بنتے اور بگڑتے آئے ہیں۔ ان کی اندرونی اکھاڑ پچھاڑ بھی چلتی ہی رہتی ہے۔ ان میں سے ایک ایک ٹولہ ہر تھوڑے عرصے بعد اپنی جون بدلتا ہے۔ ہر چند سال بعد یہ وہ نہیں ہوتا جو کچھ عرصہ پہلے تھا۔ نئے نئے انکشافات کا سلسلہ ان پر جاری رہتا ہے اور 'دل کا دریا' مسلسل موڑ مڑتا ہے۔

اس کے مقابلے پر اہل سنت کے دو وصف آپ لازماً دیکھیں گے: تسلسل اور یکسانیت۔

ا) تسلسل یہ کہ یہ پیچھے سے چلے آتے ہیں؛ کوئی آج نہیں بنے۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ بطورِ فکر یا بطورِ مجموعۂ استدلالات ان کی تاریخ پیدائش 'سن اتنے سو اتنے' بتائی جا سکے (اور وہ بھی دین کے اساسی مسائل کی تفسیر و تشریح کے سلسلہ میں)۔ یہ (اہل سنت) اپنے استدلالات میں اسلام کے دورِ اول سے ایک تسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں؛ اور یہی ان کے حق ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل۔ دوسری جانب انقطاع اہل بدعت کی ایک بہت بڑی پہچان ہے۔ یعنی اپنے استدلالات میں ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے نہ جا سکنا، اور امت سے ان کا وجہ امتیاز ہی یہ ہونا کہ یہ ایسی باتیں سامنے لا رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئیں اور یہ کہ امت میں ان باتوں کا ایک تسلسل مفقود ہے۔[3] اہل بدعت اس (انقطاع) کے

---

[3] یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آج کوئی آدمی ایسی بات کرے جو بڑی صدیاں پہلے معتزلہ یا خوارج بھی کر گئے تھے۔ اور اس لحاظ سے اس کی بابت یہ نہ کہا جا سکے کہ اس نے ایسی بات کی ہے جو اس سے پہلے امت میں کسی نے نہیں کی (کیونکہ معتزلہ یا خوارج وہ بات کر چکے ہیں، اس لحاظ سے یہ بات نئی نہیں ہے)۔ اور اس صورت میں ہم کہیں گے، اس کا انقطاع ذرا پیچھے سے چلا جاتا ہے اور یہ کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ کا مصداق ہے۔ اور بلاشبہ مختلف ادوار کی بدعات میں

بغیر ہو ہی نہیں سکتے۔ جبکہ اپنے افکار اور استدلالات میں ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے جاسکنا اہل سنت کی ایک بہت بڑی پہچان۔

ا) یکسانیت سے ہماری مراد یہ کہ: ہر خطہ میں یہ آپ کو قدرتی طور پر ایک سی بات کرتے ملیں گے۔ آپ مراکش چلے جائیں یا یمن چلے جائیں یا پاکستان آجائیں، مالکیہ ہوں یا شافعیہ یا حنفیہ یا حنابلہ، اساسیاتِ دین میں یہ سب آپ کو بے ساختہ ایک سے دکھائی دیں گے۔ ان کے ایک خطہ نے دوسرے خطہ کو اپنا 'لٹریچر' نہیں پہنچایا ہو گا۔ یہ ایک دوسرے کے افکارِ تازہ سے 'مطلع' نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ ایک سی بات کر رہے ہوں گے۔ اپنے دور کے کسی فتنہ کی بابت ان کا ایک سا ردِ عمل ہو گا۔ سب پیش آمدہ مسائل میں ان کا رویہ تقریباً ایک سا ہو گا۔ غرض کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ ان کے مابین آج جا کر کوئی ایکا ہوا ہے اور یہ ایک دوسرے سے فکری طور پر 'متاثر' ہو کر ایک سی بات کرنے لگے ہیں۔ بلکہ یہ یگانگت ان کے مابین قدرتی اور بے ساختہ ہے۔ اور یہ اہل سنت کی دوسری بڑی پہچان ہے۔

پوری اسلامی تاریخ کے دوران، اور پورے عالمِ اسلام کے اندر، اسلام کی تعبیر کے معاملہ میں یہ تسلسل اور یہ یکسانیت مسلمان معاشروں کو ان کے علماء کے ذریعے ہی ملی ہوتی ہے۔ ورنہ اتنی طویل تاریخ میں، اور اتنے بڑے عالمِ اسلام کے اندر، معاملہ کچھ سے کچھ ہو گیا ہوتا، جیسا کہ دوسری امتوں میں خاصی حد تک ہوا بھی۔ چنانچہ اہل سنت کی ان دونوں

ایک گونا مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اپنے ان استدلالات میں نسل در نسل پیچھے چلا جاتا عہدِ صحابہؓ تک پہنچ جائے۔ یہ بات آپ کو صرف اہل سنت میں ملے گی۔

صفات کے پائندہ و تابندہ رہنے کا راز ان کے علماء ہیں۔ ہر نئی اُپج کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہوتے ہیں۔ جو اہل بدعت کو سب سے بڑھ کر چبھتے ہیں۔ 'مدارس' کی بابت اُن کا بس نہیں چلتا کہ کچا چبا جائیں! وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُورِہِ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُونَ

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں سامنے آنے والے شدت پسند بیانیہ کی سب سے عجیب بات یہی ہے کہ یہ عالم اسلام کے ہر ملک میں علماء کی مین اسٹریم mainstream کو ہی مرجئہ یا ارجاء سے موسوم کرنے لگے۔ یعنی وہ علماء جنہوں نے اِن کا علمی محاکمہ کرنا تھا، جن کی طرف دین کے فہم و استدلال کے معاملہ میں خود اِن کو رجوع کرنا تھا، اور جن کی علمی راہنمائی میں ان کو اپنا یہ سب راستہ طے کرنا تھا، اور جن کی ایک معتد بہ تعداد نے (اِن کے درست ہونے کی صورت میں) مسلم معاشروں کے سامنے اِن کے حق میں کلمۂ خیر کہنا تھا... وہ علماء ہی سب سے پہلے ان کے کٹہرے میں لا کھڑے کیے گئے! یہاں جج کی کرسی ہی اِن کے اپنے پاس ہے۔ علماء کے فیصلے اِن کے ہاتھ میں ہیں؛ اور علماء کو اِن سے سندِ توثیق پانی ہے! یعنی ابتداء سے ہی معاملہ الٹ دیا گیا۔

اِن حضرات کے ہاں معاملہ کی ترتیب عموماً یوں چلتی ہے کہ حکمرانوں اور پھر ان کے ساتھ اور بھی بہت سے (اور بعض کے نزدیک اکثر یا شاید سارے) ریاستی ادارے اپنے کارندوں سمیت کافر ہیں۔ نہ صرف کافر ہیں (معاذاللہ) بلکہ یہ بات اُن بدیہیات میں آتی ہے جو اس کے بعد کی سب باتوں کو طے کرنے میں کلیدی حیثیت رکھے گی۔ یعنی سب چیزیں اسی ایک بات کی روشنی میں طے ہوں گی۔ اب مثلاً سوال پیدا ہو گیا ہے کہ امت کے علماء کونسے ہیں جن کی طرف مسائلِ وقت (نوازل) کے معاملہ میں رجوع کیا جائے۔ ظاہر ہے وہی علماء ہو سکتے ہیں جو دین کے اِس بنیادی مسلّمہ و بدیہۃ (!) کو تسلیم کرتے ہیں [کہ حکمران اور ان کے ساتھ اور بھی بہت سے (اور بعض کے نزدیک اکثر یا شاید سارے) ادارے کافر ہیں!] اب دیکھئے نا جس عالم کو دین کے اِس بنیادی مسئلے کا ہی نہیں پتہ (!) اُس کے علم پر کیسے

اعتماد کیا جائے؟ بہت ہوا تو ان سے ’حیض اور نفاس‘ ایسے معاملات میں رجوع کر لیا جائے جن کے اندر یہ عالم ہیں! چنانچہ ایک چیز پہلے یہ خود طے کر دیں گے (حکمرانوں اور اداروں کی تکفیر)۔ اِس پہلی ہی بات میں البتہ علماء سے نہیں پوچھا جائے گا کیونکہ ان کو اس کا پتہ جو نہیں ہے! یہ پہلی بات علماء کی طرف نہیں لوٹانی؛ کیونکہ اس سے وہ رُوٹ ہی نہیں بنے گا جس پر یہ ایک نوجوان کو پلک جھپکتے میں چڑھالاتے ہیں۔ ہاں یہ پہلی بات اپنی طرف سے طے کر دینے اور اس کو بنیادی ترین مسلّمات میں ٹھہرا دینے کے بعد نوجونوں کو کسی وقت ’غور و فکر‘ کی دعوت بھی دے دی جائے گی کہ بھئی خود دیکھ لو کون علماء ہیں جن کے علم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے! اب یہاں نوجوان جب نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو تقریباً پورا عالم اسلام اس کو سائیں سائیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ’علماء‘ یہاں ہیں کہاں! دُور دُور تک دیکھ لو کہیں نظر آتے ہیں؟ نہیں بالکل نہیں۔ سبھی یا ’حق‘ سے ناواقف ہیں یا ’حق‘ کو چھپائے ہوئے ہیں! لہٰذا علماء اب بس وہی ہیں جو ’حق بات‘ کر رہے ہیں۔ (’حق بات‘ کا تعین سب سے پہلے کر دیا گیا تھا: اور وہ البتہ given تھی!)۔ بس اِنہی سے فتویٰ لو اور اِنہی کی طرف رجوع کرو!

یہ ہے معاملے کی ترتیب جو عموماً اختیار کی جاتی ہے۔

حالانکہ پورا عالمِ اسلام ایک بات سے سائیں سائیں کر رہا ہو، تو یہ کان کھڑے کر دینے والی بات ہونی چاہئے۔ لیکن یہاں جذباتیت ایک ابتدائی برین واشنگ کر چکی ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پورے عالمِ اسلام کو ایک بات سے سائیں سائیں کرتا دیکھ کر آدمی کو اس پر پریشان ہو جانے کی بجائے شرح صدر ہونے لگتا ہے کہ واقعی ان سب علماء کو اس قابل نہ جاننا بلاوجہ نہ تھا! اور پھر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی! ’وثوق‘ میں جوں جوں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے توں توں آدمی علمائے امت سے دور ہوتا اور اپنے ’خصوصی‘ مراجع کے ساتھ وابستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد... علمائے امت جو حکمرانوں اور ریاستی اداروں اور ان کے کارندوں کو

'کافر' کہنے کے مسئلہ سے 'واقف' نہیں یا اس معاملہ میں 'کتمانِ حق' سے کام لے رہے ہیں، خود بخود 'مرجئہ' کی صف میں جا کھڑے ہوئے!

*****

اہل سنت کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ خود اس کے اندر بہت سے اقوال ایسے ہیں کہ کوئی ان کا قائل ہے تو کوئی ان کا قائل نہیں ہے۔ جو قائل ہے وہ غیر قائل کو بدعتی ہونے کا طعنہ نہیں دیتا اور جو غیر قائل ہے وہ قائل کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پڑتا۔

تکفیر ہی کے معاملہ میں... امام احمدؒ اور ان سے پہلے متقدمین کی ایک بڑی تعداد تارکِ صلاۃ کی تکفیر کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ و امام شافعیؒ اور ان سے پہلے متقدمین کی ایک بڑی تعداد تارکِ صلاۃ کی تکفیر کرنے کی قائل نہیں ہے۔ ان میں کہیں کہیں علمی تبادلۂ آراء ہوا ہو گا۔ شافعیؒ اور احمدؒ کے مابین ایک مکالمہ اس موضوع پر مشہور بھی ہے۔ لیکن ایک نے دوسرے کو نہ تو "تکفیر" کی وجہ سے مذہبِ خوارج پر ٹھہرایا، حالانکہ نماز اعمال میں سے ایک عمل ہی ہے اور جبکہ خوارج کا یہ مذہب معلوم ہے کہ وہ اعمال کی بنیاد پر آدمی کی تکفیر کر دیتے ہیں، اور نہ "عدم تکفیر" کی وجہ سے مذہبِ ارجاء پر ٹھہرایا کہ یہ عمل کو ایمان سے خارج کر رہے ہیں! اس کے علاوہ کئی ایک مثالیں ہیں جن میں خود اہل سنت ہی کے اقوال "تکفیر و عدم تکفیر" کے معاملہ میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ سب بحثیں ائمہ و علماء کے دائرہ میں ہوتی ہیں۔

ہمارے 2009ء والے مضمون کی طرح، اِس مضمون کا موضوع بھی مسئلۂ حاکمیت نہیں ہے۔ البتہ لوگوں پر 'مرجئہ' کے فتوے لگانے والے حضرات سے ہم پوچھ لیتے ہیں کہ عالم اسلام کے ننانوے عشاریہ نو نو نو فیصد علماء اپنے اپنے ملک میں حکمرانوں کی تکفیر نہیں کرتے ان سب کو اگر تم مرجئہ ٹھہراتے ہو تو اِس پوری امت کی بابت تمہارا کیا گمان ہے؟ خود مفتی محمد ابراھیمؒ کی بابت، جن کے اقوال تم اپنی تائید میں لاتے ہو، (ہمارے علم کی حد تک)

کہیں نہیں آتا کہ انہوں فلاں اور فلاں حکمران کی تکفیر کرڈالی تھی۔ احمد شاکرؒ کی بابت ایسی کسی تعیین کا حوالہ دینا شاید ممکن نہ ہو۔ باوجود اس کے کہ یہ شخصیات ہمارے اِسی دور کی ہیں۔ اِن کے عہد میں وہ سب اعمال اِسی طرح تھے جس طرح ہمارے عہد میں۔

پس وہ سب علمی مباحث اپنی جگہ، مگر واقع میں ہماری پوری تاریخ کے اندر علماء کب یوں تکفیر کی طرف گئے ہیں؟ سورۃ المائدۃ کی آیات کے حوالہ سے بڑی بڑی سخت گفتگو آج کے علماء و مفسرین کے ہاں بھی آپ کو مل جائے گی۔ شنقیطیؒ کی اضواء البیان ہی ذرا ایک نظر پڑھ لیجئے، آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ مگر اپنے اردگرد میں وہ انسانوں کی تکفیر بھی کرنے چل پڑے ہوں، یہ واقعہ علماء کے ہاں کب ہوا ہے؟ پس وہ سب مباحث جو آپ علماء کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں، عمومیات کے باب سے ہیں۔ زیادہ تر، اس سے ایک تنبیہ اور سرزنش کر دینا مقصود ہوتا ہے اور ہاں اس میں کسی کسی وقت بڑا شدید اسلوب اختیار کر لیا جاتا ہے۔ البتہ عملاً بھی تکفیر کی تحریک چلا دی گئی ہو، یہ ماجرا آپ کو کہاں ملتا ہے؟

البتہ تمہارے ایسی تحریک کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ علماء کو ان ابواب میں علمی و تفسیری مباحث تک قلمبند کرتے وقت سوچنا پڑ جائے کہ باہر اس کا کیسا کیسا استعمال ہو جانے کا امکان ہے! بخدا ہم طالبعلموں کو بھی چند سال پہلے تک اس کا کہاں اندازہ تھا کہ علمی سیاق میں لکھی گئی چیزیں کیسے کیسے ہاتھ چڑھ سکتی ہیں۔ خود ہماری تحریروں سے نجانے کس کس کو 'مرجئہ' ثابت کیا جا رہا تھا!

اور پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ اصول و قواعد کی حد تک تو ارتداد کے مباحث آپ کو بڑی تفصیل سے مل جائیں گے۔ لیکن جہاں تک واقع میں ان اشیاء کو لوگوں پر لاگو کرنے کا تعلق ہے تو علماء کا عمومی رویہ لوگوں پر حکم لگانے سے جان چھڑانے اور زیادہ سے زیادہ بچنے کا ہے۔ زیادہ مقصد عمومی انداز میں قولِ بلیغ کہہ کر ہی پورا کر لیا جاتا تھا اور واقع میں لوگوں پر وہ حکم لگانے سے از حد بچنے کی کوشش ہوتی۔

اور پھر یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ "تکفیر" کا معاملہ اصل میں قضاء judiciary سے متعلق ہے۔ قضاء سے ہٹ کر کسی کو دین سے خارج قرار دینا اور اس پر مرتد کے احکام لاگو کرنا اپنے اصل سے خروج ہے، یعنی کسی خاص استثنائی حالت میں ہی علماء اس نوبت کو جائیں گے، ورنہ اصل یہ ہے کہ اس کا معاملہ خدا کے سپرد رکھیں اور ایک عمومی انداز کے قولِ بلیغ سے ہی جس قدر مقصد پورا ہو سکتا ہو کریں۔ لہٰذا، یہاں الگ سے ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ: ایک مسئلہ جس کو غیر قاضی سرے سے ہاتھ میں نہیں لے سکتا، اس کو ایک ایسی استثنائی صورت کب باور کیا جائے کہ ایک غیر قاضی بھی اس کا مجاز ہو جائے؟ پس مسئلے کی پیچیدگی یہاں دوچند ہوئی۔ (امت کی سطح کے معاملات میں) مسلمانوں کی حالیہ تاریخ کے اندر بے شک کسی وقت علماء کے اجتماعی فتویٰ نے یہ استثناء لی ہے، جیسے قادیانیوں کی بابت علماء کا اقدام، یا جیسے افغانستان کی تاریخ میں کسی ایک آدھ بار علماء کی جانب سے ایسا کوئی فتویٰ سامنے آنا (اس کی تفصیل میں جانا یہاں ہمارے لیے ممکن نہیں)۔ وغیرہ۔ لیکن یہ علماء ہی ہیں جو معاملے کی نوعیت اور خود اپنی پوزیشن دونوں کو دیکھ کر کسی کے کفر اسلام کا فیصلہ کرنے سے بھی پہلے ایک فیصلہ اپنی بابت یہ کریں گے کہ آیا یہاں ان کو وہ استثناء لینی ہے کہ غیر قاضی کی حیثیت میں یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں یا نہیں؟ جو بھی ہو یہ البتہ واضح ہے کہ ایسے کسی بھی واقعے میں علماء کی اتنی بڑی تعداد سامنے آتی رہی کہ امت ان کے پیچھے ہی کھڑی دیکھی گئی، وللہ الحمد۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ علماء نہایت صائب نظر تھے اور ان کو خوب معلوم تھا کہ کہاں امت ان کے ساتھ کھڑی ہو سکتی ہے اور کہاں نہیں ہو سکتی۔ عالم ہو تو یہ نظر وہ ضرور رکھتا ہے۔ بایں صورت، وہ اپنے علم اور فتویٰ کی لاج رکھتا ہے؛ اور جو کہ ضروری ہے۔ مشہور ہے، ہندوستان کے کسی بڑے عالم (اغلباً رشید گنگوہیؒ) سے نئی نئی پیپر کرنسی کی بابت فتویٰ صادر کرنے کے لیے کہا گیا تو فرمایا: بھئی پیپر کرنسی چلے گی میرا فتویٰ نہیں چلے گا۔ غرض حقیقی عالم بہت کچھ دیکھتا ہے۔ باوجود اس کے

کہ وہ حضرت پیپر کرنی سے متعلقہ "علمی مباحث" یہاں پر بھی بیان کر ہی سکتے تھے۔ مگر جیسا کہ ہم نے عرض کیا، علمی مباحث ایک چیز ہیں اور واقع کی بابت فتویٰ کی زبان میں کچھ کہنا بالکل اور چیز۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

*****

جہاں تک امت کو لے کر چلنے کا معاملہ ہے... تو یہاں سب سے پہلے، اور سب سے بڑھ کر، یہی ضروری ہے کہ اُس وسعت کی طرف آیا جائے جو عالم اسلام کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کی مین اسٹریم mainstream کے اندر سمو رکھی گئی ہے۔ کہیں پر یہ مین اسٹریم آپ کو کتنی ہی ناگوار لگتی ہے، لیکن امت کو لے کر چلنے کے لیے یہ شرط ہر حال میں آئے گی۔ اس کے بغیر آپ ایک 'تعلیمی' یا 'فکری' حلقہ بننا چاہیں تو بے شک بن لیں۔ امت کو لے کر چلنے والے اس کے بغیر آپ بہر حال نہیں ہو سکتے۔

واضح رہے ہم نے امت کو لے کر چلنے یا امت کی سطح کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی بات کی ہے۔ ہاں لوگوں کے اندر آپ کوئی خاص اعتقادی، یا فقہی، یا علمی، یا فنی ذوق پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہاں آپ جتنا مخصوص selective ہونا چاہیں، ہو جائیں۔ وہاں شرط بس اتنی ہو گی کہ آپ اہل سنت کے دائرہ سے نہ نکلیں۔ البتہ اہل سنت دائرہ کے اندر رہتے ہوئے آپ کسی مخصوص سرکل کو ہی لے کر چلنا چاہیں (کسی 'تعلیمی' یا 'فکری' عمل میں)، تو ضرور چلیں۔ باقیوں کو پوچھیں تک نہیں، کوئی حرج نہیں۔ جو آپ کے ساتھ چلنا چاہے گا چل لے گا۔ اور جو کسی اور اعتقادی یا فقہی یا علمی سرکل کے ساتھ چلنا چاہے وہ اپنے ارادے میں آزاد ہو گا۔ البتہ جس وقت آپ جائیں گے امت کے مسائل کو ہاتھ ڈالنے، اور امت کو اپنے ساتھ کھڑا کرنے، تو وہاں آپ کو اس خطہ کی اہلسنت مین-اسٹریم mainstream کی سطح پر ہی آنا ہو گا اور کسی ایک بھی سرکل کو نظر انداز نہیں کرنا ہو گا۔ وہاں اہل سنت سرکلز میں سے 'کوئی ایک مخصوص سرکل' کافی نہ ہو گا (مانند سلفی، وہابی، دیوبندی، اخوانی

وغیرہ)۔ بلکہ امت کے مسائل کو لے کر چلنے میں آپ کو اُس وسیع تر دائرہ پر آنا ہو گا جو سب کے لیے ایک مشترکہ ریفرنس بن سکتا ہو۔ کسی ایک مخصوص سرکل کے لیے نہیں سب کے لیے مشترکہ حوالہ بن سکتا ہو۔ کجا یہ کہ وہاں آپ باقیوں پر حَکَم ہوں اور علماء تک کو آپ نے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہو! اور پھر کسی ایک آدھ پر نہیں سب پر آپ حَکَم ہو گئے ہوں! امت کے ہر خطہ کی مین سٹریم سے نہ صرف ایک بالکل الگ راستہ پیش کر رہے ہوں بلکہ اس مین اسٹریم ہی کی راہ کو "ارجاء" وغیرہ پر محمول کر رہے ہوں! یہ چیز علاوہ غلط ہونے کے، عملاً بھی بانجھ رہے گی۔

*****

"تکفیر" اور "مذہبِ خوارج" کا حملہ سب سے زیادہ ایک نیک اور دین سے متمسک ماحول پر ہوتا ہے۔ بے دینوں پر کچھ اور قسم کے وائرس آتے ہوں گے، البتہ یہ ایک وائرس خدا نے ایسا رکھا ہے جو اعلیٰ دینی جذبہ رکھنے والے ماحول پر ہی حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ نیکی اور دین سے تمسک ظاہر ہے جہاد سے وابستہ طبقوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر خدا کے لیے پیش کرنا اور سچے دل سے شہادت کا آرزومند ہونا اور عملاً قدم قدم پر اس کا ثبوت دینا کوئی آسان بات نہیں؛ یہ دین سے وابستگی کی ایک اعلیٰ سطح چاہتی ہے۔ عہد صحابہؓ میں بھی جب نیکی کا جذبہ لوگوں میں عروج پر تھا، علم میں کمی آتے ہی پہلا حملہ معاشرے پر اسی چیز کا ہوا تھا اور ایک پورے دور کا ستیاناس کر گیا۔ چنانچہ یہ ایک ایسا وائرس ہے جو دینداری کے حوالہ سے ایک صحتمند ترین جسم پر ہی حملہ آور ہوتا ہے اور کچھ ہی دیر میں اس کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہیں گے، ہماری سب سے اعلیٰ چیز اس کی زد میں آتی ہے۔

اب لے دے کر، ہمارے دور میں، کوئی سو سالہ محنت کے نتیجے میں، اسلام کا احیائی عمل ایک خاص سطح کو پہنچا تھا۔ دینی عمل کے بے شمار دھارے اس کے اندر پڑے تھے کہ اللہ

نے ہمارا عالمی جہاد کھڑا کیا۔ میری اس بات کو کسی غلط معنیٰ پر محمول نہ کیا جائے تو عرض کروں، اسلام کے اِحیائی عمل پر یہ نوبت لانے کے خالق جہادی طبقے ہر گز نہیں ہیں۔ یہ اپنے حصے کے لیے لائقِ ستائش یقیناً ہوں گے، لیکن اسلام کا اِحیائی عمل اپنی اس ''ذروۂ سنام'' پر پہنچنے کے لیے بہت پیچھے سے چلا آرہا تھا۔ اس کے اندر بے شمار تحریکوں کا خون پسینہ پڑا تھا۔ قرآنی حلقات، نشرِ سنت، تبلیغی محنت، دینداری کا عوامی فروغ، مغرب کے ساتھ ہمارے کلامی مباحث کو بامِ عروج پر پہنچانے والے طبقے، ثقافتی اور تہذیبی عمل میں مؤثر کردار ادا کر جانے والے ہمارے دانشور حلقے، مدارس، عوامی وعظ، تقریریں، خطبے، روایتی جلسے، مجلات، جرائد، صحافتی سرگرمیاں، تعلیمی اداروں میں ہمارے دینی عناصر کی جیسی کیسی عشروں پر محیط ایک محنت، حتیٰ کہ سرکاری نصابوں میں جیسا کیسا اسلام کا کچھ حصہ (جو بظاہر کچھ نہ ہونے کے باوجود معاشرے کے ایک طبقے میں لفظ اسلام کو کم از کم زندہ رکھنے میں مؤثر ہوا، اور جس میں نجانے کچھ طبقوں کی کیسی محنت اور قربانی رہی ہے)، حتیٰ کہ گھروں میں اور دوردراز دیہات کے اندر بیٹھی عورتوں کا ایک نہایت سادہ اور دیسی انداز میں قاعدے سپارے اور 'احوال الآخرت' پڑھنا پڑھانا... وغیرہ وغیرہ، ایسی سب سرگرمیاں جن کا بظاہر جہاد سے دور کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے بے شمار ندیاں نالے بڑی بڑی یخ بستہ گھاٹیوں سے قطرہ قطرہ کر کے پگھلتے آئے تھے کہ آخر اس کی وہ طغیانی میسر آئی کہ جب یکلخت افغانستان میں امت کا جہاد پھوٹا تو اس نے ایک بے قابو سیلاب بن کر اس کا ساتھ دیا۔ حق یہ ہے کہ دنیا کے ایک بڑے بلاک 'سوویت یونین' سے نبرد آزما جہادی قیادتوں نے اس کو 'تیار' نہیں کیا تھا، اور نہ اتنی جلدی یہ کوئی 'تیار' کر لینے کی چیز تھی، بلکہ ''تیار'' حالت میں اس کو ''استعمال'' کیا تھا، فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة۔ اسے ''تیار'' کرنے والے شاید بڑی دیر ہوئی اپنی قبروں میں سوئے پڑے ہوں گے (خدا انہیں نور سے بھرے) اور بہت سے اپنے اپنے طریقے سے اب بھی سرگرم ہوں گے، خواہ ''جہاد'' سے براہِ راست ان کا کوئی

بھی تعلق نہ ہو۔ یہ سب کچھ اپنے 'ارجاء' کے ساتھ لائقِ قدر اور لائقِ شکر تھا۔ جہادی طبقوں کو اس کا شکر گزار ہی ہونا تھا کہ یہ وہ بیس base ہے جس نے سپر پاروں کے مقابلے پر ان کو ہر طرف سے کفایت کر ڈالی اور انہوں نے بے فکر ہو کر بڑے سالوں تک اس پر سہارا کیا۔ بے شک اس میں بڑے عیب ہوں، اور عیب بھلا کس میں نہیں ہوں گے، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اِس بیس base کے ایک بڑے حصے کو ہی ''ردِّ ارجاء'' کی دھار پر رکھ لیا جائے اور اس کے ساتھ ہی سیدھی سیدھی ایک جنگ چھیڑ دی جائے! علاوہ غلط ہونے کے، اور علمی بنیادوں پر باطل ہونے کے، جو ہم دیگر مقامات پر بیان کر آئے... یہ اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ یہ سب نوجوان جس پراسیس سے آئے تھے اور بالآخر روس، امریکہ اور بھارت کے خلاف محاذوں پر جا پہنچے تھے، اس پراسیس کے پیداکنندہ کم و بیش وہی طبقے تو تھے جو آج ''ارجاء'' پر باور کر لیے جانے لگے ہیں! یہ تو اپنے وجود کے سوتے ختم کر لینے والی بات تھی؛ اور سامنے بے رحم دشمن! دردمندوں اور سمجھداروں نے کتنا سمجھایا کہ اس جنگ کو ابتداء سے ہی وہ رخ مت دو جسے نہ یہ امت قبول کرنے والی ہے اور نہ اس میں کبھی تمہارا ساتھ دینے والی ہے۔ اور یہ تو وہ کہہ کہہ کر تھک گئے کہ امت کو ساتھ رکھے اور امت کے ساتھ رہے بغیر کوئی جہاد نہیں۔ ایسے جہاد کو (اگرچہ وہ درست راستے پر بھی ہو) مؤخر کر لینا بھلا، جس میں امت آپ کے ساتھ نہیں۔ امت کے چارہ گروں اور امت کے مابین فاصلہ آجانا خود ان کا بھی نقصان اور امت کا بھی؛ خواہ اس کا کوئی سبب ہو: اس بات کو بہت پیچھے سے بھانپ رکھنا اور اسی کے مطابق کوئی پیش رفت کرنا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ توقف کر لینا کسی وقت بہتر ہوتا ہے۔ بلکہ سمجھداروں نے تو یہاں تک سمجھایا تھا کہ یہ رُوٹ آخر امت ہی کے ایک طبقے کے ساتھ جنگ کی طرف جاتا ہے۔ یعنی امت سے آپ صرف کٹ نہیں جائیں گے بلکہ امت ہی کے ایک حصے کے ساتھ برسرِ جنگ ہوں گے اور نتیجتاً تم امت کے کم علموں کو اپنے ہاتھوں اپنے دشمنوں کو دے کر آؤ گے جہاں یہ اُس کی

صف میں ہو کر تم سے نجات پانے کی سوچیں۔ لہٰذا جتنا صبر اُس پہلے پوائنٹ پر کرنا پڑتا وارے کا تھا بہ نسبت اُس صبر کے جو امت کو کھو دینے کے بعد کرنا پڑے۔

غرض سو سال کے احیائی عمل پر جو ایک کلائمکس آیا تھا، اور جس نے اللہ کے فضل سے اتنی جان دکھا دی تھی کہ عالم اسلام پر حملہ آور دو سپر طاقتوں کی راہ میں آگے پیچھے اسلامی مزاحمت کے کامیاب بند کھڑے کر ڈالے اور اللہ کی مدد سے ان دونوں محاذوں پر سرخرو ہو کر دکھایا... امت کے طائفہ منصورہ پر یہ ایک گرمیِ بہار boom تھی اور اس لہلہاتی فصل سے ہمارے بہت سے دیرینہ ارمان پورے ہوتے دکھائی دینے لگے تھے... کہ اس کی بہت سی ڈالیوں پر اُس وائرس کا حملہ ہوا جو ہمیشہ ہماری دینداری کی فصل اجاڑ دیتا ہے۔ عہدِ اول میں بھی اسلام کے شیروں نے جب روم اور فارس کو چاروں شانے چت کر ڈالا تھا، بلکہ اُس وقت تو ہمارا اعلیٰ تعمیراتی عمل بھی بامِ عروج پر جا پہنچا تھا کہ یکلخت اس پر خوارج اور روافض کا حملہ ہوا (اور پھر کچھ دیر بعد معتزلہ کا)، اور اس کے نتیجے میں ہماری بہت سی پیش رفت ضائع چلی گئی۔ بیرونی دشمن تب اس کا کچھ بھی نقصان نہ کر پایا تھا؛ جو نقصان ہوا اندر سے ہوا۔ کسی حد تک اُس سے ملتی جلتی صورتحال آج پیش آئی ہے کہ جب روس اور امریکہ دونوں کو ہم تقریباً پسپا کر چکے تو انہی دو (یا تین) افکار کا حملہ ہماری صفوں پر پھر ہوا اور ہماری بہت سی پیش رفت کو بہا لے گیا۔ ہمارا یہ بحران سراسر داخلی ہے۔ دشمن آج بھی ہمارے مقابلے پر بدترین پوزیشن میں ہے۔ ہم اللہ کے فضل سے آج بھی بہترین پوزیشن میں ہیں۔ سالوں میں یہ تصویر اللہ کی مدد سے بدلی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں ہونے والی کچھ فاش غلطیوں پر بنیاد سے ایک نظر ڈال لینا اور معاملات کی ایک جوہری ترتیبِ نو کر لینا ضروری ہے۔

اب بھی وقت گزر نہیں گیا۔ گو نقصان بہت ہوا ہے۔ سنبھل جائیں تو شاید معاملے کو کسی صحیح رخ پر ڈالا جا سکے۔ لیکن اس کے لیے معاملے کی اصلاح کرنے میں خاصا پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ اونچی مسند پر بیٹھ کر لوگوں کے فیصلے کرنا، اور وہ بھی ان لوگوں کے جو

اپنے اپنے طریقے سے اسلام کی خدمت میں مشغول ہیں... اس طرز عمل کو بنیاد سے ختم کرنا ہو گا۔ ایسے لہجے جو آپ کو امت کے کسی ایک بھی طبقے سے دور کر دیں خواہ اس میں ہزار برائیاں کیوں نہ ہوں، یکسر ترک کرنا ہوں گے۔ ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم اس مبحث کو مزید کھولتے کہ: [ایک باطل بات بولنے کی گنجائش تو خیر کہیں بھی نہیں، مانند امت کے بعض طبقوں کو کافر یا امت کے بعض صالحین کو مرجئہ کہنا اور یوں امت میں پھوٹ ڈالنا اور ایک خانہ جنگی کی راہ ہموار کرنا۔ اس کی گنجائش تو خیر کبھی بھی نہیں ہے۔ تاہم جہاں تک ایک ایسی حق بات کا بھی تعلق ہے جو امت کے بعض طبقوں کو آپ سے ناراض یا آپ سے دُور کر سکتی ہے... ایسی حق بات بولنے کی گنجائش بھی ایک تعلیمی یا اصلاحی طرز کے پروگرام کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔ مانند بعض بدعات یا انحرافات یا فسق و فجور وغیرہ کا ردّ، وغیرہ۔ البتہ وہ طبقہ یا جماعت جسے کسی ہنگامی صورتحال میں امت کو ساتھ لے کر چلنا ہو اور اُس کے امت کو ساتھ نہ چلا پانے کی صورت میں دشمن امت پر حاوی ہو سکتا ہو، ایسی کسی جماعت کے پاس اس بات تک کی گنجائش نہیں کہ وہ کسی بدعت یا انحراف یا فسق و فجور کی خبر لیتے ہوئے امت یا امت کے کسی بڑے طبقے کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھڑوا بیٹھے۔ اور اس کے نتیجے میں دشمن اُس پر بھی دسترس پالے اور امت پر بھی۔ مصالح اور مفاسد کا یہ ایک بہت بڑا باب ہے۔ ہمارے استاد شیخ صلاح الصاوی نے اپنی کتاب "الثوابت والمتغیرات" میں اِسے نہایت خوبصورتی سے بیان کر رکھا ہے۔ اور یہ ایک صالح باب ہے جو دشمن کے مقابلے پر صف آرا جماعتوں کو ایک کمال ڈائنامزم عطا کرتا ہے۔ اِس باب میں؛ امت کے بدعتی ٹولوں تک کو اور فسق و فجور میں پڑے ہوئے لوگوں تک کو نہ صرف ناراض کرنے کی گنجائش نہیں بلکہ ساتھ چلانے کا وجوب ہے۔ اللہ نے چاہا تو ان شاءاللہ کبھی اس مبحث کو تفصیل سے واضح کیا جائے گا]۔

البتہ اصلاحِ احوال کی جو ناگفتہ بہ صورت فی الوقت دکھائی دیتی ہے، بعد اس کے کہ

معاملہ بے حد خراب کر لیا گیا ہے، وہ تشویشناک ہے۔ امت کے دردمندوں کی جانب سے اگر کوئی بڑی اصلاحی پیش رفت سامنے نہیں آتی تو اندیشہ بہرحال ہے کہ اسلامی سیکٹر کی وہ سو سالہ محنت [جس میں مسلم ملکوں کی آزادیاں بھی آتی ہیں خصوصاً برصغیر کے شمال مغرب میں اسلام کے لیے ایک خطہ کا مخصوص کر دیا جانا جو بالعموم "تحریکِ پاکستان" سے موسوم ہے اور جو کہ معاصر تاریخ کا کوئی چھوٹا واقعہ نہیں ہے، اور پھر اس کے بعد ہمارا مشرقی بلاک ایسے دیو کو شکست دے لینا اور کمیونزم اور سرخ سویرے کو اسلام کی قوت کے بل بوتے پر موت کی نیند سلا دینا، یہاں تک کہ ہمارے عالمی جہاد کا توانا ہو جانا اور بجا طور پر امریکہ کو آنکھیں دکھانے لگنا، پھر انٹلکچول سطح پر مغرب میں اسلام کا پیش قدمی کرنے لگنا اور وہ بھی کلاسیکل اسلام کی (نہ کہ معاذاللہ اس اصلاح شدہ اسلام reformed Islam کی جو اس وقت کلاسیکل اسلام کو وہاں کے اسلامک سینٹروں سے بے دخل کر کے تیزی کے ساتھ اس کی جگہ لے رہا ہے)]... اندیشہ بہرحال ہے کہ اسلامی سیکٹر کی یہ سو سالہ محنت ایک بار پھر پیچھے چلی جائے اور تاریخ یہ لکھے کہ اسلام کی پیش قدمی بیسویں صدی کے اختتام پر جب لبِ بام جا پہنچی تھی اور کچھ تھوڑا سا مزید صبر و حوصلہ نجانے مسلمانوں کی کیسی کیسی تعمیرات کا موجب بنتا، اچانک مسلمانوں کے صالح ترین عنصر (امت کے جہادی سیکٹر) پر 'خوارج' کا وائرس حملہ آور ہوا اور پھر یہ فصل اجڑتی چلی گئی اور امت کی پیش قدمی کا معاملہ عشروں کے حساب سے ایک بار پھر پیچھے چلا گیا۔ فلا حول ولا قوة إلا باللہ۔

بلاشبہ کئی ایک مسلم خطوں میں ایسی سمجھدار قیادتیں موجود ہیں کہ اول تو وہاں ان جذباتی اور فکری انحرافات کی کوئی بہت پزیرائی نہیں ہونے دی گئی۔ اور جو ہوئی اس کے اثرات کا بھی سدباب ہوا ہے۔ البتہ ہماری اس گفتگو کا سیاق ہمارا اپنا خطہ ہے۔ یہاں اِس تکفیری ڈسکورس سے آگہی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور اس کا رد کرنے کے لیے اصولِ اہل سنت سے مدد لینے کی بھی کوئی خاطر خواہ کوشش سامنے نہیں آئی۔ ہاں اصولِ اہل سنت

سے مدد لیے بغیر اس کے ردّ کی جو کچھ مخلصانہ کوششیں ہوئیں وہ 'جوابی بیانیہ' کے لیے ایک گونا خلا بھی پیدا کر گئیں۔

*****

اور یہ تو واضح ہے کہ 'جوابی بیانیہ' (غامدی / لبرل) اس ''تکفیری بیانیہ' کے رد کے لیے نہیں آیا بلکہ ''تکفیری بیانیہ' کی پیدا کردہ صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لیے آیا ہے۔ دوسری جانب وہ ''تکفیری بیانیہ' بھی اس 'جوابی بیانیہ' (لبرل / مدخلی / غامدی بیانیہ) کا رد نہیں کرتا بلکہ اس کی پیدا کردہ صورتحال سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ غرض یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک طرح سے گنجائش space اور جواز justification پیدا کر رہے ہیں۔ یہ اُس کے دم سے اپنی پزیرائی کروا رہا ہے اور وہ اِس کے دم سے۔ اور آگے چین ری ایکشن chain re-action کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اس کا حل ایک ہے اور بہت سادہ: یہاں مین اسٹریم (کلاسیکل) دینی طبقوں کا بیانیہ آنا چاہئے جو ''تکفیری بیانیہ' اور 'جوابی بیانیہ' دونوں کو ''دین'' کے موضوع پر بے دخل کر دے؛ اور ان دونوں ہی کے پیدا کردہ خلجان سے قوم کو نکالے۔ (جبکہ فی الوقت تو 'مائک' ہی اِن دو کے پاس ہے)۔

مین اسٹریم دینی طبقوں کا بیانیہ narrative، جس میں ''تکفیری بیانیہ' اور 'لبرل بیانیہ' دونوں سے قوم کو خلاصی دلائی گئی ہو، اور جس کے اندر علمائے سنت کا علم، ان کی دلیل اور ان کی یکجہتی بول رہی ہو، اور جس کی پشت پر کلاسیکل اسلام کی قوت ہو، اور جو یہاں فریقین کے پیدا کردہ ایک ایک اشکال کا جچا تلا جواب دیتا ہو (قائل کرنے کی ضرورت نہیں، جواب ضرور دیتا ہو).. ہم اس کو ''اہل سنت بیانیہ'' بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت دیر پہلے ضروری تھا۔ اس کا سامنے نہ آنا اصل خلا ہے۔ حق یہ ہے کہ مذکورہ دونوں بیانیے اِس ''خلا'' ہی کا نام ہے۔

پس مین اسٹریم علمائے سنت کا بیانیہ وہ واحد چیز ہے جو اِس ڈیڈلاک کو ختم کروا سکتی تھی۔ شاید اب بھی بہت کچھ کر سکے۔ اس کی غیر موجودگی میں البتہ وہ دونوں بیانیے ایک

دوسرے کی پیدا کردہ صورتحال سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ یعنی اسلامی ایجنڈا کا اور سے اور نقصان کرواتے اور صورتحال کو کسی بند تاریک گلی کی طرف دھکیلتے جائیں گے۔

اس ملک میں دین کا مفاد میرے لیے ہر چیز پر مقدم نہ ہوتا تو اس بات پر توجہ دلانے کی کوشش نہ کرتا کہ:

حالیہ منظرنامے میں روز بروز جو ایک گھمبیر اور تشویش ناک صورت پیدا ہو رہی ہے، وہ ہر دو فریق (شدت پسند اور جدت پسند) کو کلاسیکل اسلام والوں پر یہ 'ثابت' کرنے کا موقع دے رہی ہے کہ 'دیکھا ہم نہ کہتے تھے':

۱) ملک میں امن و امان کی جو بدترین صورتحال ہو چکی، یہاں تک کہ اِس 'بہتی گنگا' میں بہت سی عالمی ایجنسیاں آ آ ہاتھ دھونے لگیں (یہ ظاہر کا نقشہ ہے، حقیقت میں وہ کب سے ہیں اور کس سطح تک ہیں، اللہ کے علم میں ہے)۔ اور خدانخواستہ ملک کی سالمیت کے لیے خطرے کھڑے ہو چکے... یہاں جدت پسند اپنی نورتن سفارشات کی لسٹ لے کر اور سے اور وثوق سے بولنے لگے: دیکھا، ہم کب سے کہہ رہے تھے! اب اور کتنی دیر لگاؤ گے ہمارا بیانیہ قبول کرنے میں؟! یعنی بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؛ یہ مریض (کلاسیکل اسلام کو ماننے والے جو محض اپنی خاموشی کے باعث اس صورتحال کی آنچ سہہ رہے ہیں) کب تک اِس حجام کے 'دینِ اکبری' والے نشتر سے بچے گا؛ آخر تو قابو آئے گا!

۲) دینی طبقوں کی اپنی خاموشی اور اپنے معاملات کو ہاتھ میں نہ لینے، اور غیر ذمہ دار عناصر کو دین کی نمائندگی کرنے کے لیے چھوڑ رکھنے کے باعث، دینی طبقے دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ الہدیٰ اور تبلیغی جماعت تک کے لیے مسائل سر اٹھانے لگے۔ بہت سے دینی پروگرام اور ادارے بے وجہ مصائب میں گھِر گئے۔ یہاں تک کہ ایسی جماعتیں جو اس ملک میں اول روز سے نہ صرف پر امن رہی ہیں بلکہ حالیہ

خونریزی و بدامنی سے نوجوانوں کو دُور رکھنے کے معاملہ میں ایک فعال کردار ادا کرتی رہی ہیں، خود یہ جماعتیں لبرلز کے کٹہرے میں کھڑی کرلی جانے لگیں اور وہ اِن کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ 'دھاڑی' ایک تشویش کی علامت بننے لگی۔ اِس بدامنی اور افراتفری کے نتیجے میں محض شک کی بنا پر جیلوں میں بند یا لاپتہ افراد اندازے سے باہر ہیں۔ 'رائٹسٹ ونگ' کا ووٹ لے کر آنے والی حکومت یہاں کے مٹھی بھر لبرلز کے نخرے اٹھانے میں خاصی آگے تک چلی گئی، اور اغلباً اس کو اپنی بقاء کا سوال جاننے لگی... یہاں شدت پسند اپنے اُسی بے رحم غیر ذمہ دار بیانیہ کے ساتھ اور سے اور وثوق سے بولنے لگے: دیکھا اب خود تمہارے ساتھ کیا ہونے لگا، کیا اب بھی کوئی شک ہے کہ ہم نے بالکل ایک صحیح راستہ چنا تھا! کیوں نہ تم نے اُس وقت ہمارا ساتھ دیا! دیکھا یہ اسلام دشمنی! اب کون ان کو بتائے کہ اسلامی سیکٹر دیوار کے ساتھ لگا ہی اس لیے کہ کچھ غیر معمولی extra-ordinary غیر مسبوق unprecedented مواقع دین کے نام پر ایک شدت پسند ڈسکورس نے فریقِ مخالف کو فراہم کر ڈالے؛ جس کو پوری قوم اب بھگت رہی ہے اور ان بھگتنے والوں میں سرفہرست یہاں کے دینی طبقے۔ ورنہ یہ دینی طبقے، یہ مدرسے، یہ 'داڑھیوں والے' یہیں تو تھے، کب ان کے پیچھے دنیا یوں ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی؟ دنیا بڑی دیر سے یہ چاہتی ہو گی، مگر اس کے مواقع اِس آسانی اور اِس بہتات کے ساتھ تمہارے ان افعال کے دم سے ہی تو اس کو میسر آئے۔ اب بھی تم چاہتے ہو کہ جو جو دینی طبقے تمہارے پیدا کیے ہوئے ان حالات کی زد میں آتے چلے جائیں وہ اِس بحران کا دانستہ حصہ بنتے چلے جائیں! یوں معاملہ گھمبیر سے گھمبیر ہوتا چلا جائے۔

اِس بحران کا حل اِس کو ختم کرنا ہے نہ کہ اِس کو توسیع دینا۔ بحران کا تسلسل ختم کرنے

کے لیے مین اسٹریم علمائے سنت کو کوئی initiative لینا ہو گا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں، حضرت تقی عثمانی ایسی قامت کی شخصیات محض غامدی بیانیہ کے چند نکات کا جواب دینے کی بجائے، علمائے سنت کا اپنا کوئی ایک اعلامیہ سامنے لے آئیں (جس کا موضوع فی الحال 'پاکستان میں اسلامائزیشن' نہیں بلکہ "حالیہ صورتحال کا حل" ہو) تو مسئلہ کہیں آسانی سے سدھر سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی اور تنظیم اسلامی وغیرہ اِس معاملہ میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ دینی طبقوں کو بھی ایسے کسی اعلامیہ کے مندرجات کا پابند کرنے کی بھرپور تحریک اٹھائی جائے، ایک ایک مسجد اور ایک ایک دینی سرکل کی سطح پر اس کی پابندی کا عہد لینے کی مہم campaign کی جائے (بعد اس کے کہ کبار علماء میں اس پر ایک اتفاقِ رائے پیدا کر لیا گیا ہو) اور اسی کی بنیاد پر اتھارٹیز کے ساتھ بھی باقاعدہ بات ہو۔ دینی طبقے اِس ملک کے مخلص sincere پیدآور productive, contributive حصے کے طور پر اتھارٹیز کو مثبت ضمانتیں دیں اور دینی وابستگی یا سرگرمی رکھنے والوں کے لیے اتھارٹیز سے مثبت ضمانتیں مانگیں، یوں معاملات کو ایک باقاعدہ ضبط میں لائیں اور ہر دو جانب پائی جانے والی ایک گونہ uncertainty اور unpredictability کا خاتمہ کریں۔ نتیجتاً: اتھارٹیز بھی دینی طبقوں کی بابت ایک واضح سرزمین پر چلیں، اور دینی طبقے بھی اتھارٹیز کے معاملہ میں۔ جس سے؛ مل کر ملک کی حفاظت اور تعمیر کی صورت پیدا ہو۔ یوں تیسرے یا چوتھے یا پانچویں کسی بھی فریق (شدت پسند، لبرل، بیرونی قوتیں وغیرہ سب) کو اس معاملہ میں غیر متعلقہ irrelevant کر دیں۔ آخر کیا مسئلہ ہے دینی طبقے اور اتھارٹیز براہِ راست تعاون سے یہ مسئلہ کیوں حل نہیں کر سکتے؟

ہاں ایسا کوئی بھی initiative لینے والی شخصیات یہاں دندناتی پھرتی بیرونی ایجنسیوں کی ہٹ لسٹ پر آ سکتی ہیں۔ لہٰذا ان کی حفاظت کے پیشگی انتظامات اتھارٹیز کا ذمہ بنے گا۔ اور اصل حفاظت اللہ کی ہے۔ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ

تاریخ کو آگے بڑھانے کے لیے ذہبیؒ اور ابن کثیرؒ کا ڈسکورس

مضامین

مدیر ایقاظ

خدا کے واسطے ان نوجوانوں کو دو چیزیں ضرور پڑھائیں: ایک ان کا عقیدہ اور ایک ان کی تاریخ۔

یہ دو چیزیں ان کو پڑھائی گئی ہوتیں تو آج یہ "اتباعِ قرآن وسنت" کے صحیح مفہوم اور اس کی فقہی وسعتوں سے بھی آشنا ہوتے... اور "اسلامی وحدت" یا "جماعت" کا صحیح معنیٰ بھی ان کو معلوم ہوتا۔

ان دو اسباق کے بغیر "اتباعِ حق" کے خوبصورت دروس بھی ان کے حق میں گمراہ کن؛ اس عنوان کے تحت یہ بہت سے وابستگانِ صحابہ کو ہی حق سے خارج سمجھنے چل دیتے ہیں۔

ان دو اسباق کے بغیر "وحدتِ امت" کے خوبصورت درس بھی ان کے حق میں گمراہ کن؛ اس عنوان کے تحت یہ ایسے ایسے زہریلے عناصر کو اِس کمپوزیشن کا حصہ بنانے پر مصر ہوتے ہیں جن کا عقیدہ اور جن کی تاریخ ہر دو امت کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے سے عبارت رہی ہے۔ تب آپ کے "اتحاد اتحاد" کے یہ درس 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کا مصداق ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے... ہمارا برصغیر کا تحریکی فکر خاصی حد تک ان دو اسباق (عقیدہ اور تاریخ) کے بغیر پروان چڑھا ہے۔ اس وجہ سے اچھے اچھے فضلاء اور نہایت صاف ستھرے ذہن کے مالک اصحاب بھی اسلامی اٹھان اور موجودہ بحرانات کے حوالے سے ایک قابل ترس naive ڈسکورس پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابن کثیر اور ذہبی کا ڈسکورس ان

حضرات کو ’فرقہ واریت‘ لگے گا !!! آج وحدتِ امت کے جس کمپوزیشن میں روافض سے ڈنگ کھانے کا پورا انتظام نہیں اُس سے اِن حضرات کو ’فرقہ واریت‘ کی بو آئے گی! اور جہاں یہ ڈنگ کھانے کا پورا پورا بندوبست ہو اُسے یہ امت کی ’یکجہتی‘ باور کریں گے جو آج تک امت کے لیے کوئی برگ وبار نہ لا سکی۔

واقعی اس وقت فیشن یہی ہے کہ ’’اصلاحِ امت‘‘ اور ’’اقامتِ دین‘‘ اور ’’اسلامی نشأۃِ ثانیہ‘‘ کے حوالے سے کچھ ایسی پھلجڑیاں چھوڑی جائیں جو ’سب کو ساتھ لے کر چلنے‘ ایسے کسی وہمی عمل میں عشروں (یا بعید نہیں صدیوں) تک ہمیں 8 کے ہندسے کے اندر گھماتی رہیں! اور وہ کمپوزیشن جو واقعتاً اللہ کے فضل سے کہیں پہنچ کر دکھا سکتی ہے، اور جس نے زنکیوں اور ایوبیوں کے زیر قیادت (فاطمی روافض کا پتّہ مصر سے ہمیشہ کے لیے صاف کر دینے کے بعد) آپ کو بیت المقدس فتح کر کے دیا تھا، امت کو ایک از سر نو زندگی دے ڈالی تھی، اور صلیبی یورپ سے اٹھنے والی (پاپولیشن ایکسپلوژن اور صلیبی اِحیاء کی اٹھائی ہوئی آندھیوں) کے آگے بڑی دیر تک شام تا افریقہ بند باندھے رکھا... وہ کمپوزیشن جس نے سلاجقہ کی سرکردگی میں آل بویہ کے دورِ سیاہ کو قصہ ٔپارینہ بنایا، روم کو از سر نو لرزایا، اسلامی تہذیب اور تقریباً مر چکے علوم وفنون کو ایک نئی زندگی دی اور عالم اسلام کو از سر نو ایک استحکام بخشا... جس نے غزنویوں، غوریوں اور مابعد وسط ایشیائی قافلوں کی صورت میں ہند کے بت خانے الٹے اور ہمالیہ کے اِس (برعظیم) کو ہمیشہ کے لیے اذانوں کے دیس میں بدل کر رکھ دیا... وہ تاریخی کمپوزیشن جس نے عثمانیوں کی صورت میں تاریخ انسانی کی سب سے بڑی اور سب سے طویل ایمپائر اسلام کے قدموں میں لا کر رکھ دی اور جو مشرقی یورپ کو اسلام کے زیر نگیں لے کر آئی... اور تو اور دورِ حاضر میں جس نے سوویت یونین ایسی سپر پاور کے گھٹنے لگوائے اور جو امریکی سپر پاور کو گھٹنے ٹکوانے کی جانب اللہ کے فضل سے کامیابی کے ساتھ گامزن ہے، اور جو خطہ ٔشام میں اپنے اُسی ترکی و عربی عنصر کو مجتمع کر کے

آج امت کے کچھ تاریخی دشمنوں کے ساتھ برسرپیکار ہے اور اللہ کے فضل سے کچھ ایسا برا نہیں جا رہا ... یہ ابن کثیر، ذہبی کا نشان زد کمپوزیشن اور طائفہ منصورہ جو تمام عرصۂ تاریخ امت کو داخلی طور پر ڈنگ مارنے والے طبقوں کے سینے پر بھی بیک وقت مونگ دلتا رہا؛ اور جو کہ اس کی بیرونی کامیابیوں کا ایک بڑا راز تھا... ''البدایۃ والنھایہ'' اور ''تاریخ الإسلام'' سے پھوٹ پھوٹ کر آنے والے اِس کمپوزیشن کا احیاء آج 'فرقہ واریت' کے کھاتے میں ڈالا جائے گا، سبحان اللہ العظیم!

خدا کے واسطے اپنی اِس بے سمت فیشنی 'اتحاد اتحاد اتحاد' کی گردان کی بجائے، جو امت کو ہزاروں ڈنگ پڑوانے کی ایک فکری بنیاد فراہم کرواتی ہے... اور اپنی اس وہمی دنیا میں رہنے کی بجائے جو نہ اپنے عقیدے سے واقف نہ اپنی تاریخ سے، نہ اپنے دوست سے اور نہ اپنے دشمن سے... آپ ان نوجوانوں کو مدرسۂ ابن تیمیہ و ابن کثیر و ذہبی و شاہ ولی اللہ سے ایک اصولی و تاریخی راستہ کشید کرنے دیجئے' خواہ کچھ دیر کے لیے یہ آپ کو 'فرقہ وارانہ' لگے۔

ان نوجوانوں سے بھی میری درخواست ہے کہ متأخرہ ادوار کے کچھ سطحی اور فیشنی نعروں سے ہرگز مرعوب نہ ہوں، خواہ فی الوقت آپ ان کو کتنا ہی مقبول کیوں نہ دیکھیں اور ان کے مقابلے پر اپنے اُس تاریخی ڈسکورس کو کتنا ہی اجنبی کیوں نہ پائیں۔ ایسی کسی ادیبانہ یا دانشورانہ لومۃ لائم سے ہرگز نہ ڈریں۔ سر اٹھا کر چلیں۔ ''فرقۂ ناجیہ'' اور ''طائفہ منصورہ'' اللہ کے فضل سے صرف عقیدہ کی کتابوں میں ہی نہیں ملتا۔ یہ بیک وقت تاریخ کی لوح پر بھی آپ کو اپنی پوری قوت اور فاعلیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ پس یہ وہ طائفۂ حق ہے جو کتبِ عقیدہ اور کارزارِ تاریخ میں بیک وقت سرخرو ہے۔ (حَتَّى يُقَاتِلَ آخِرُهُمُ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ ''یہاں تک کہ ان کا آخری حصہ مسیح دجال سے قتال کرے گا)۔

یہ اس امت پر خدا کا خاص انعام ہے۔ شیخ سفر الحوالی کہتے ہیں: ہم وہ جماعت ہیں جن

کے حق میں شرائعِ آسمانی اور وقائعِ تاریخ اللہ کے فضل سے بیک وقت بولتے ہیں۔

ایک نومولود، بے سمت مگر مقبول ہو چکی 'دانش' کو ناں کر کے خطۂ ہند کے مسلمان کو اس کے تاریخی روٹ پر ڈالنا.. اور **البداية والنهاية** کے ڈسکورس کو بحال کروانا... آج ایک علمی جہاد چاہتا ہے اور بے لحاظ ہو جانے کی حد تک ایک شجاعت۔ ان شاء اللہ تھوڑی محنت سے یہاں کے تحریکی عمل کو کچھ ٹھوس معتدل لہجے دیے جا سکتے ہیں۔

وباللہ التوفیق

"کلاسیکل" ڈسکورس کا 'انقلابی' ڈسکورس سے فرق

مضامین

حامد کمال الدین

سماج، سیاست، جہاد، امر بالمعروف و نھی عن المنکر، اصلاح اور احیائے دین وغیرہ ایسے معاملات اور مسائل کو دیکھنے کے لیے یہاں دو اپروچ پائے جاتے ہیں؛ اور دونوں اپنی نہاد میں بے حد مختلف:

ایک: کلاسیکل[1]۔

دوسرا: انقلابی۔

بے شک ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس کے ہاں یہ دونوں اپروچ خلط ملتے ہیں۔ پھر اِس 'خلط' کا نسبت تناسب مختلف حلقوں میں مختلف ملے گا۔[2] (یعنی کسی کے ہاں انقلابی منہج

---

1 "کلاسیکل" کے لیے عرب کے بعض علمی حلقوں میں ایک خاصا جچا تلا لفظ "سَلَفی" مستعمل ہے۔یعنی وہ ایک منہج جو امت کے دورِ اول سے ماخوذ چلا آتا ہے۔ عین اس معنیٰ میں ہم بھی ضرور یہ لفظ استعمال کرتے اگر ہمارے برصغیر میں یہ بدقسمتی سے "ردِّ حنفیت" کے لیے مخصوص نہ ہوتا۔ حالانکہ سوچا جائے تو "حَنَفی" دراصل "سَلَفی" مذاہب میں سے ہی ایک مذہب ہے (اہل کوفہ کے تابعین و تبع تابعین سے چلا آتا ایک مذہب)۔ لہٰذا ایک الجھن سے دور رہنے کے لیے ہم "کلاسیکل" کے لفظ پر ہی اکتفاء کریں گے۔ ورنہ وہ دوسرا لفظ کہیں مناسب تر تھا۔

2 اس لحاظ سے، ان دو اپروچوں کو تو ہم "دو الگ الگ اپروچ" ہی کہیں گے۔ البتہ جہاں تک کسی ایک شخصیت یا جماعت کا تعلق ہے تو اس میں یہ دونوں اپروچ مختلف نسبت تناسب سے خلط بھی ملیں گے، الا ماشاء اللہ۔ خاص طور پر "انقلابی" سائڈ پر یہ کہنا مشکل ہو گا کہ یہاں کلاسیکل

نمایاں تر تو کسی کے ہاں کلاسیکل منہج غالب تر) تاہم ”اجتماعی فرائض“ کو سمجھنے کے حوالے سے، ہیں یہ دو الگ الگ دھارے۔ اگر آپ مجھ سے کہیں، میں ان دونوں کے مابین ایک موٹی لکیر کھینچ کر واضح کروں کہ اصل فرق ہے کیا... تو یہاں میں اس کی علمی بنیادوں اور دلیلوں میں جائے بغیر چند عملی کسوٹیاں touchstones آپ کے گوش گزار کر سکتا ہوں:

1. انقلابی منہج میں ایک قیادت، اور اس کے پیچھے کھڑا ایک گروہ، باقاعدہ اقتدار کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے لیے ایک کیمپین campaign کرتا ہے۔ (اقتدار کا یہ مطالبہ بے شک وہ اپنی ذات کے لیے نہیں کرتا بلکہ دین کے نفاذ کی خاطر ہی کرتا ہے، البتہ ہوتا وہ ایک اقتدار کا مطالبہ ہے)۔ جس کا سادہ مطلب، کسی لگی لپٹی کے بغیر، یہ ہوتا ہے کہ اِس کشمکش کے نتیجے میں بر سر اقتدار طبقوں کو اس کرسی سے بے دخل ہونا ہے اور اقتدار کے کچھ نئے دعویداروں کو اس پر متمکن ہونا ہے؛ جس کے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ انجامِ کار: دونوں فریقوں کی ایک بڑی سرگرمی ایک دوسرے کے مقابلے پر ’اقتدار نہ چھوڑنے‘ اور ’اقتدار چھڑوا کر رہنے‘ کے گرد گھومتی ہے اور یہی: فریقین کے مابین ایک بڑا (یا شاید مرکزی) باعثِ نزاع۔ جبکہ کلاسیکل منہج میں اقتدار کے مطالبے کے ساتھ میدان میں اتری ہوئی کوئی قیادت یا جماعت سرے سے نہیں ہوتی۔[3] ۔[4] ”سٹیٹس کو“ پر کڑی سے کڑی تنقید کلاسیکل منہج میں بھی ہو سکتی ہے اگر

اپروچ سو فیصد مفقود ہے۔ عموماً یہی کہا جاسکے گا کہ ایک شخص یا جماعت کے ہاں ”انقلابی“ اپروچ ”کلاسیکل“ اپروچ پر غالب ہے۔ ظاہر ہے، کسی کے ہاں زیادہ غالب ہو گی تو کسی کے ہاں کم۔

3 ہاں معاملہ اس سے الٹ ضرور ہوتا ہے۔ یعنی بر سر اقتدار طبقے ان مصلحین کا کیس case کمزور کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ان کی یہ بھاگ دوڑ اصل میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہے۔ جبکہ وہ مصلحین اسے بر سر اقتدار طبقوں کی جانب سے لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانے کی

معاملہ اس کا متقاضی ہو (حدیث کے الفاظ میں: **أفضل الجهاد كلمةُ حقٍ عند سلطانٍ جائر**) تاہم اقتدار کی منتقلی کا کوئی مطالبہ اِس منہج کا بنیادی حصہ نہیں۔ اس معاملے کو کلاسیکل منہج بالکل ایک اور طریقے سے لیتا ہے۔

2. انقلابی منہج کا ایک بہت بڑا اور مرکزی موضوع 'نظام' ہوتا ہے۔ نظام نہیں بدلا تو گویا کچھ نہیں بدلا! کوئی بھی بڑی سے بڑی پیش رفت تقریباً بے معنیٰ ہے جب تک سیاست کا

ایک کوشش پر محمول کرواتے ہیں۔ اور کسی وقت ان کے اس الزام کو ایک خندۂ استہزاء کے ساتھ لیتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہے کہ ایک فکری یا سماجی نزاع میں، جو کہ مصلحین کی قوت strength کا اصل میدان ہوتا ہی ہے، "اقتدار کے طلبگار" کے طور پر سامنے نہ آنا ان کی اپنی قوت strength کا ہی ایک اور بڑا راز ہوتا ہے۔ جبکہ اقتدار کے مطالبہ کے ساتھ میدان میں آنا ان کے کیس کو کمزور کر دینے والا ایک پوائنٹ؛ تبھی مستکبرین لوگوں کی توجہ بار بار 'اس' طرف دلاتے ہیں؛ بصورتِ دیگر مستکبرین اس پوائنٹ کو اپنے حق میں نہ لاتے۔ فتدبّر

4 یہ سمجھنا غلط ہے کہ "اقتدار" کے مطالبے کے ساتھ میدان میں اترنے کا تعلق اِس مسئلہ سے ہے کہ آیا مقابلے پر کفر ہے یا محض فسق و فجور۔ جہاں تک انقلابی جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ لازماً "اقتدار کی منتقلی" کا ایجنڈا لے کر میدان میں اترتی ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ نظامِ رائج کو کفر سمجھتی ہیں یا فسق۔ اور جہاں تک کلاسیکل ذہن کا تعلق ہے تو وہ کسی بھی قسم کی صورتحال situation میں "اقتدار" کے دعویدار کے طور پر سامنے آنے کا منہج نہیں رکھتا چاہے سامنے کفر ہو یا فسق۔ حتیٰ کہ اِس (کلاسیکل) ڈسکورس میں صحابہؓ کو بھی ایک ایسی جماعت کے طور پر نہیں دیکھا جاتا جو مکہ کے مقتدر طبقوں سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ "اقتدار" اس کے سپرد کیا جائے، باوجود اس کے کہ صحابہؓ کے مقابلے پر کفر ہی تھا۔ یہ (کلاسیکل) ڈسکورس دراصل معاملے کو "مطالبۂ اقتدار" کی نظر سے دیکھتا ہی نہیں ہے اور اِس کی سعی کی جہتیں اور اپنے کیس case کے حق میں قوت strength پانے کے اعتبارات بالکل اور ہیں۔

معاملہ ہاتھ میں نہیں لیا جاتا اور 'سٹیئرنگ' قابو نہیں آ جاتا۔ جبکہ کلاسیکل منہج کے مرکزی موضوعات ''عقیدہ''، ''ملتوں کا اختلاف'' اور ''استطاعت'' کے محور سے جڑی ہوئی ''اقامتِ شریعت کروانا'' ہوتی ہے۔ ''امت'' کی تعلیم یا توسیع یا بہبود یا دفاع یا فتوحات کسی وقت 'سیاسی معاملات' سے بڑھ کر ایک ترجیح ہوتی ہے۔

3. کلاسیکل ڈسکورس میں أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ کا جلی تر مطلب: دین کو مستقیم رکھنا، دین کو اس کی صحیح کھری ٹھیٹ بنیادوں پر قائم رکھنا اور اس میں کوئی فرق اور تفرقہ نہ آنے دینا ہے۔ جبکہ ''دین'' بھی اصل میں توحید اور رسالت کے معنیٰ میں ہے۔ جس کے اندر عین اُسی آسمانی حقیقت پر رہنا جو ''عبادت'' کے باب میں بذریعہ ''رسالت'' دیا گیا۔ یہ امتوں اور ملتوں کے حق میں دراصل ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ کیونکہ نئے نئے فرقے آ کر اُس آسمانی حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور تھوڑے عرصے میں عقیدہ اور شریعت کے معاملہ میں امت کی پٹڑی سرک کر کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ صحیح آسمانی دین اس قدر متنازعہ، نادستیاب اور تحریف زدہ ہو جاتا ہے کہ (پچھلے ادوار میں) کچھ ہی دیر بعد ایک نئی رسالت کی ضرورت آ پڑتی رہی ہے۔ اس لحاظ سے ''اقامتِ دین'' کا قوی تر حوالہ: دین کو اُس کی حقیقت پر رکھنا اور اس میں سرِ مو فرق نہ آنے دینا ہے۔ جس میں دین سے **تحریف الغالين**[5] اور **انتحال المبطلين** اور **تأويل الجاهلين** کو دفع کرنا

---

5 **تحريف الغالين** یعنی غالی طبقوں کا دین میں تحریف کرنے لگنا (لفظی یا معنوی)
انتحال المبطلين یعنی باطل پرستوں کی بناوٹ۔ (خانہ سازیاں، فکری وارداتیں)
تأويل الجاهلين یعنی جاہلوں کا دین کو نرالے معانی پہنانا۔
یہ تینوں کلمات حدیث میں آئے ہیں:

وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

آتا ہے۔ دین کو زمانے کی دھول اور ناپاکیوں سے صاف کرنا۔ روز اِس کے صحن میں جھاڑو دینا۔ غرض دین کو عین اُسی حقیقت پر رکھنا جس پر زمین میں ملتِ آسمانی ایک بار کھڑی کروائی گئی تھی اور جس ڈھب پر انسانوں کو خدا کے آگے جھکایا گیا تھا: [6]

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ۖ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ. وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا

عَلَيْهِ وَسلم: «يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ» . رَوَاهُ الْبَيْهَقِيّ ، وصححه الألباني في تخريجه على مشكاة المصابيح كتاب العلم ، الفصل الأول ، رقم الحديث 248)

روایت ابراہیم بن عبد الرحمن عذری سے، کہا: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

اِس علم کے حامل ہوتے رہیں گے ہر نئی نسل میں سے اُس کے معتبر ترین لوگ: کہ جو اس (علمِ دین) سے دفع کریں گے:

- **غلو پسندوں کی تحریف کو،**
- **باطل پرستوں کی گھڑت کو، اور**
- **جاہلوں کے (اسے) نرالے معانی پہنانے کو۔**

[6] یہ وجہ ہے کہ "اقامتِ دین" سے متصل قرآنی مقامات "اختلاف" اور "تفرقہ" کا مضمون لے کر آتے ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ خود "اختلاف" اور "تفرقہ" ایسی اصطلاحات ائمۂ سنت کے کلاسیکل ڈسکورس میں ایک اور معنیٰ رکھتی ہیں جو سب سے بڑھ کر دینِ حق سے انحراف اور اس میں اختلاف کرنے پر لاگو ہوتا ہے۔ اس کے ازالہ میں خودبخود باطل فرقوں کا ایک قوی ابطال آتا ہے۔ جبکہ انقلابی منہج میں "اختلاف" اور "تفرقہ" کسی حد تک آج کے میڈیائی مفہومات کے قریب ہے، یعنی رہو اپنے اپنے انحراف پر بس ایک دوسرے کو چھیڑو مت؛ 'عقیدے' میں کیا جھگڑا! جھگڑا ہو تو 'سیاست' میں اور 'کرپشن' وغیرہ ایسے مسئلوں پر! عقیدہ تو لوگوں کا ایک 'ذاتی' معاملہ ہے!

مِن بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ ٱلۡعِلۡمُ بَغۡيَۢا بَيۡنَهُمۡ.[7] پس

- بیرون میں باطل ادیان اور اندرون میں گمراہ فرقوں کے ساتھ نظریاتی محاذ پر ایک دُوبدُو جنگ

- اور دینِ حق کا زیادہ سے زیادہ احقاق کرنا، نفوس پر اس کی دھاک بٹھانا اور معاشرے کو اس پر زیادہ سے زیادہ پختہ اور یکسو کرانا اور اس سے ہرگز نہ ہٹنے دینا

اِسی مطلب کے تحت آئے گا۔ یہاں؛ مشرکین و اہل کتاب سے اپنے ملّی فرق کو نمایاں اور غالب کرکے رکھنا دین کی اقامت واِظہار میں آتا ہے۔ جہاں سے شرک کو مٹانا، الحاد کی سرکوبی، بُتوں کے ساتھ دشمنی، کفر کو زک پہنچانا، بے دینی کو شنیع بنا کر رکھنا، اسلام کے واحد حق ہونے کی ہیبت نفوس میں قائم کروانا اور اس کے ماسوا کو اذہان میں متروک، معیوب، مردود اور اچھوت بنا کر رکھنا، غیرِ اسلام کو ناآئین outlaw کرکے رکھنا یہ سب "دین کو قائم رکھنے" میں آئے گا۔ 'حکومت' وغیرہ پر اثرانداز ہونا اس کے یہاں اگر "اِقامتِ دین" میں آئے گا تو اِس اصل مطلب کی ذیل ہی میں لاکر، اور بشرطِ دستیابی ایک ذریعہ جانتے ہوئے؛ جبکہ اصل زور "اقامتِ دین" کے باب میں پھر بھی وہیں پر رہے گا۔ یہ ہے کلاسیکل ڈسکورس، جو کتبِ عقیدہ[8] سے پھوٹ پھوٹ کر آتا ہے۔ ادھر انقلابی ڈسکورس میں: أَنۡ أَقِيمُوا

---

[7] (الشوریٰ:13، 14) "راہ ڈال دی تم کو دین میں، وہی جو کہہ دیا تھا نوح کو، اور حکم (وحی) بھیجا (ہے اے محمدؐ) ہم نے تیری طرف، اور وہ جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو، اور موسیٰ کو، عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔ بھاری پڑتا ہے شریک والوں کو، جس طرف تو بلاتا ہے ان کو۔ اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہے۔ اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع لائے۔ اور پھوٹ جو ڈالی (فرقوں میں بٹے)، سو سمجھ آچکے، پیچھے آپس کی ضد سے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

[8] اسلامی کتبِ مصادر source books میں پورا ایک شیلف پایا جاتا ہے، جس میں اسلام کے

الدِّینَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِیهِ کا مرکزی ترین حوالہ ایک عدد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ دین کو قَیِّم (ٹھیٹ، ٹکسالی) رکھنے (شرک و بے دینی کا ابطال اور بدعات و نافرمانی کی گوشمالی وغیرہ) ایسے مفہومات ان حضرات کے ہاں اگر ''اِقامتِ دین'' میں آئیں گے تو ایک ذیلی اور ثانوی حیثیت میں ہی۔ [مثال کے طور پر: جہمیہ یا باطنیہ ورافضہ ایسی گھٹاٹوپ ضلالتوں کے ردّ کو اِس طبقے کے سامنے اگر آپ ''اقامتِ دین'' میں شمار کریں تو یہ اس پر متعجب ہوگا۔ اس لیے کہ 'حکومتِ الٰہیہ' کے قیام سے بھلا

سٹینڈرڈ عقیدہ کا بیان ملتا ہے۔ اس پورے شیلف کی تالیف زیادہ تر ''كتاب السنة'' کے زیر عنوان ہوئی ہے (کتبِ حدیث اور چیز ہے، یہ کتاب السنۃ ایک اور چیز ہے)۔ شیخ عثمان جمعہ الضمیریہ اپنی کتاب مدخل لدراسة العقيدة الاسلامية میں ''كتاب السنة'' کے عنوان سے متقدمین کی 19 کتابوں کی فہرست دیتے ہیں:

(1). "السنة" لابن أبي شيبة المتوفى 235ھ.(2). "السنة" لأحمد بن حنبل المتوفى 241 ھ. (3). "السنة" للأثرم المتوفى 273ھ. (4). "السنة" لأبي علي المتوفى 273ھ. (5). "السنة" لأبي داود السجستاني المتوفى 275ھ. (6). "السنة" لابن أبي عاصم المتوفى 287ھ. (7). "السنة" لعبد الله بن الإمام أحمد المتوفى 290ھ. (8). "السنة" لأبي بكر المروزي المتوفى 292ھ. (9). "السنة" لأبي بكر الخَلّال المتوفى 311ھ. (10). "السنة والجماعة" للطحاوي المتوفى 321ھ. (11). "السنة" للعسال الأصفهاني المتوفى 349ھ. (12). "السنة" لأبي القاسم الطبراني المتوفى 360ھ. (13). "السنة" لأبي الشيخ الأصبهاني المتوفى 369ھ. (14). "السنة" لأبي جعفر البغدادي المعروف بابن شاهين المتوفى 385ھ. (15). "السنة" لمحمد بن نصر المروزي المتوفى 394ھ. (16). "السنة" لابن مندة الأصبهاني المتوفى 395ھ. (17) "السنن" أو "شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة" للالكائي المتوفى 418ھ. (18). "السنة" لأبي ذر الهروي المتوفى 434ھ. (19). "الرسالة في السنة" لأبي عثمان الصابوني المتوفى 449ھ۔

''کتاب السنۃ'' کے علاوہ بھی کچھ عنوانات کے تحت اِس شیلف میں کتبِ مصادر ہیں۔ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی الإبانة عن أصول الديانة بھی اسی میں آتی ہے۔ ''دین'' کی حقیقت پر قائم رہنے، اور انحرافات (فرقوں) کو پاس نہ پھٹکنے دینے ایسے معانی سب سے زیادہ ان کتب میں بیان ہوتے ہیں۔

اِس مسئلہ کو کیا تعلق! (بلکہ بدعتی ٹولوں کا رد کرنا تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں الٹا ایک رکاوٹ اور 'تفرقہ' باور ہو گا!) یہاں ایک محدِّث امت کے روزمرہ و محاورہ سے زنادقہ کی ڈالی ہوئی موضوعات کو نکال باہر کرنے کی اَن تھک سعی کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا دین اُجلا اور نکھرا ہو جاتا ہے۔ باطل کے اندھیرے قلوب سے چھٹتے اور حق کا نور یہاں چھا جاتا ہے... اور آپ اُس محدث کی اِس سعیِ مشکور کو دین کی اقامت میں گنتے ہیں تو یہ طبقہ اس پر حیرت زدہ ہو گا۔ امت کا کوئی طبقہ قادیانیت یا سیکولرزم کے بخیے ادھیڑتا ہے اور مسلم اذہان کو لبرلزم کے اثرات سے پاک کر کے خالص دین پر یکسو کرواتا ہے تو اسے بھی شاید یہ ''اقامتِ دین'' شمار کرنے پر آمادہ نہ ہو، سوائے اس باب سے کہ اس کا یہ فعل 'اسلامی حکومت' قائم کرنے میں ممدّ ہو سکتا ہے یا اسلامی حکومت کے راستے کی کچھ رکاوٹیں دور کرنے میں موثر ہو سکتا ہے؛ نہ کہ فی نفسہٖ اس عمل کو اقامتِ دین گنے گا۔ وغیرہ]۔

4. انقلابی ڈسکورس میں 'مراحل' کا ایک فلسفہ بھی کسی نہ کسی طور شامل ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کسی کے ہاں کتنے 'مرحلے' ہوں اور کسی کے ہاں کتنے۔ اور اِس تقسیم کے بموجب؛ کوئی خود کو کسی مرحلے میں جانتا ہو گا اور کوئی کسی مرحلے میں۔ 'مکی مرحلہ' اور 'مدنی مرحلہ' تو بالعموم ہوتا ہی ہے۔ یہاں؛ دین کے بہت سے اعمال 'ابھی' انجام دیے جانے پر باقاعدہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس چیز کا تو 'مرحلہ' آیا ہی نہیں، ابھی یہ کام دین میں کیونکر جائز ہو گا! دوسری جانب، کلاسیکل ڈسکورس 'مراحل' ایسے فلسفے کو ہکا بکا ہو کر سنتا ہے۔ نبی ﷺ پر دین پورا اتر آنے کے بعد اب قیامت تک پورے کا پورا واجب العمل ہے۔ اس میں کوئی تقدیم اور تاخیر دین کا مسئلہ نہیں۔ 'مرحلہ' ایسی کسی دلیل سے دین کی کسی ایک بھی بات پر عمل موقوف نہ ہو گا۔ ہاں دین پر عمل کسی چیز سے مشروط ہے تو وہ ہے آپ کا ایک بات کی قدرت و استطاعت

رکھنا؛ خواہ بطورِ فرد اور خواہ بطورِ جماعت۔ یہ ''قدرت و عدم قدرت'' البتہ ایک صالح اعتبار ہے اور نصوصِ شریعت میں جابجا بیان ہوا ہے۔

5. انقلابی ڈسکورس میں ''عبادات'' کو حکومتِ الٰہیہ کے لیے درکار افراد کے اندر مطلوبہ 'مواصفات' یا 'تقاضوں' کے طور پر دیکھنے تک کی نوبت آتی ہے۔[9] جبکہ کلاسیکل ڈسکورس ''عبادات'' اور ''پابندیِ حلال و حرام'' کو آپ اپنی ذات میں مقصود جانتا ہے۔ خدا کو سجدہ کرنا، خدا کی تسبیح اور پاکی بیان کرنا اور اُس کی عبادت کے جملہ افعال بجا لانا آپ اپنی ذات میں مطلوب ہے اور بجائے خود تخلیقِ جن و اِنس کی غایت۔ یہاں سے؛ شرک اور توحید کے پیراڈائم میں بھی فریقین کے ہاں ایک واضح فرق آجاتا ہے۔ اور وہ جابجا نظر آتا ہے۔ غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا خالق کی صفات میں تشبیہ یا تعطیل لانا آپ اپنی ذات میں فساد، اشتعال انگیز اور دین کو مسمار کر دینے والا ایک فعل ہو گا اور اس کا اِبطال بجائے خود ''دین کو قائم رکھنا''۔ (کلاسیکل ڈسکورس)۔ جبکہ انقلابی ڈسکورس میں یہ نرا 'علم الکلام' کا مسئلہ! 'نظامِ حکومت' سے جب اس کا کوئی خاص تعلق نہیں تو اس (مسئلہ 'صفاتِ خداوندی) کو مسلم ذہن کی تشکیل کے کسی مرکزی ترین مضمون کے طور پر لانا بے جا ہو گا۔ یا شاید ناروا! 'خدا کا بیٹا' ایسا لفظ سن کر آدمی کو ایک جھرجھری آئے اور وہ بے ساختہ اُس ذہنی کیفیت سے گزرے جو 'مکی مرحلے' کی ایک سورت میں باقاعدہ نفوس کے اندر اتاری جاتی[10] ہے: تَكَادُ

---

9 اور بعض کے ہاں 'مواصفات' اور 'تقاضوں' کے طور پر بھی نہیں! ''حزب التحریر'' کی مثال ذرا ایک اور پہلو سے آگے چل کر آرہی ہے۔

10 اس سلسلہ میں نمایاں ترین انتہاء extreme ہمارے اِس ماحول کے اندر پائی جانے والی تعبیراتِ دین میں ''حزب التحریر'' کا ڈسکورس ہے۔ مکی قرآن میں بتوں کی پوجا، دیویوں کی

السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (٩٠) أَن دَعَوْا
لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا (٩١) وَمَا يَنبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَن يَتَّخِذَ وَلَدًا (٩٢ مريم)[11] پروردگارِ
عالم کی بابت ایسی شرکیہ بات منہ سے نکالنے والے کو آدمی 'حکمران کے ظلم' سے
بھی سنگین تر دیکھے اور ایسی بات کو جہان سے مٹانے کے لیے 'حکمران کے خلاف
سرگرم ہونے' سے بھی بڑھ کر بے چین ہو جائے... خدا کے وصف پر باطل اقوال کی
غلاظتیں پڑتی دیکھے تو آدمی کے بحر کی موجوں میں ایک غیر معمولی ہیجان اور اضطراب
آئے اور وہ خدا کے وصف کو اس سے دھونے اور اُجلا کرنے کے لیے ماہیِ بے آب ہو
("تسبیح" کا ایک باقاعدہ معنیٰ)... ایسی طبیعتیں اور مزاج آپ کے اندر کلاسیکل منہج

رضاجوئی، نجوم اور ارواح کے آگے اظہارِ ذلت وغیرہ ایسے شرکیہ اعمال کی جو پورے ایک تسلسل کے ساتھ مذمت اور ابطال ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کا خود اس 'مکی مرحلہ' میں ہی ان شرکیہ افعال کی ایک مسلسل نفی کرنے کو خدا کی تعظیم کا باقاعدہ عنوان بنانا... اِس سارے عمل کو ہمارے یہ بھائی اس مہارت کے ساتھ گول کرتے اور 'طلبِ اقتدار' کا عنوان بناتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ وہ سارا شرک جو تنزیلِ آسمانی اور سیرتِ نبوی کے مکی بیان میں لوٹ لوٹ کر ذکر ہوتا ہے، اس کی بابت ان بھائیوں کے یہاں کچھ ایسی سوچ دیکھنے میں آتی ہے کہ: ایسی باتوں کے ابطال پر وقت لگانے اور نفوس میں اس کو گہرا اتارنے کی محنت نری غیر ضروری ہے؛ ان تمام شرکیات کو ختم کرنا تو 'خلافت' لے آنے کے بعد محض ایک آرڈیننس کی مار ہے! لہٰذا ستّر (70) اَسی (80) سال تک یا پھر اس سے بھی زیادہ (غیر معینہ) عرصہ تک (یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) افعالِ شرک کا اِبطال نام لے لے کر کرنا یکسر موقوف؛ اِس سارے عمل کی جگہ صرف خلافت خلافت پکارنا ہی سنت اور سیرت کی صحیح رِیڈنگ reading ہے!

11 "قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ جاویں۔ زمین شق ہو جاوے۔ اور پہاڑ زمین پر دھڑام ہو جاویں۔ کہ انہوں نے رحمٰن کا بیٹا پکار ڈالا! حالانکہ نہیں یہ شان رحمٰن کی کہ وہ بیٹا جنے"۔

ہی پیدا کرتا ہے۔ انقلابی منہج تو اِس کو 'کی مرحلے' کا جزوِ لاینفک بھی شاید نہ گنے!

6. کلاسیکل ڈسکورس میں آپ کا مرکزی ترین فوکس: "معاشرہ" ہو گا۔ جبکہ انقلابی ڈسکورس میں: "حکومت"۔ اول الذکر کا بنیادی ترین میدان "عقول" اور "نفوس"، جبکہ ثانی الذکر کا "اختیارات"۔

7. اسلامی تاریخ پڑھنے میں بھی یہاں ایک اپروچ کا فرق آ جاتا ہے۔ کلاسیکل ڈسکورس خلافتِ راشدہ کو اسلام کے ایک مثالی دور کے طور پر لیتا ہے۔ البتہ "مثالی" سے نیچے صرف صفر ہی نہیں ہوتا! تاہم انقلابی ڈسکورس اسلامی تاریخ پڑھنے کے دوران معاملے کو تقریباً یوں دیکھتا ہے گویا ایک چیز یا تو پورا سو ہوتی ہے یا صفر؛ بیچ میں کچھ نہیں! چنانچہ اس ذہن سے تاریخ پڑھتے ہوئے؛ اسلامی تاریخ تیس سال کے بعد قریباً سائیں سائیں کرنے لگتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ: کسی دَور یا کسی اجتماعی واقع کو جانچنے میں وہاں کی 'سیاسی صورتحال' کو کچھ زیادہ ہی یا شاید کُلی وزن دے ڈالنا۔ جبکہ تاریخ کو 'معاشروں' یا 'تہذیبوں' کی نظر سے پڑھنا، ادیان کی کشمکش اور ملتوں کی آویزش کی نظر سے پڑھنا تقریباً یہاں اوجھل ہے۔ حالانکہ تاریخ پڑھنے یا ایک اجتماعی واقع کو جانچنے کی یہ کوئی چھوٹی جہت نہیں۔ پھر یہ معاملہ 'تاریخ' پڑھنے پر موقوف نہیں؛ خود "نظر" ہی سے متعلق ہے۔ اصل میں اس کے اندر وہ تمام ترجیحات پوشیدہ ہیں جو ہمارے ائمہ متقدمین کے یہاں معاملات کو دیکھنے میں پیش نظر رہی تھیں، اور جن کے تحت افریقہ، اندلس، ایشیا (خود ہمارا برعظیم پاک وہند) اور مشرقی یورپ کا ایک بڑا حصہ خلافتِ راشدہ کے بعد ہی کامیابی کے ساتھ اسلام کے زیر نگیں لے آیا گیا اور یہاں شرک کے اندھیرے ختم کر ڈالے گئے تھے۔ پس اصل مسئلہ ایک "ملی جلی ہوئی صورتحال" کو دیکھنے اور سلجھانے میں ہے جو خلافتِ راشدہ کے ختم ہونے کے بعد سے لے کر آج تک چلی آتی ہے اور خدا ہی جانے کب تک جاری رہتی ہے۔ (اغلباً قربِ قیامت تک

جاری رہے گی)۔ ایسی ”ملی جلی ہوئی صورتحال“ کو پچھلے چودہ سو سال سے یہ کلاسیکل ڈسکورس ہی سنبھالتا آیا ہے اور یہ صرف اسی کے سنبھالنے کی ہے۔

8. ”کام“ کا فارمیٹ کلاسیکل منہج کے اندر خالصتاً 'دعوتی' ہوتا ہے۔ یعنی ایک سلسلۂ رشد و ہدایت اور بس۔ (باقی بہت کچھ ہوتا ہے؛ مگر اپنے اپنے سیاق میں لا کر، اور اپنے اپنے خانوں میں رکھ کر، اور خاص احوال و ظروف کی رعایت سے۔ البتہ عمل کا ایک عمومی دھارا اِس کلاسیکل فارمیٹ میں ان تین چیزوں پر ہی مبنی ہوتا ہے: علماء و طلبۂ علم کی کھیپ بر آمد کرنا، عوام کو رشد و تلقین، اور حکام کو پند و نصیحت اور ان کے معاملات پر گہری نظر اور وہاں دستیاب عوامل کو ہلانا جلانا maneuvering)۔ ادھر انقلابی منہج کے اندر ”کام“ کے فارمیٹ کو لازماً 'تنظیمی' ہونا ہوتا ہے۔

[کام کے 'دعوتی' و 'تنظیمی' فارمیٹ کے فرق کی کچھ وضاحت: 'دعوتی' سے ہماری مراد: کسی خاص عقیدہ یا نظریہ یا عمل یا رویّے کو لوگوں سے منوانے اور ان سے اس پر عمل کروانے پر ہی داعیوں کا کل زور ہوتا ہے اور اس سے متصادم کسی عقیدے یا نظریے یا عمل یا رویّے کو نفوس کے اندر شکست دینے پر ہی کل توجہ رکھی جاتی ہے۔ سب شور، سب اختلاف، سب ترکیز اسی پر ہوتی ہے۔ یعنی عقائد، نظریات، اعمال، اخلاق اور رویّے ہی دعوت کا کل مضمون ہوتے ہیں؛ سلباً یا ایجاباً۔ اور اس کے نتیجے میں آگے آنے والوں میں سے (1) خواص کو طلبہ و علماء میں ڈھال دینا اور ایسے نور کے مناروں کی ایک سے بڑھ کر ایک کھیپ نکال دینا۔ (2) اور اس کے ذریعے عامۃ الناس کو تلقین و ارشاد۔ (3) جبکہ بااثر طبقوں میں اثر و رسوخ (اور اِرادتمند) رکھنے کو دین کی تمکین کا ذریعہ بنا کر رکھنا؛ اور یہاں جتنے مہرے خالص اسلامی ایجنڈا کے لیے ذہانت اور ہوشمندی سے ہلائے جاسکتے ہوں، ہلانا اور کسی کسی وقت تو بااثر طبقوں میں اپنے ارادتمندوں کی پشت پر کھل کر آجانا (کسی جہادی یا اصلاحی مہم میں اپنے پیروکاروں کو لے کر باقاعدہ ان کے ہم رکاب

چلنا) البتہ یہاں بھی 'مثالی' ہونے کی بجائے اندریں صورت 'جو مل سکتا ہو' اسے ہی لینے پر اکتفاء کرنا (اِس آخری بات کو تو کلاسیکل منہج کا مرکزی ترین نقطہ جانیے)۔ جبکہ اس کے مقابلے پر 'تنظیمی' فارمیٹ سے ہماری مراد: جس میں کسی کو 'جوائن' join کرنے یا نہ کرنے کا معنیٰ غالب تر ہوتا ہے۔ 'کارکن'، 'ممبر شپ'، 'امیر / ناظم / صدر'[12]، 'دفتر' وغیرہ ایسی لغت ملتی ہے۔ "نظم" یہاں ایک خاصی مرکزی اصطلاح ہوتی ہے اور "ارشادِ عامہ" کے مقابلے پر ایک حاوی تر حقیقت]۔

9. کلاسیکل منہج چونکہ معاملے کو زیادہ 'امتوں'، 'عقیدوں' اور 'ملتوں' کی سطح پر دیکھتا ہے لہٰذا 'نظام' وغیرہ سے قطع نظر بھی یہ ہندوؤں، صیہونیوں اور صلیبیوں کی دستبرد سے مسلم ثقافت، مسلم مفادات، مسلم زمینوں، آبادیوں، پانیوں یا کسی وقت مسلم عزتوں اور آبروؤں کو بچانے کے لیے جہاد کو واجب ٹھہراتا ہے اور اسے "اللہ کے راستے کا جہاد" گنتا ہے۔ جہاں مسئلہ دو ملتوں کا ہو، وہاں یہ مسئلے کو 'دونَ مالہٖ' یا 'دونَ ارضہٖ' سے بڑا دیکھتا ہے اور براہِ راست "فی سبیل اللہ" سے جوڑتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی وقت 'گائے کی قربانی' کا مسئلہ ہی اس کے نزدیک جہاد کا مستوجب ہو سکتا ہے (کیونکہ نزاع کی طبیعت یہاں "ملتوں" والی ہے) چاہے گائے کی قربانی کرنے والوں کی سائڈ پر

[12] ہم چاہیں گے، احیائے دین کو گہرائی میں جاننے کے اندر دلچسپی رکھنے والے حضرات ان نقاط کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہاں ہمارے پاس تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ 'لفظی' بحثیں ہمارے پیش نظر نہیں۔ کچھ مفہومات واضح ہو جائیں تو ہم اسے اپنے بیان کا حاصل سمجھیں گے۔ ایک اصلاحی و اِحیائی عمل میں 'امیر' یا 'صدر' یا 'ناظم' وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ابن حنبل، غزالی، ابن تیمیہ، احمد سرہندی، محمد بن عبدالوہاب وغیرھم رحمۃ اللہ علیہم کے کھڑے کیے ہوئے عظیم الشان احیائی عمل اِس 'امیر / صدر' وغیرہ ایسی اشیاء کے بغیر ہی ہوئے ہیں۔ براہِ کرم جدید اور قدیم فارمیٹ میں 'اپروچ' کا یہ فرق سمجھنے کی کوشش کیجئے، لفظوں میں مت الجھئے۔

'اسلامی نظام' کسی وجہ سے قائم نہ بھی ہو یا اس کی کوئی صورت ان کے یہاں میسر نہ بھی ہو۔ لیکن انقلابی فکر کی سوئی بار بار یہاں بھی، بلکہ ہر جگہ، 'نظام' کے مسئلہ پر اٹکے گی۔ روس کے خلاف افغانستان کے جہاد میں چونکہ اس ذہن کو جیت کی صورت میں 'اسلامی نظام' آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا اسلام اور کمیونزم کے مابین زندگی موت کی نوبت کو جا پہنچنے والی ایک خونیں کشمکش کو بھی یہ "جہاد" ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ یہی مسئلہ اِس ذہن کے ہاں جہادِ کشمیر اور جہادِ فلسطین کے معاملہ میں آڑے آتا رہا ہے۔ اور شاید برما اور بوسنیا وغیرہ کے معاملہ میں بھی۔ یعنی کسی جگہ کے مسلمان اگر اس قدر پسماندہ یا بے بس ہیں کہ 'نظام' سے متعلقہ موضوعات ان بیچاروں کو ازبر نہیں ہیں لیکن غیرتِ دینی اس قدر ہے کہ مسلم عزتوں کو کافر کے ہاتھوں پامال ہوتا برداشت نہیں کر سکتے اور اس پر کافر کا ہاتھ توڑنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ ذہن اُس کے جہاد کو 'فی سبیل اللہ' نہیں مانے گا جب تک کہ وہ 'نظام' کا مسئلہ ہی لے کر کھڑا نہیں ہوتا! کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کو پہنچنے والے پاکستانی نوجوانوں یا ان کی تنظیموں کے سامنے اِن حضرات کا بار بار یہ سوال لانا کہ کیا اپنے ملک میں اسلامی نظام لے آئے جو پرائے ملک کا رخ کرنے چلے، اِسی اندازِ فکر کا شاخسانہ رہا ہے۔

10. انقلابی ذہن چونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے کام کو "انقلاب" سے تعبیر کرتا ہے، لہٰذا اُس کے تمام طریقۂ کار اور مراحل کو بھی عموماً 'منصوص' کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود، اپنے طریقہ کار کے تعین میں یہ ایک شدید غموض اور اختلاف کا شکار ہے! اپنی مثالی حالت میں، ایک انقلابی جماعت سوائے اپنی تقریر و تحریر کی ایک سرگرمی اور سوائے اپنی ایک داخلی نظم بندی رکھنے کے، عملاً کچھ نہ کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ علاوہ کچھ موہوم واقعات رونما ہو جانے کا انتظار کرنے کے، جس کا تعلق عمل سے نہیں۔ نوٹ کیجئے، ہم نے کہا: اپنی مثالی حالت میں۔ یہ

ایک واقعہ ہے جو سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ تک کے 'دورِ اول' پر صادق آتا ہے۔ انقلابی جماعت کی مثالی حالت عملاً ایک عزلت isolation سے عبارت ہوتی ہے خواہ وہ اسے جتنا بھی طول دینا چاہے۔ 'نظامِ قائمہ' status quo میں شرکت، اس کو تبدیل کر ڈالنے سے پہلے، اصولاً 'نظریۂ انقلاب' کے منافی ہے۔ تاہم اگر یہ نظامِ قائمہ میں شرکت نہ کرے تو بیشتر معاشرتی فورمز سے دور، معاشرتی عمل پر اثرانداز ہونے سے قاصر، اپنے ہی مراکز میں پڑی، پرانی ہوتی رہتی ہے۔ ایک نظامِ قائمہ کے فراہم کردہ مواقع لینا اور "استطاعت" کی حد تک اس میں سے خیر نکالنا اور باقی کے معاملہ میں صابر رہنا دراصل کلاسیکل منہج ہے؛ اور انقلابی منہج کی ضد۔ لہٰذا انقلابی منہج اپنی مثالی حالت میں ایک عزلت isolation ہی ہے یعنی کچھ تقریر و تحریر اور داخلی نظم تک محدود رہنا۔ اور جہاں تک اس کی تحریر و تقریر کا تعلق ہے تو اس کا فارمیٹ بھی چونکہ صرف عقائدی و دعوتی (ارشادِ عامہ) طرز کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں تنظیمی طرز ہی غالب ہوتا ہے اس لیے یہ تحریر و تقریر ماحول کے اندر 'دعوت' کا فائدہ بھی تقریباً نہیں دے رہی ہوتی۔ انجامِ کار؛ یہ عزلت ایک پکی پکی بند گلی ہوتی ہے؛ جس کو چھوڑے بنا چارہ نہیں۔ یہاں وہ پوائنٹ ہے کہ سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ ایسے فہمیدہ و دُور بین لوگ صورتحال کو بجا طور پر بھانپتے ہوئے؛ 'کومپرومائز' کا طعنہ سہہ لینا اپنی اسی عزلت isolation و انجماد stagnancy کا اسیر رہنے کی نسبت وارے کا جانتے ہیں، جو کہ ہمارے نزدیک آپؒ کا ایک راست اقدام ہے۔ بس کمی سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ رہ جاتی ہے کہ وہ اسے ایک 'کومپرومائز' رکھتے ہیں۔ یعنی اپنے "نظریے" میں ایک انقلابی جماعت صرف اپنے "راستے" کی حد تک غیر انقلابی ہو جائے؛ جو کہ ایک غیر طبعی جوڑ ہے۔ حالانکہ اگر پورا فارمیٹ تبدیل کر لیا جاتا اور نظریے کے اندر ہی "انقلاب" کی بجائے "ایک دی گئی صورتحال میں ممکنہ

طور پر ایک بہترین کردار ادا کر جانے پر اکتفاء"[13] لے آتے... اور فلسفۂ انقلاب کے تحت جن فرائضِ وقت کو مؤخر یا نظر انداز کروایا جانا ہوتا ہے، باقاعدہ ایک کلاسیکل منہج پر آتے ہوئے، (غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، احمد سرہندیؒ وغیرہ کی طرز پر) وقت کے اُن فرائض ہی کو لے کر کھڑے ہو جاتے... خصوصاً معاشرے کی تعلیم اور تیاری کا ایک مؤثر اور آسان فارمیٹ سامنے لاتے ("ارشادِ عامہ" ہمارے ائمہ و مشائخ کا ایک معروف کلاسیکل منہج ہے) اور اس کو تنظیمی کی بجائے ایک بے تحاشا

---

[13] یہ ہے "انقلاب" اور تبدیلی کے "روایتی منہج" کا دوسرا بڑا فرق:

انقلاب: سیاسی عمل میں ایک کامل و مثالی تبدیلی کا دوٹوک مطالبہ۔ لوگوں کو اس کا واضح باقاعدہ ہدف دینا اور اس بنیاد پر لوگوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی صدا لگانا۔

کلاسیکل: اسلام پر ایک کامل و مثالی انداز میں چلنے کا پیراڈائم تو "فرد" یا "معاشرے" کے حق میں بے حد واضح رکھنا۔ لیکن عملی میدان میں صرف اُسی چیز کے لیے کیمپین campaign اور لابنگ lobbying کرنا جو اندریں صورت "ہونے والی" نظر آتی ہو۔ اس سے بڑھ کر (عملی حوالے سے) کسی چیز کا نعرہ یا لوگوں کی امید ہی نہ لگوانا۔

یہ تاثر درست نہیں کہ ہمارے ائمہ کا وہ (کلاسیکل) منہج کوئی تبلیغی جماعت ایسا ہے۔ حق یہ ہے کہ ہمارے یہ ائمہ وقت کے سماجی، سیاسی و تہذیبی عوامل پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ بس یہ اندازہ رکھتے تھے کہ ایک 'دی ہوئی صورتحال' میں in a given situation کیا چیز ملنے کی ہے جسے منہ پر لایا جائے اور حکمران یا عوام طبقوں میں اس کی تحریک اٹھادی جائے... اور کیا چیز ایسی ہے جو اندریں صورت ہونے والی نہیں ہے اور اسے مانگ کر یا اس کا شور اٹھا کر کہیں اس چیز سے بھی جائیں جو ہو سکتی ہے۔ نیز اندریں صورت "جو نہیں ملنے والا" اس کی 'جدوجہد' میں لگ کر وہ بہت سے شعبے موقوف یا متاثر ہوں جو اندریں صورت چلنے والے بھی تھے اور امت کے حق میں فوری و ناگزیر بھی۔

دعوتی رَو بنا ڈالتے تو یہ غیر انقلابی راستہ (یعنی 1۔ نظامِ قائمہ prevailing system کے اندر ہی ایک لطیف سرایت کر جانا، 2۔ نظامِ قائمہ کے اندر کارفرما عوامل factors کے ساتھ پوری ذہانت کے ساتھ کھیلنا an intelligent maneuvering، اور 3۔ نظامِ قائمہ کے دستیاب کردہ مواقع سے ــــ نظریہ میں اپنے ایک ٹھیٹ پیراڈائم پر رہتے، مگر عمل میں استطاعت اور موازنۂ مصالح و مفاسد کے منہج پر چلتے ہوئے ــــ بھرپور گنجائش لینا)[14] یقیناً آپ کو کچھ بہت کارآمد منزلوں پر پہنچاتا۔ یہ منزل ظاہر ہے 'انقلاب' تو نہ ہوتا (اِلّا اَن یشاءَ اللہ) لیکن معاشرے میں اسلامی عمل کی ایک کمال پیش رفت ضرور ہوتا۔ نیز بعد کی فرسٹریشن frustration کی نوبت بھی یہ چیز نہ آنے دیتی۔

11. یہ واضح کرتے چلیں، ذہنوں کا یہ فرق دعوتی یا سیاسی دنیا تک محدود نہیں۔ خود جہاد (معاصر) میں یہ دونوں دھارے برابر پائے جاتے ہیں۔ عبد اللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ نوجوانوں پر حملہ آور اُس ذہن کو بڑی ابتداء میں بھانپ گئے تھے جو جہادِ افغانستان پر یہ سوال اٹھا رہا تھا کہ: افغانوں کے سات جماعتی اتحاد کی حالت تو دور دور تک نہیں بتا رہی کہ روس کو نکالنے کے بعد یہ ملک میں 'اسلامی نظام' نافذ کر لیں گے، پس یہ جہاد کیسا؟! یا کسی وقت یہ نوجوان جہادِ افغانستان پر اس حوالے سے سوال اٹھاتے کہ: یہ تو کچھ غیر شرعی حکومتوں اور انٹیلی جنسوں سے مدد لیتا ہے پس یہ جہاد کیسے؟! [وجہ وہی: تاریخی طور پر مسلمانوں کے منہجِ استطاعت کو نہ جاننا۔ اور "**ایک دی ہوئی صورتحال میں ممکنہ طور پر بہترین کردار ادا کر جانے پر اکتفاء**" کے کلاسیکل منہج کو رد کرنا، اس لیے کہ ایک 'مکمل مطلوب صورتحال' تو یہاں پیدا ہو ہی نہیں رہی! لہٰذا صورتحال

---

14 "انقلاب" اور تبدیلی کے "روایتی منہج" کا یہ تیسرا بڑا فرق ہے۔

’جتنی بہتر ہو سکتی ہے‘ اس کو بھی خاطر میں نہ لانا بلکہ صاف مسترد کر دینا۔ اور ’شر کو جتنا دفع کیا جا سکتا ہے‘ یہاں اس کا بھی روادار نہ ہونا۔ یہ انقلابی منہج بنیادی طور پر ایک مثالیت پر قائم ہے۔ جبکہ کلاسیکل منہج: ایک دی ہوئی صورتحال کے اندر ہی جو مصالح اور مفاسد ہیں ان کا ایک واقعاتی موازنہ؛ نیز جو چیز ایک دی ہوئی صورتحال میں آپ کو مل ہی نہیں سکتی اس کے لیے نہ ضد کرنا، نہ نعرے لگوانا، نہ اس سے لوگوں کی یوں امیدیں وابستہ کروانا گویا وہ تو کسی بھی موڑ سے بر آمد ہوئی کہ ہوئی! چونکہ یہاں واقعیت پسندی ہے؛ لہٰذا کلاسیکل منہج حوصلے پست ہونے کی کوئی بنیاد ہی سرے سے نہیں چھوڑتا، (کہ ان حوصلوں کو بحال کروانے کے پھر ڈھیروں جتن کرنے پڑیں)۔ ظاہر ہے بچوں کے ساتھ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہنڈیا میں پانی چڑھا کر ڈوئی ہلاتے رہیں کہ آخر انہیں نیند آجائے گی اور صبح اٹھ کر کوئی اور ہاتھ پیر مار لیں گے، بڑوں میں البتہ ایسی ’نیند‘ نہیں رکھی گئی! چنانچہ کلاسیکل فقہ کا یہ ”مصالح و مفاسد کے موازنہ“ والا قاعدہ ایک نہایت واقعاتی اور بری سے بری صورتحال میں کام دینے والا اصول ہے؛ جو دینی عمل کو ایک کمال ڈائنامزم dynamism دیتا ہے (ڈائنامزم اُسی وقت آتا ہے جب اس کے اندر ایک گونا لچک flexibility ہو)۔ انقلابی ذہن چونکہ مثالیت میں رہتا ہے (یوٹوپیا، جو ’لچک‘ جانتا ہی نہیں)، لہٰذا اس طبقے کے نوجوانوں کے یہاں فقہاء کے ”مصالح و مفاسد“ والے قاعدہ کا مذاق تک اڑایا جاتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے، اس ٹھٹھے اور مذاق سے عبد اللہ عزام کو بھی خوب نوازا گیا۔ عبد اللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ جب اپنے خطبوں میں کہتے: ”مت توقع رکھو کہ افغان مجاہدین ادھر روس کو افغانستان سے نکالیں گے اور ادھر ملک میں اسلامی نظام کا دور دورہ ہو جائے گا۔ بھائی یہاں بہت کچھ چیزوں سے ابھی تمہیں گزرنا ہے۔ بڑی بڑی گھاٹیاں اور کھائیاں ہیں۔ فی الحال ایسی کسی بات کی توقع مت رکھو“۔ تو اس پر پشاور کے کچھ عرب حلقوں میں ایک قہقہہ پڑتا۔ عبد اللہ

عزامؒ پر کھل کر تنقید ہوتی کہ لو یہ بات ہے تو پھر جہاد کرنے ہی یہاں کیوں آئے۔ 'اسلامی نظام' نہ آیا تو ہم تو ان افغان قیادتوں کو گریبانوں سے پکڑیں گے]۔ نوجوانوں کے ذہنوں سے ایسے اشکالات کو رفع کرنے پر عبداللہ عزامؒ کی اچھی خاصی محنت ہوئی تھی۔ اور کچھ 'فاصلے' بھی بڑھتے گئے۔ آخری سالوں تک پہنچتے پہنچتے ایک شدت پسند طبقہ جہادی دنیا کے اندر عبداللہ عزامؒ کے منہج کو صاف رد کرنے لگا، واقفانِ حال سے یہ ہرگز اوجھل نہیں۔ یہی طبقہ تھوڑی دیر میں الجزائر کے اندر شروع ہونے والے مسلح عمل کا روحِ رواں ہوا۔ اور اس سے سامنے آنے والے نقصانات اب ہر کسی کو معلوم ہیں۔ لیکن یہاں سے ایک اور چیز مسئلہ سے جڑتی ہے اور وہ ہے تکفیر۔ اس سے مابعد نقصانات کا تعلق البتہ اِس نئی فکر (تکفیر) سے ہے۔ یہ بالکل ایک اور چیز ہے۔ محض انقلابی ڈسکورس کو اس کا بوجھ اٹھوانا ہماری نظر میں زیادتی ہو گی۔ ہاں یہ واضح کر دینا مناسب اور ضروری ہے کہ: جہاد کے باب میں **کلاسیکل ڈسکورس** کی حامل جماعتیں وہی ہیں **جن کی نظر اپنے ملکوں کی داخلی صورتحال سے متعلق 'نظام' کے مسئلے میں اٹک نہیں جاتی**۔ اس سے گزر کر؛ وہ اپنی قوموں کی تمام ترکمیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے علی الرغم کافروں سے ان کا دفاع کرنے پر یقین رکھتی ہیں اور مسلم خون، مسلم مفاد، مسلم زمین اور مسلم استحکام کی محافظ ہیں۔

اب یہ کہنا ظاہر ہے تحصیلِ حاصل ہو گا کہ... ہمارا اپنا فکری قبیلہ دین کا یہی کلاسیکل ڈسکورس ہے؛ اور اسی کے رجال ہمارے ائمہ واساتذہ۔ اسی کے اندر ہم اسلام کا اِحیاء اور قوت دیکھتے ہیں۔ اس منہج میں جو ایک کمال لچک flexibility اور فاعلیت dynamism ہے... ہم بجا طور پر یہ کہتے ہیں: اس سے کماحقہٗ استفادہ ہمارے یہاں ابھی ہوا نہیں؛ ورنہ اس کے اعلیٰ ثمرات دیکھے جاتے۔ اب بھی اس کی جانب آنے میں کوئی حرج نہیں۔

مار دھاڑ اور جدت پسند بیانیوں کا ظہور
اور انقلابی منہج کو درپیش فرسٹریشن

مضامین

حامد کمال الدین

ایک چیز عین ابتداء کے اندر واضح کر دی جائے۔ ہماری یہ معروضات نہ کسی 'تبلیغی' ڈسکورس سے پھوٹ کر آ رہی ہیں (جسے سیاست سے کچھ سروکار نہیں) اور نہ کسی 'جہاد مخالف' ڈسکورس سے (جسے عالمِ کفر کی حالیہ یلغار کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں)۔ ہمارا فکری تعلق یقیناً اُس کیمپ سے ہے جسے مغرب اپنی کسی خاص غرض کے تحت 'پولیٹیکل اسلام' کا نام دیتا ہے اور جس کا درست نام ہمارے ہاں "سیاسة شرعیة" ہے۔ یعنی فی زمانہ عالم اسلام پر مسلط مغربی نظاموں سے خلاصی اور ان کی جگہ پر شرعِ محمدی کی حتی الوسع بحالی اور مسلم زندگی کی اس پر استواری۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ (اندرونِ عالمِ اسلام فرنٹ پر)۔ نیز ہمارا فکری تعلق اُس جہادی ڈسکورس سے ہے جسے ہم سہولتِ مبحث کے لیے کسی وقت 'عبد اللہ عزامؒ کی اکیڈمی' کہتے ہیں، یعنی مسلم مقبوضہ جات کو واگزار کرانے کے لیے جہاد، اور جو کہ متعدد مسلم خطوں کے اندر جاری ہے، مانند فلسطین، کشمیر، افغانستان وغیرہ۔ (بیرونی فرنٹ)

ہمارا قاری جانتا ہے، یہ دونوں فرنٹ ہم سے کس درجہ توجہ اور اہمیت لیتے ہیں۔ نیز ہم اِن دونوں محاذوں کو خلط بھی نہیں ہونے دیتے۔ ہمارے ڈسکورس میں دونوں کا اپنا اپنا محل برقرار رہتا ہے۔

انقلابی منہج کے سامنے دو راستے

البتہ "سیاسة شرعیہ" اور "انقلابی منہج" دو الگ الگ چیزیں ہیں، گو ان دونوں میں کچھ اشیاء مشترک بھی ہیں۔ ہیں یہ دو الگ الگ اپروچ باوجود اس کے کہ "سیاست" سے دونوں

بحث کرتے ہیں۔ دستیاب مواقع کو اسلامی ایجنڈا کے حق میں بہترین طور پر استعمال کرنا اور اِس راہ سے قوم کی اجتماعی زندگی کو اسلام کے تقاضوں کے ساتھ بقدرِ استطاعت ہم آہنگ کرتے چلے جانا "سیاسۃ شرعیۃ" ہی میں آتا ہے۔ اِس میں اور "انقلابی منہج" میں کیا فرق ہے، اس پر ہم ایک علیحدہ مضمون میں بات کر چکے۔ "انقلابی منہج" کے حوالے سے وہاں ہم دیکھ آئے، یہ اپنے اندر کچھ بے لچک قالب رکھنے کے باعث بالعموم ایک بند گلی پر پہنچتا ہے۔ جس کے بعد لازماً آپ کو ان دو میں سے کوئی ایک رخ اختیار کرنا ہوتا ہے:

1. ایک: نظرِ ثانی کا راستہ۔ جس میں آپ 'انقلابی' منہج سے واپسی کا راستہ لیتے اور بالعموم وہ روٹ اختیار کرتے ہیں جسے ہم "اصلاح بقدرِ استطاعت"[1] کا نام دیتے ہیں۔ یعنی دستیاب مواقع سے ہی اسلامی ایجنڈا کے حق میں جتنی خیر برآمد کروائی جا سکتی ہو کروانا اور 'پورے' کے انتظار میں 'جو ہو سکتا ہے' اُس سے ہاتھ نہ جھاڑ بیٹھنا۔ یہ چیز جسے ہم نے "اصلاح بقدرِ استطاعت" کہا، یقیناً **ایک صالح روٹ ہے بشرطیکہ اس کے پیچھے ایک غایت درجہ کی عقائدی پختگی اور ٹھیٹ پن کام کر رہا ہو،** جو کہ انقلابی جماعتوں میں کسی قدر محلِ نظر ہے۔ (بہت سی انقلابی جماعتیں تو 'عقیدہ' کا لفظ ہی سن کر تعجب سے دیکھتی ہیں کہ یہ ہوتا کیا ہے اور کس کام آتا ہے! ان کا زیادہ فوکس "ذاتی فہمِ قرآن" ہوتا ہے۔ اب اِس 'ذاتی' یا 'جماعتی' فہمِ قرآن کے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ یہ اُن فکری و وِجدانی کیفیات پر انحصار کرتا ہے جو ایک آدمی یا ایک تنظیم پر اس وقت گزر رہی ہوں۔ یعنی 'دل کا دریا' آپ کے ہاں جس رخ پر بہتا ہے اُسی رخ کے

---

[1] اصلاح بقدرِ استطاعت یعنی 'دیے گئے حالات میں' ہی جو کچھ ممکن اور جو 'مواقع' میسر ہیں ان کو دینِ حق کے حق میں بہترین طور پر استعمال کرتے اور اسی میں ایک اعلیٰ کارکردگی دکھاتے چلے جانا۔ کل کیا ہوتا ہے، اسے کل پر چھوڑنا۔ البتہ آج کیا ہو سکتا ہے، اس معاملہ میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دینا۔

استدلالات و استنباطات قرآن سے آپ پر 'کھلتے' چلے جاتے ہیں[2] اگرچہ آپ سمجھ یہ

---

[2] یعنی پہلے آپ ایک خاص فکری و وجدانی رخ اختیار کرتے ہیں اور اس کے بعد قرآن سے 'استدلالات' کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور تب آپ کا وہ فکری و وجدانی رخ اور بھی تقویت پاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ دنیا کا کوئی گروہ بغیر کچھ ابتدائی مقدمات اختیار کیے قرآن سے استنباط و استدلال کا سفر شروع کرتا ہو۔ پس سب سے اہم سوال یہی ہے کہ وہ **ابتدائی جہت** آپ کہاں سے پاتے ہیں؟ اسی کا نام درحقیقت 'مدرسہ' یا 'دبستان' یا 'عقیدہ' ہے۔ یہ چیز آپ متقدمین سے لے لیں یا متاخرین سے یا متجددین سے، مگر لینی آپ کو پڑے گی۔ اور کچھ نہیں تو خود اپنی ذات میں ہی آپ ایک 'مدرسہ' یا 'دبستان' یا 'عقیدہ' ہوں گے۔ اس کے یکسر بغیر البتہ آپ نہیں پائے جاسکتے۔ پس کوئی حلقہ یا تنظیم یہاں ایسی نہیں جو آپ کو ایک عدد 'مدرسہ' یا 'دبستان' یا 'عقیدہ' فراہم نہ کرتی ہو۔ یہ 'مدرسہ' یا 'دبستان' یا 'عقیدہ' ہی دراصل آپ کے 'فہمِ قرآن' کی ایک باقاعدہ ساخت کرنے والا ہوتا ہے، اگرچہ آپ کو لگے یہ کہ یہ تو خود قرآن ہے جس نے آپ کے اِن سب نظریات وافکار کی ساخت کر دی ہے۔ لہٰذا یہ سوال تو بے ضرورت ہے کہ آدمی کا کوئی 'عقیدہ' یا کوئی 'مدرسہ' ہونا چاہئے یا نہیں؛ یہ تو ہونا ہی ہونا ہے، اِس سے تو کوئی مفر نہیں۔ سوال آپ صرف یہ کیجئے کہ ایسا کوئی 'مدرسہ' یا 'عقیدہ' رکھنے کے معاملہ میں آپ متقدمین کے دستور کی پابندی کرتے ہیں یا آپ کا شجرہ اِس معاملہ میں آپ کے اپنے ہی دور اور اپنے ہی شہر پر ختم ہو جاتا ہے؟

سلف کا یہ کہنا کہ ''پہلے ہم ایمان سیکھتے، پھر ہم قرآن سیکھتے، تب ہم ایمان میں اور بھی ترقی کرتے''، آج ہمارے لیے ڈھیروں غور کا متقاضی ہے۔ ایمان کی حقیقتیں مدرسہ ٔصحابہؓ سے سیکھنا، جو کہ آپ کے فہمِ قرآن کو ایک باقاعدہ جہت دے جاتا ہے، اِسی کو درحقیقت ہم تعلیمِ عقیدہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا، یہ چیز آپ ''پہلوں'' سے نہیں لیں گے تو 'بعد والوں' سے لیں گے یا خود وضع کریں گے، چوتھی کوئی صورت نہیں۔

یہ ایک علیحدہ سے بے حد اہم مضمون ہے جو ایقاظ میں مختلف جہتوں سے دہرایا جاتا ہے۔

رہے ہوں کہ آپ کے نظریات تو براہِ راست قرآن سے ماخوذ ہیں، نیز اس سے متصادم نظریات تو صاف قرآن سے متصادم ہیں! یہ ایک واقعہ ہے کہ یہاں کے مختلف فکری گروہ اپنے اپنے 'رجوع الی القرآن' کے دوران کچھ بنیادی ترین امور میں ایک دوسرے سے متعارض استدلال فرمارہے ہوتے ہیں؛ باوجودیکہ دونوں کے ہاتھ میں جو قرآن ہے وہ ایک ہے! جس کے باعث، ہر دو فریق کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ایک دوسرے کو یا تو 'متعصب' گردانیں جو اپنی 'غلط رائے' چھوڑنے پر آمادہ نہیں یا ایک دوسرے کے فہم کو قرآن 'غور سے' نہ پڑھنے کا نتیجہ قرار دیں!)۔ ایسے عقائدی ٹھیٹ پن کی غیر موجودگی میں، "اصلاح بقدرِ استطاعت" کے روٹ پر چل پڑنے کی صورت میں، خدشہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے جیسے حالات، جیسا جیسا ماحول، جیسی جیسی فضا اور جیسی جیسی جذباتی کیفیت ان کو ہر ہر مرحلے کے اندر پیش آتی جائے گی ویسی ویسی تبدیلیاں اِن کے اپنے فکری پیراڈائم کے اندر رونما ہوتی چلی جائیں گی؛ یہاں تک کہ اِن مصلحین ہی کو بالآخر کچھ سے کچھ بنا چھوڑیں گی۔[3] نتیجتاً، یہ

---

[3] مثلاً یہ حضرات اپنے 'انقلابی' دور میں جمہوریت کو دورِ حاضر کا کفرِ عظیم گردانیں گے۔ یا کم از کم بھی اسے شدید باعثِ تنقید جانیں گے۔ لیکن کسی سبب سے اگر یہ فیصلہ کرلیں کہ جمہوریت کی بنیاد پر بننے والے ایوانوں میں اِن کو بہر حال کوئی فائدہ مند کردار ادا کرنا چاہیئے... تو کچھ دیر بعد شاید آپ ان کو 'جمہوریت' کا ایک بہترین ایڈووکیٹ بنا ہوا بھی دیکھیں! (جیسا کہ ہماری برصغیر کی تحریک اسلامی کے بعض سرکلز کا حال رہا)۔ کہیں پر ایک اسلامی حلقے کو آپ 'سیکولرزم' کا دفاع کرتے ہوئے بھی دیکھیں (جیسا کہ جناب رجب اردگان کو اخوانِ مصر کو مشورہ دیتے وقت ملاحظہ کیا گیا)۔ یہ جو چیز ہے، بظاہر کچھ لوگوں کو یہ "دستیاب مواقع کو لینے" یا "اصلاح بقدرِ استطاعت" کا منہج اختیار کرنے کا نتیجہ نظر آئے گا۔ جو کہ درست نہیں۔ ہماری نظر میں، یہ ہے نتیجہ فکری

صلابت (عقائدی ٹھوس پن) کی کمی کا؛ جو کہ شروع سے تھی لیکن عمل کے میدان میں اترنے کے ساتھ سامنے آگئی۔ ہاں یہ (فکری ٹھیٹ پن کی کمی) البتہ قدم قدم پر 'حالات' کے اثرات کو قبول کرنے کی صورت میں اپنا ظہور کرے گی۔ عربی میں اس کیفیت کو تمیُّع کہتے ہیں، یعنی مائع پن، کیونکہ 'مائع' کی اپنی کوئی شکل نہیں ہوتی، مائع جن ظروف میں ڈالا جائے گا اس کی وہی شکل ہو جائے گی۔ ایک بے لحاظ حد تک ٹھیٹ فکری پیراڈائم رکھے بغیر اِس (اصلاح بقدرِ استطاعت) والے کوچے کا رخ کرنا البتہ نمک کی کان میں نمک ہو جانے پر منتج ہو سکتا ہے، یہ ہم مانتے ہیں۔ بلکہ ہمارا کیس ہی یہ ہے۔ **عقیدہ میں صلابت جبکہ عمل میں آسان روی** معاشرے کی سرزمین پر پیش قدمی میں آپ کو بہترین توازن دیتی ہے۔ عمل میں آسان روی نہ ہو تو آپ بیٹھے رہتے ہیں؛ چل نہیں پاتے، اور وقت گزاری ہوتی ہے۔ عقیدہ میں صلابت نہ ہو تو آپ اپنی راہ چلنے کی بجائے کسی کی راہ چلنے لگتے ہیں۔ پس نہ ایسا بیٹھنا اچھا جو آپ کے عقیدہ کو معاشرے میں راستہ بنا کر نہیں دے سکتا۔ اور نہ ایسا چلنا اچھا جو آپ کے اپنے عقیدہ اور اپنے ایجنڈا کی پیش قدمی نہیں۔

(بات مجموعی رویے کی ہو رہی ہے۔ ورنہ ایسا نہیں ہے کہ فکری مفاہمت compromise in ideology کا راستہ چلنے والی جماعتوں میں کوئی خیر ہے ہی نہیں اور کامیاب ہونے کی صورت میں یہ امت کے لیے کوئی بھلا لے کر نہیں آئیں گی۔ ظاہر ہے ہماری گفتگو کا سیاق یہاں کچھ اور ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ جماعتیں عمل میں تو صرف "ممکن" تک ہی محدود رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز نہ تو کوئی جلد بازی کریں اور نہ ہمت سے بڑھ کر کوئی بوجھ اٹھائیں اور نہ دستیاب مواقع کو ناں کریں البتہ اپنے نظریات میں زیادہ سے زیادہ ٹھیٹ رہیں اور اِس احاطہ میں مغربی مصنوعات کو پاس نہ پھٹکنے دیں تو یہ کومبی نیشن combination ان شاءاللہ کمال نتائج دے سکتا ہے۔ بلکہ ہم کہیں گے، یہ کومبی نیشن جس قدر بڑھیا ہو گا اتنے ہی بڑھیا نتائج دے گا۔ گو کچھ نہ کچھ نتائج ہر اسلامی جماعت ہی، اپنی پیش قدمی ہو جانے کی صورت میں، آپ کو دے

حضرات ماحول اور فضا کی اُتنی صورت گری shaping نہیں کریں گے جتنی کہ ماحول اور فضا اِن کی کردے گی۔ یہ حالات کو اُتنا ٹھیک نہیں کریں گے جتنا کہ حالات اِن کو 'ٹھیک' کردیں گے۔ یہاں تک امکان ہوتا ہے کہ آپ ماحول اور فضا ہی کے ہو جائیں۔ جو کچھ ٹھوس فکری مواقف اپنے 'دورِ انقلاب' میں آپ رکھا کرتے تھے وہ رفتہ رفتہ 'حالات' کی نذر ہو کر نری 'تاریخ' بن جائیں؛ اور آپ اپنے اُس تمام فکری اثاثے سے ہلکے پھلکے ہو کر نرے 'حالات' کے پیروکار۔ لہٰذا **فکری پیراڈائم میں اگر ایک غایت درجے کی صلابت اور ٹھیٹ پن پیدا کر لیا گیا ہو اور یہاں پر فکری نقل مکانی کے اسباب تلف کر لیے گئے ہوں، جو کہ ڈھیروں محنت کا متقاضی ہے... تو "اصلاح بقدرِ استطاعت" کو "انقلابی منہج" کے مقابلے پر ہم یقیناً ایک راست ترین منہج باور کرتے ہیں۔**

2. دوسرا: جمود stagnancy کا راستہ۔ جس میں آپ اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں کہ 'پورے نظام' کو سر تا پیر تبدیل کر دینے (انقلاب) اور اِس سے کم کسی بات کو ہاتھ نہ لگانے کا جو ایک ہدف آپ نے اپنی جدوجہد کے لیے بہت عشرے پہلے مقرر کیا تھا... باوجود اس کے کہ دُور دُور تک اِس کے پورا ہونے کی کوئی عملی صورت نظر نہیں آتی، اور واقع میں یہ ایک نہایت غیر حقیقی یا غیر عملی ہدف یا ایک بند راستہ dead end ہی

گی۔ اس لیے ہم اس کی مدد و اعانت تو اسلام دشمنوں کے مقابلے پر ہر حالت میں ہی کریں گے، خواہ وہ پاکستان کی کوئی دینی جماعت ہو یا ترکی کی یا مصر کی۔ البتہ عمل میں اس کی پیش قدمی کی حمایت و تائید کے ساتھ ساتھ اس کے فکری پیراڈائم کو زیادہ سے زیادہ خالص اور ٹھیٹ رکھنے کی اہمیت کو بھی اجاگر کریں گے کہ کومبی نیشن combination اصل میں ہے ہی یہ: عمل میں: صرف وہ جو ہو سکے۔ اور نظریے میں: صرف وہ جو ہونا چاہئے)۔

دکھائی دیتا ہے، لیکن آپ کے لیے چونکہ یہ ایک 'عقیدہ' کا مسئلہ ہے لہٰذا آپ تو ایسے ہی کسی واقعہ کے انتظار میں رہیں گے خواہ یہ جب بھی ہو، اور نہیں ہوتا تو نہ ہو، اِس سے ہٹ کر اپنائے جانے والے راستے البتہ غلط اور خلافِ شریعت ہیں اور یہی ایک راستہ درست و حقیقی راستہ ہے۔ مگر یہ محض اپنے آپ کو سمجھانے والی بات ہوتی ہے۔ عملاً آپ اپنی توقعات کے ساتھ ایک واضح سمجھوتہ کر چکے ہوتے ہیں اور آپ کے سب رویے اور معمولات اسی کی خبر دے رہے ہوتے ہیں، جسے جانچنے کے لیے ایک ہلکا سا نفسیاتی تجزیہ کفایت کرتا ہے۔ یعنی کھڑا پانی جس کے بحر کی موجوں میں اب وہ اضطراب نہیں۔ وہ بے قابو ولولے جو ابتدائی عشروں میں کہیں سے پھوٹ پھوٹ کر آرہے تھے اور ایک صاف طغیانی کا پتہ دیتے تھے، اب کسی 'بھاری پتھر' کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے ہوتے ہیں، اگرچہ عبارتیں آپ کے ہاں وہی کی وہی ہوں۔ معاملات کا نظریاتی ہی نہیں، نفسیاتی جائزہ بھی آپ کو بہت سے فائدہ مند نتائج تک پہنچاتا ہے۔ سیلاب کا پانی چڑھتے وقت اپنی کہانی خود کہتا ہے تو اُترتے وقت بھی آپ ہی اپنی زبان ہوتا ہے، اور ہر دو واقعہ کا فرق بے حد نمایاں۔ اِس اترتے پانی کا حل بہرحال آپ کے پاس نہیں ہوتا خواہ اپنے آپ کو سمجھانے اور شروع دن کے اسباق کا اعادہ کرنے میں کتنا ہی زور صرف کر رکھا گیا ہو۔ غرض ہر دن گزرنے کے ساتھ آپ منظر سے ہٹتے چلے جاتے ہیں خواہ اپنی ایک بند دنیا میں کتنی ہی چہل پہل اپنے اردگرد پائیں۔ دیکھنے والا صاف اندازہ کر سکتا ہے کہ اب یہاں وقت گزاری ہے خواہ جتنی کر لیں؛ عمل کا راستہ یہاں سراسر مفقود ہے۔ عمل کا راستہ یا تو پہلا ہے (جس کے ہم بھی مؤید ہیں؛ اور اصلاح و تبدیلی کے لیے کوئی اور راستہ اندریں حالات ہماری نظر میں نہیں ہے)، یا پھر وہ جسے ''راستہ'' کہنا ہی نہیں چاہئے کہ وہ 'عمل' سے بڑھ کر تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے، اور اس سے کسی اصلاح کی توقع رکھنا آخری درجے کی نادانی، یعنی ماردھاڑ، جس کا کچھ ذکر آگے آرہا ہے۔

مار دھاڑ اور اس کا جوابی بیانیہ.. انقلابی منہج کی فرسٹریشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

"انقلاب" اپنے رونما ہونے کی صورت میں بعض لوگوں کو "جمود" کی جانب دھکیلتا ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا۔ اور یہ جمود البتہ کچھ جذباتی نفوس میں فرسٹریشن اور بے چینی بھی پیدا کر دیتا ہے۔

یہاں پہنچیں.. تو ایک 'مار دھاڑ' کا بیانیہ آتا ہے اور ایک اس کا 'جوابی بیانیہ'۔ دونوں ایک دوسرے سے بھیانک۔ نیز ایک دوسرے سے باقاعدہ تقویت پانے والے۔

مار دھاڑ کا بیانیہ کہتا ہے: دیکھا سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کا نتیجہ! انگلی ٹیڑھی کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ آؤ ہمارے ساتھ، بندوق اٹھاؤ اور خون کا ایک کھیل شروع کرو۔

یہاں اس کا 'جوابی بیانیہ' آتا ہے: دیکھا 'انقلاب انقلاب' کرنے کا نتیجہ! یہ ساری خونریزی دراصل تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔ نہ تم 'اسلامی ریاست' یا 'اسلامی حکومت' کا نام لیتے اور نہ نوجوان اس کے لیے طاقت کے استعمال پر اترتے۔ جب تم پُراَمن طریقے سے اپنا یہ خواب پورا نہ کر سکے تو انہوں نے غیر پُراَمن طریقوں کا سہارا تو لینا ہی تھا (استدلال!!!) اصل قصور یہ خواب دکھانے والوں کا ہوا (ہو سکے تو مودودیؒ کو قبر سے جا کر پکڑو!) نہ یہ خواب تم دکھاتے اور نہ یہ نوجوان اس سے اگلا کوئی قدم اٹھاتے!

غرض انقلابی بیانیہ تھا: پُراَمن عوامی راستوں سے ایک اسلامی انقلاب برپا کرنا:

- 'مار دھاڑ بیانیہ' کا حملہ ہوا اس کے پہلے حصے پر، یعنی پرامن عوامی راستوں کے تصور پر اور وہ اس کی جگہ 'بندوق' لے آیا۔
- 'جوابی بیانیہ' کا حملہ ہوا اس کے دوسرے حصے پر، یعنی خود انقلاب ہی کے مقصد اور غرض وغایت پر۔ اس کا کہنا تھا، اصل فساد یہاں ہے۔ اور یہ اس کی جگہ 'مغربی ریاست' کو قبول کروانے کی فرضیت لے آیا۔ بلکہ جو شخص آج 'مغربی ریاست'

کو قبول نہ کرے اس کو قریب قریب گردن زدنی بھی قرار دینے لگا۔ (اپنی افتاد میں یہ 'جوابی بیانیہ' بھی اتنا ہی فاشسٹ ہے جتنا کہ وہ 'مار دھاڑ بیانیہ')۔

غرض ان دونوں بیانیوں کے نتیجے میں ہمارا امن بھی گیا (یہاں تک کہ ہمارے بہت سے مسلم ملکوں کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی) اور ہمارا اسلامی ریاست کا تصور بھی دریابُرد ہوا۔ خدانخواستہ ہم ملک سے بھی گئے اور اسلام کی عملداری سے بھی!

انقلابی منہج کو اگرچہ ہم اون own نہیں کرتے لیکن انقلابی منہج کے ساتھ یہ دونوں بیانیے مل کر جو ہاتھ کرنا چاہتے ہیں، بلکہ پورے اسلامی (روایتی) سیکٹر کا جو حشر کرنا چاہتے ہیں، اس پر تنبیہ البتہ ضروری ہے۔

'مار دھاڑ بیانیہ' پر ذرا آگے چل کر ہم بات کریں گے۔ البتہ 'جوابی بیانیہ' کی یہ موقع پرستی جو وہ "اسلامی ریاست" یا "اسلامی حکومت" کے تصور کو 'فساد کی اصل جڑ' قرار دینے کے لیے سامنے آتی ہے اور اس پر تمام عالمی فورمز کی تائید و نصرت کے مزے لوٹتی ہے... اس پر چند کلمات کہہ دینا ضروری ہے:

ان لوگوں کا بیانیہ یہ ہے کہ نہ آپ مغربی ریاست کو غلط کہتے اور اسلامی شریعت کی مکمل عملداری کی تحریک اٹھاتے اور نہ یہ نوجوان تمہارے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے خونیں راستوں کا رخ کرتے۔ ہم ان سے کہتے ہیں: بھائی تم ہمارے مغربی ریاست کو غلط کہنے سے جی بھر کر اختلاف کرو، واللہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے شریعتِ اسلامی کی مکمل عملداری کو فرض ٹھہرانے پر جیسے مرضی سوال اٹھاؤ۔ ہم اس پر تمہارے ساتھ بات کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں اس پر غلط کہو اور ہم تمہیں اس موضوع پر غلط گردانیں، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اور نہ افکار کی دنیا میں یہ کوئی انہونی چیز۔ لیکن ہمارے "اسلامی ریاست" یا "شریعت کی مکمل عملداری" کے اِس کیس کو تمہارا فساد کی جڑ اور خونریزی کا اصل موجب قرار دینا اگر تمہارے کسی کینہ (حِقدِ دفین) پر محمول نہ بھی کیا جائے تو اس کی سطحیت بہرحال اپنی مثال

آپ ہے۔ آؤ ہم تمہیں بتائیں، کیسے۔ بس یہی آئینہ ہم تمہارے سامنے رکھ دیتے ہیں:

چلو ریاست کے ''اسلامی'' ہونے کو تم فرض نہیں کہتے یا شاید درست بھی نہیں سمجھتے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن ریاست کے ''جمہوری'' ہونے کو تو فرض یا ضروری کہتے ہو؟ کسی بیرونی قبضے سے آزادی حاصل کرنے کی 'بات' کرنے کو تو حق جانتے ہو؟ تو کیا اگر کسی ملک میں کچھ جذباتی لوگ ''جمہوریت'' کے لیے ہتھیار اٹھالیں تو اُس خونریزی کی ذمہ داری آپ قبول کریں گے؟ کہیں مارشل لا کے خلاف کوئی 'الذولفقار' نکل آئے اور ملک بھر میں تخریب کاری کرتی پھرے، یا کہیں بادشاہت کے خلاف کوئی 'انقلابِ فرانس' اٹھ کھڑا ہو جو ہزاروں یا لاکھوں کی جان لے لے، یا بیرونی قبضے سے آزادی کے لیے کوئی سبھاش چندر بوس ہتھیار اٹھالے... تو اس پر آپ کو پکڑ لیا جائے؟ اس لیے کہ آپ 'مارشل لا' کو یا 'بادشاہت' کو یا 'بیرونی اقتدار' کو اصولاً مسترد کرتے ہیں اور اس کی جگہ پر ایک 'مقامی' یا 'جمہوری' حکومت کے قیام کو اصولاً ضروری گردانتے ہیں؟ اور کیا آپ کے اس بیانیے سے قاعدہ یہ اخذ کیا جائے کہ: دنیا میں جو بھی شخص کسی طرزِ ریاست کو مسترد کرے اور اس کی جگہ کسی دوسرے طرزِ ریاست کو لازم قرار دے... تو اگر اس کے مسترد کردہ نظام کو گرانے اور اس کے تجویز کردہ نظام کو قائم کرنے کا نعرہ لگا کر کسی وقت کوئی سرپھرا گروہ ہتھیار اٹھالیتا ہے (اور اِس راہ سے، دانستہ یا نادانستہ، خود اُس شخص کے کیس کو ہی تباہ و برباد بھی کر دیتا ہے) تو اس تمام خونریزی کا ذمہ دار بہرحال اُسی پہلے شخص کو قرار دیا جائے گا جس نے ایک نظام کو غلط اور اس کی جگہ کسی دوسرے نظام کو ضروری کہنے کی ایک پُرامن بات کر دی تھی؟ یعنی ایک سرپھرے گروہ کے ہاتھوں اِس بھلے مانس کا ایک پُرامن کیس لُوٹا بھی گیا اور اُس لُوٹنے والے کی سب غارت گری کی چٹی بھی اب یہی دے گا؟ وہ اُس سے بھی مار کھائے اور آپ سے بھی، اس لیے کہ اس نے کسی نظامِ موجودہ status quo کو غلط کہنے کا پاپ کر لیا تھا! اگر قاعدہ یہی ہے تو پھر صاف لفظوں میں یہ کیوں نہ کہا جائے کہ معاملہ دراصل کسی اسلامی یا غیر اسلامی ریاست کا سرے سے نہیں

ہے، بلکہ ایک سٹیٹس کو کے خلاف آواز اٹھانا ہی درحقیقت ''فساد'' کی بناڈالنا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ سٹیٹس کو اسلامی ہے یا جمہوری یا استبدادی یا بادشاہی یا مارشل لائی یا مغربی یا مشرقی یا جنوبی یا شمالی۔ سٹیٹس کو جیسا بھی ہے، اس پر ایمان لانا بجائے خود فرض ہے اور اس کو مسترد کرنا بجائے خود فساد! یعنی مطلق دینِ اکبری!

غرض اس سے بودا بیانیہ شاید نظریات کی تاریخ میں کبھی نہ پایا گیا ہو۔ بخدا، اگر عالمی سٹیٹس کو کی یہ ایک ناگزیر ضرورت نہ ہوتا اور اِس کی پزیرائی کرانے کو ایسی دیو ہیکل ابلاغی مشینری مسخر نہ ہوتی تو ایسا 'نکتہ' نکال لانے والے پر دنیا صرف ایک قہقہہ لگانے کی روادار ہوتی۔ مگر میڈیائی قوت کا کرشمہ ہے کہ ''اسلامی ریاست'' کے بیانیہ کے خلاف اب یہ ایک برہانِ قاطع ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں! بھائی اِس کا جواب فی الواقع نہیں!

یعنی آدمی چیختا رہ جائے کہ ایک طرزِ ریاست کو مسترد کرنے اور اس کی جگہ ایک دوسرے طرزِ ریاست کو قائم کرنے کی بات میں نے سو فیصد پُرامن بنیادوں پر کی تھی اور اس معاملہ میں تشدد میرے ہاں سو فیصد مذموم ہے، جس پر میری پوری تحریک اور میرے زبان و بیان کا ہر ہر انداز شاہد ہے... آزادیِ افکار کے چیمپئن عباقرہ کی جانب سے مگر اس کو ایک ہی جواب دیا جائے گا: افکار کی دنیا میں یہی تو اصل جرم ہے!

غرض اصول تو ہے یہی، البتہ لاگو یہ صرف ''اسلامی ریاست'' کی بات کرنے والوں پر ہو گا۔ دنیا میں تبدیلی کی یہ بس ایک ہی صدالائقِ قدغن ہے؛ باقیوں کے لیے یہ مکمل دورِ آزادی ہے!

*****

جہاں تک ماردھاڑ والے منہج کا تعلق ہے... تو انقلابی جماعتوں کا بلاشبہ کبھی اِس راہ سے سروکار نہیں رہا۔ نہ انہوں نے اپنے 'آئندہ کسی مرحلہ' کے طور پر ہی کبھی اِس منہج کی تبلیغ کی ہے۔ یہ بات حقیقتاً سراہنے کے لائق ہے، جس کی آج بھی قدر نہیں کی جا رہی۔ ان

(انقلابی) جماعتوں کی کل امید اور وابستگی عوامی عمل سے رہی ہے؛ اور زمانہ اِس پر شاہد۔ مایوس سے مایوس کن حالات بھی انہیں اس سے نہ ہٹا سکے۔ ان جماعتوں میں اپنے ملک کے لوگوں اور اداروں کے ساتھ امن پسندی و خیر خواہی کے رویے شروع سے لے کر آج تک ایک حقیقت ہیں۔ میڈیا کے ظالم ایک طرف پاکستان کی تاریخ کا خلاصہ کرتے ہوئے "مُلا مِلٹری الائنس" کی پھبتی کستے ہیں۔ دوسری طرف ان دینی جماعتوں پر ملک دشمنی کا ملبہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں (یہ ایک الگ بات کہ ملک کے اِن 'دردمندوں' میں سے بہت سوں کی اپنی تاریخ روس اور پھر اب بھارت اور امریکہ کی کاسہ لیسی سے عبارت ہے)۔ جہاں تک واقعہ ہے تو یہاں کی تقریباً سبھی اسلامی انقلابی جماعتیں ہر مشکل گھڑی میں ملکی اداروں کے ساتھ کھڑی نظر آئی ہیں خواہ وہ کسی بیرونی دشمن کے مقابلے پر ہو یا کسی قدرتی آفت یا کسی اندرونی بحران سے نمٹنے کے معاملے میں۔ اور یہ معاملہ آج تک برقرار ہے۔ اور اپنے لوگوں پر تو یہ سب جماعتیں ہمیشہ فدا ہوتی ہیں۔ اِن ملکوں کا کچھ نہ کچھ سنوارا گیا ہو گا تو اِنہی اسلامی جماعتوں کے دم سے؛ سیکولر پارٹیوں نے تو آج تک اجاڑا اور کھایا ہے۔ مشرقی پاکستان اور پھر کشمیر میں اِن کی قربانیاں تصور سے باہر ہیں۔ پچھلے کچھ عرصہ سے بہت سے مسلم ممالک میں رونما ہونے والے عسکریت پسند ڈسکورس کو بھی نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام بھر میں پائی جانے والی اسلامی انقلابی جماعتوں نے بلاشبہ رد ہی کیا ہے اور ان کے منہج کی کبھی تائید نہیں کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ انقلابی جماعتیں ان حالیہ عسکریت پسند رجحانات سے قطعی بریءالذمہ ٹھہرتی ہیں۔ رہی وہ فرسٹریشن frustration جو ایک بند راستے dead end پر ہونے کی وجہ سے انقلابی منہج پیدا کر کے دیتا ہے... اور جس سے یہ عسکریت پسند اپنے بیانیہ کو تقویت دینے کے لیے ایک موقع پاتے رہے ہیں تو یہ معاملہ سٹیٹس کو کو رد کرنے والی کسی بھی پُرامن سے پُرامن دعوت کے ساتھ پیش آسکتا ہے، جیسا کہ 'جوابی بیانیہ' کے رد میں پیچھے گزر چکا۔

پھر اگر 'فرسٹریشن' کی بات ہے... تو خود یہ عسکریت پسندی اپنی نہاد میں انقلابی منہج کی نسبت ایک کہیں زیادہ بند راستہ ہے۔[4] کئی ملکوں میں ڈھیروں نقصان کروا لینے کے بعد لوگوں

---

[4] **ایک اشکال:**

مسلم ملکوں کے اندر عسکریت پسندی militancy within the Muslim lands کو آپ نے ایک راستہ بند راستہ کیونکر کہا جبکہ ایک عسکریت پسند جماعت نے عراق کے اندر آپ کو حکومت حاصل کر کے دکھا دی۔ لہٰذا آپ اس کے نظریات سے جو بھی اختلاف رکھیں، اس کے راستے کو ایک بند راستہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

جواب:

ہم جو منہج آج تک تجویز کرتے آئے ہیں اس میں ہم **مسلمانوں کے اندرونی فرنٹ** (مانند مصر، الجزائر، پاکستان، سعودی عرب وغیرہ) **پر عسکریت کو مسترد کرتے ہیں**۔ البتہ وہ **مسلم ممالک** جہاں صیہونی یا صلیبی افواج حملہ آور ہیں یا جہاں غاصب ہندو اپنی افواج کے ساتھ اتر آیا ہے وہاں ہم قتال فی سبیل اللہ کو برحق نیز امت کے احیائے نو کے حق میں نہایت مؤثر جانتے ہیں۔ اب ظاہر ہے عراق بھی ان ملکوں میں تھا جہاں ملتِ صلیب اپنے لاؤلشکر سمیت آن اتری تھی۔ لہٰذا یہاں **ابتدائی طور پر** جو قتال ہوا وہ ہمارے تجویز کردہ منہج کے مطابق ہی ٹھہرتا ہے۔ یہی قتال جوان ہوتے ہوتے بالآخر اس بات کا سبب بنا کہ یہاں لڑنے والی جماعتوں میں سے ایک جماعت کی حکومت بھی قائم ہو جائے۔ ورنہ سوال یہ ہے کہ صدام کے زمانے میں کوئی جماعت ایسا کیوں نہ کر پائی؛ اور اس کے لیے بیرونی قبضہ کار کے ہاتھوں پیش آنے والی صورتحال ہی کیوں مساعد ہوئی؟ لہٰذا صلیبی یا صیہونی یا ہندو افواج کے مقابلے پر ہونے والا جہادی عمل ہماری نظر میں عمل پسند مسلمانوں کے لیے بلاشبہ کچھ غیر معمولی مواقع لے کر آتا ہے۔ پس عراق کی مثال تو ہماری بات کو غلط ٹھہرانے کے لیے دلیل نہ بنے گی۔ ہاں یہ ہماری ایک اور بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ چونکہ اس جماعت میں مصر، الجزائر، پاکستان وغیرہ ایسے اندرونی فرنٹ پر قتال کرنے کے نظریات ہی حاوی رہے تھے اس لیے عراق و شام میں بھی بہت سے

کو یہ بات سمجھ آئی کہ یہ عسکریت پسندی انہیں کسی بھی ہدف پر پہنچانے والی نہیں۔ (علاوہ اس بات کے کہ یہ اصولاً ایک بے حد غلط راستہ ہے)۔ تاہم 'فرسٹریشن' جس چیز کا نام ہے وہ کسی منطقی طرز فکر کو خاطر میں لانے کی گنجائش بہت کم چھوڑتی ہے اور ایک بار تو بہر حال نقصان کروانے کا موجب بنتی ہے۔ علاوہ اس بات کے — جو کہ اس معاملہ کا سب سے تشویشناک پہلو ہے — کہ انقلابی منہج کی عدم نتیجہ خیزی دیکھ کر تو چلیے آپ نے عسکریت پسندی میں اس کا 'متبادل' ڈھونڈنا چاہا البتہ جب ایک بھاری نقصان کروا لینے کے بعد عسکریت پسندی بھی آپ کا کوئی ہدف سر نہیں کروا پاتی تو 'متبادل' کہاں ڈھونڈا جائے گا؟ حق یہ ہے کہ وہ فرسٹریشن جو ایک ملک میں عسکریت پسندی کی تباہ کاریاں دیکھ لینے کے بعد پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک گھٹاٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے، معاشرے کی سطح پر تب جو آپ سے آپ ایک 'متبادل' سامنے آتا ہے وہ غامدیت یا وحید الدین خانیت یا مدخلیت / جامیت[5] نما آفتوں کا نزول ہوتا

مسلمان گروہوں کے ساتھ اس کا ایک اندرونی محاذ کھل گیا، جس سے معاملہ بہت زیادہ متنازعہ و دگرگوں ہو گیا۔ ورنہ اگر مسلمانوں کے ساتھ وہاں کوئی محاذ نہ کھولا جاتا تو بیرونی قبضہ کاروں کے مقابلے پر مسلمانوں کی اِس کامیابی کو، جو اِس آپس کی خونریزی سے بھی بچی ہوتی، ہم اُسی طرح ذکر کرتے جس طرح ملا عمر کے جہاد کو۔

[5] عرب دنیا کی دو شخصیات ربیع ہادی المدخلی اور محمد امان الجامی سے منسوب 'سٹیٹس کو' سے چمٹ رہنے اور اس کو ڈاڑھوں سے دبا رکھنے کی داعی ایک تحریک یا ایک ذہنیت۔ عرب دنیا کے لیے اس کے پاس کیسے شگوفے ہیں اس کا اندازہ کرانا تو شاید اس مختصر مقام پر مشکل ہو، البتہ برصغیر کی جانب اس کے جن ناقابل ذکر داعیوں کا رخ ہوا ہے وہ یہاں کی تبلیغی جماعت تک سے راضی نظر نہ آئیں گے اور جماعتِ اسلامی، تنظیم اسلامی اور جماعۃ الدعوۃ وغیرہ تو صاف صاف ان کے کاغذوں میں 'خوارج' قرار پاتے ہیں، کیونکہ یہ اپنے اپنے ملک کے 'ولی الامر' کی بیعتِ شرعی میں نہیں! یہاں تک کہ نجانے کن بنیادوں پر ذاکر نائیک ایسے داعیوں کو مفسدین میں گنتے ہیں!

ہے، جس کا حملہ وہاں کے مذہبی اذہان پر ہوتا ہے، اور جو کہ عام لوگوں کی سطح پر معاشرے کو لبرلائز کر دینے کے لیے ایک پل کا کام دیتا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے اور براہِ کرم اس کو خصوصی طور پر نوٹ کیا جائے کہ:

جب تک انقلابی جماعتوں کی اپیل عروج پر رہی تب تک یہاں کے دین پسند پڑھے لکھوں میں المورد و وحید الدین ایسی آوازوں کا یوں غلغلہ نہیں ہوا تھا بلکہ تقریباً کوئی اِنہیں نہ پوچھتا تھا۔ حالانکہ یہ منحنی آوازیں پہلے بھی یہاں موجود ہی رہی تھیں؛ آج یکدم بہر حال نہیں آ گئیں (مقبول یکدم اب ہوئی ہیں)۔ لیکن اب جب انقلابی ڈسکورس کسی حد تک پس منظر میں چلا گیا اور عسکریت پسندی کا آہنگ اس کی نسبت بلند ہوا تو یکلخت یہاں المورد وغیرہ کا بھی طوطی بولنے لگا۔ بلکہ فی الوقت آپ کو دو ہی 'بیانیے' میدان میں نظر آتے ہیں: یا مار دھاڑ یا غامدیت۔ (موخر الذکر، لبرلزم کی راہ ہموار کرنے کا ایک اسلامی فکری اوزار)۔ ہماری نظر میں المورد وأخواتها کی یہ غیر معمولی پزیرائی اِسی عسکریت پسندی کی مرہونِ منت ہے جس نے ان کو مقبولیت کے کچھ غیر طبعی مواقع دے ڈالے۔ آخر کیسے ہو سکتا تھا لبرل ایجنڈا کے زیر تحریک کام کرنے والے چینل یہ موقع ہاتھ سے جانے دیتے اور ملکی تاریخ کے اِس عظیم خلا کے موقع پر ایسے 'اصل اسلام' بیان کرنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ نہ لیتے! المورد کی دریافت پر کوئی ان لبرلز کا خوشی سے چہکنا دیکھے! تاریخ انسانی میں پنسلین کی دریافت بھی شاید ہی اتنی 'بروقت' کہی جا سکتی ہو جتنی کہ عالمِ اسلام کی تشکیلِ نو کا تاریخی پراجیکٹ لانچ کرتے وقت 'المورد' کی دریافت! آپ خود تصور کر لیں آج کی اِس دنیا میں المورد نہ ہوتا تو لبرل ایجنڈا کو مطلوب 'اسلامی' دلیلوں کا بندوبست کہاں سے ہوتا!

کلاسیکل منہج پر رہنا آپ کو اِس پورے گنجلک سے کفایت کرتا۔ واللہ الموفق

معاشرے کو 'اوپر سے' ٹھیک کرنا تھا یا 'نیچے سے'؟!

مدیر ایقاظ

تنقیحات

پاکستان میں کرپشن کی حالیہ صورتحال کے حوالے سے ہونے والی ایک بحث میں، کسی ٹی وی چینل پر، اینکر کاشف عباسی کے ایک پریشان کر دینے والے سوال پر کہیں سے جواب آیا: معاشرے کو اوپر سے ٹھیک تھوڑی کیا جا سکتا ہے؛ یہ تو نیچے سے ٹھیک کیا جائے تو ہو گا۔ جس پر جناب اوریا مقبول جان نے برمحل سوال اٹھایا: دنیا میں مجھے کوئی ایک معاشرہ دکھایا جائے جو نیچے سے ٹھیک ہوا یا بدلا گیا ہو۔ اس پر خورشید ندیم صاحب نے بغیر توقف جواب دیا: جی میں آپ کو مثال دیتا ہوں: رسول اللہ ﷺ کا معاشرہ!

ہمارا زیر نظر مضمون (مطالعۂ تاریخ، شمارہ فروری 2015ء) لکھا تو کسی اور سیاق میں گیا تھا۔ لیکن اسکا ایک حصہ چونکہ ہمارے اِس موضوع سے بھی متعلق ہے، لہٰذا اُس کے کچھ حصے چند تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

متعدد بار ہم یہ مبحث بیان کر آئے ہیں کہ "یا" کا مفروضہ بہت مقامات پر ذہنوں میں غیر ضروری و غیر منطقی طور پر جگہ پا لیتا ہے، یعنی دو چیزوں کے مابین خوامخواہ کی مغایرت:

جس کی رُو سے ایک کو اختیار کرنا ہو گا اور دوسری کو رد! حالانکہ وہ دونوں بآسانی جمع ہو سکتی تھیں! بلکہ جمع ہی ہونی چاہئیں؛ تبھی ان سے معاملہ کی ایک پوری تصویر بنتی۔ لیکن یہاں ایک موضوع پر باقاعدہ دو فریق ہو کر ہم آپس میں مصروفِ بحث ہو جاتے ہیں۔ یوں ایک ''لاشے ء'' سے پورا ایک جدل dialect کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ 'سکول آف تھاٹ' آجاتے ہیں! فارغ قوموں میں ایسے مشغلے بکثرت رہتے ہیں۔

اب مثلاً:

- یہ ڈائیلیکٹ کہ مغرب کو اسلام کی تبلیغ کی جائے یا مغرب کے ساتھ لڑائی ہی کی جائے؟ بھئی یہ دونوں کیوں نہیں ہو سکتیں (بشرطِ استطاعت)؟ اُدھر لاتوں کے بھوت بھی کم نہیں اور باتوں کو نہایت خوب سمجھنے والے بھی تھوڑے نہیں۔ اِدھر ہمارے ہاں انٹیلیکچوَل صلاحیتوں کے مالک صالحین بھی اللہ کے فضل سے ہیں، اور ایسے بھلے لوگ بھی جو اسلام کے لیے صرف سپاہیانہ خدمت انجام دے سکتے ہیں کوئی انٹیلیکچوَل معرکہ نہیں مار سکتے۔ پس ہر دو طرف یہ ایک ''تنوع'' کا سوال ہوا نہ کہ ''معارضت'' کا۔ اُن کے غاصب اور مائل بہ شدت طبقوں کے ساتھ شدت اور عام عوام نیز انٹیلیکچوَلز کے ساتھ گفت وشنید، ان دونوں میں آخر کیا تعارض ہے؟ جو جس کا اہل ہو اس کے ساتھ وہی معاملہ، اس میں مسئلہ کیا ہے؟ کیا نبی ﷺ نے قتال شروع ہو جانے کے بعد دعوت اور حسنِ سلوک کا معاملہ موقوف کر دیا تھا؟ یہ دونوں اپنے اپنے محل پر بیک وقت کیوں نہیں چل سکتے، بعد اس کے کہ قتال دین میں مشروع ہو چکا ہو؟ یعنی دو خوب چیزوں میں خوامخواہ کا ایک ٹکراؤ فرض کر لینا، اور پھر ایک کے ''پرو'' اور ایک کے ''اینٹی'' ہو کر 'دلائل و براہین' کا ایک سلسلہ شروع کر لینا!

○ ہمارا قومی مسئلہ آیا انتظامی ہے؟ سیاسی ہے؟ معاشی ہے؟ سماجی ہے؟ فکری ہے؟ تعلیمی ہے؟ یا سائنسی و ٹیکنالوجی پسماندگی ہے؟ یہاں اس پر آپ 'بحثیں' تک سنیں گے! بھئی یہ سارے مسئلے بیک وقت کیوں نہیں ہو سکتے؟ ان سب کی اصلاح کے لیے مختص ٹیمیں میدان میں اتریں اور اپنے اپنے میدان میں اصلاحِ احوال پر زور لگا دیں جس سے مجموعی طور پر اِس امت کا ستارہ بلند ہو، اس میں کیا مانع ہے؟ لیکن نہیں، طے یہ ہونا چاہئے کہ ان میں سے کونسا مسئلہ ہمارا قومی مسئلہ ہے!

○ معاشرے کو ٹھیک کرنا ہے... تو کیا اوپر سے کیا جائے گا؟ نہیں نہیں، اوپر سے کیسے، نیچے سے کیا جائے گا! ایک سکول آف تھاٹ، دوسرا اسکول آف تھاٹ!

○ علیٰ ھذا القیاس۔

ہمارا ایک قومی مسئلہ یہ بھی ہے کہ: جو کوئی مسئلہ سرے سے نہیں ہوتا، ہم اس کو ایک مسئلہ بنانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور پھر اس میں الجھ کر اپنے اصل مسئلوں سے توجہ پھیر لینے میں اس سے بھی زیادہ کامیاب!

فارغ مباش کچھ کیا کر!

*****

چنانچہ ایسا ہی ایک غیر منطقی و غیر ضروری ڈائلیکٹ یہ ہے۔ یعنی معاشرے کو اوپر سے ٹھیک کرنا "یا" نیچے سے ٹھیک کرنا؟ حالانکہ معاشرہ نہ محض نیچے سے ٹھیک کرنے ٹھیک ہوتا ہے اور نہ محض اوپر سے ٹھیک کرنے سے۔ معاشرے کو ٹھیک کرنے کی یہ دونوں جہتیں بیک وقت حسب استطاعت فرض ہیں۔ ان میں تعارض ہے ہی نہیں۔ بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرنے والی ہیں، اور ان دونوں کا "تکامل" ہی اصل میں امت سے مطلوب۔ رہا یہ جدل کہ یہ "یا" یہ؟ تو ہماری نظر میں، یہ جدل صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں

جو معاشرے کی اصلاح کے لیے کوئی اسکیم اپنے پاس نہیں رکھتے۔ کچھ حرج نہیں اگر بعض لوگوں کی صلاحیتیں ایسی کوئی اسکیم پیش کرنے یا اس پر سرگرم ہونے کی متحمل نہ ہوں اور وہ اپنی مصروفیت کے لیے کوئی عام سی سرگرمی اختیار کرلیں۔ شاید ہم میں سے اکثر کا معاملہ ایسا ہی ہو۔ لیکن اصلاح کی ایک بڑی جہت کی نفی کر دینا؟ 'اوپر سے ٹھیک کرنے کی کیا ضرورت ہے'؟ یا 'نیچے سے ٹھیک کرتے بعض طبقوں کی جدوجہد یہاں کیسی غیر ضروری ہے'... یہ چیز البتہ ہم ایسے ان لوگوں کے لیے بھی نامناسب ہے جو قوم کی اصلاح کے لیے خود اپنے پاس کوئی چیز نہیں رکھتے۔

پھر سب سے بڑھ کر غلط یہ ہے کہ ایسا کوئی سوال رسول اللہ ﷺ کے برپا کیے ہوئے عمل کی بابت اٹھا دیا جائے۔ حالانکہ اصلاح کی تمام صالح متنوع جہتیں رسول اللہ ﷺ کے انجام دیے ہوئے اِس عمل میں بیک وقت کارفرما رہی تھیں۔

*****

پس واضح رہے، ہماری گفتگو اِس 'جدل' کو سرے سے قبول نہیں کرتی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ہماری کسی بات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم معاشرے کو 'نیچے سے' ٹھیک کرنے کے تصور کو رد کرتے یا رسول اللہ ﷺ کے برپا کیے ہوئے عمل میں اس بات کا انکار کرتے ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے، یہ ایک ہمہ جہت عمل تھا اور اصلاح کا کوئی رخ اس کے اندر نظر انداز نہ ہوا تھا۔ ہماری نقد یہاں اس طرزِ فکر پر ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اِس عمل کو 'معاشرے کو نیچے سے ٹھیک کرنے' کے اندر محصور ٹھہراتا ہے۔

*****

اور اب ہمارا وہ مضمون جس کی بابت ہم نے کہا، وہ براہِ راست اِس موضوع پر تو نہیں لکھا گیا، لیکن اِس موضوع کو سمجھنے کے لیے وہ کچھ بنیاد ضرور فراہم کرتا ہے۔

*****

کچھ ابتدائی گفتگو ہمیں توسیعِ اسلام میں پائی جانے والی ''تیز رفتاری'' پر کرنی ہے؛ کیونکہ تاریخ اسلام کے مطالعہ کے دوران جو کچھ بڑے بڑے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، وہ تاریخِ دعوت کے اِس بنیادی مبحث کو نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہوتے اور پھر جابجا ہمارا راستہ روکتے ہیں۔ لہٰذا کچھ حرج نہیں، اِس موضوع پر ابتدا میں ہی کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے رحلت فرماتے ہی جزیرۂ عرب میں ارتداد کا ایک بہت بڑا سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ کسی ایک آدھ علاقے یا ایک آدھ قبیلے تک محدود نہ تھا بلکہ پورا جزیرہ اس کی لپیٹ میں آ گیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے، مدینہ، مکہ، طائف اور بحرین کی ایک بستی جواثا کو چھوڑ کر؛ کوئی علاقہ جزیرۂ عرب میں ایسا نہ رہا جو فتنۂ ارتداد کی زد میں آنے سے بچا رہا ہو۔ بعض نے یہاں تک کہا کہ نماز (باجماعت) صرف تین مساجد تک رہ گئی تھی: حرمین شریفین اور علاء بن الحضرمی کی مسجد بحرین میں۔ بقول ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا: تُوُفِّيَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ , فَنَزَلَ بِأَبِي بَكْرٍ مَا لَوْ نَزَلَ بِالْجِبَالِ لَهَاضَهَا, اشْرَأَبَّ النِّفَاقُ بِالْمَدِينَةِ , وَارْتَدَّتِ الْعَرَبُ (مصنف ابن ابی شیبۃ، روایت نمبر 37055 http://goo.gl/wYmhA2)۔ یعنی ''نبی ﷺ نے رحلت فرمائی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ پر ایسی افتاد آئی کہ وہ پہاڑوں پر آئی ہوتی تو ان کو توڑ کر رکھ دیتی۔ مدینہ میں نفاق نے سر اٹھا لیا اور عرب تو مرتد ہی ہو گیا''۔ سمجھو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک نئے سرے سے جزیرۂ عرب اسلام کو فتح کر کے دیا؛ اور اس مقصد کے لیے پورے جزیرۂ عرب میں از سر نو ایک جہاد ہوا... باوجودیکہ نبی ﷺ کی زندگی سارا جزیرۂ عرب اسلام کے زیر نگیں آ گیا ہوا تھا۔

(ظاہر ہے یہ صالح اقتدار کی طاقت سے زیر نگیں لائے گئے ایک معاشرے کا ہی حال ہو سکتا ہے۔ اور اگر آپ کہنا چاہیں تو اوپر سے قابو کیا گیا ایک معاشرہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک مشہور قول کہ لَمَا يَزَعُ السُّلْطَانُ النَّاسَ أَشَدُّ مِمَّا يَزَعُهُمُ الْقُرْآنُ (تاریخ المدینۃ

لابن أبي شبة، ج 3 ص 988 یعنی "اقتدار لوگوں کو قرآن سے بھی بڑھ کر زیرِ اطاعت لے آتا ہے"۔ یقیناً نبی ﷺ کی تحریک میں اِس سماجی حقیقت کو بدرجۂ اتم بروئے کار لایا گیا تھا۔ بے بسی کی بات اور ہے، لیکن اس بات کو نظریاتی طور پر ہی نظرانداز کروانے کی فکر رائج کروانا کہ صاحب اصلاح تو بس نیچے سے ہوتی ہے، باعثِ حیرت ہے۔ اوریا مقبول صاحب کا یہ سوال پس نہایت برمحل ہے کہ مجھے کوئی ایک معاشرہ دکھایا جائے جو بس نیچے سے بدل دیا گیا تھا)۔

اس غیر معمولی اتدادِ عرب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ کی رحلت کے وقت جزیرۂ عرب کس مقام پر کھڑا تھا۔ عربوں کی ایک بڑی تعداد اُس حالت پر تھی جس کا سورۃ الحجرات میں ذکر ہوا: قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی بہت سے لوگ اسلام چھوڑ گئے۔ بہت سے اسلام پر رہے تو بھی اسلام کی اُس حالت پر نہیں جو اسلام کا مقصود تھا؛ اور جس پر صحابہؓ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد عرب زندگی کو ازسرنو بحال کرایا۔

*****

یہاں ہم اس سوال پر غور کرتے چلیں گے کہ جزیرۂ عرب میں اتنی تعداد کا اسلام سے پلٹ جانا، یا کم از کم اصل اسلام سے پلٹ جانا، اسلامی توسیع میں پائی جانے والی ایک غیر معمولی "تیز رفتاری" کے حوالے سے ہمارے لیے کیا دلالت رکھتا ہے؟ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری سالوں میں جو عمل ایک غیر معمولی تیزی کے ساتھ انجام پایا، اُسے ہم اِس واقعہ ارتداد کی روشنی میں کیونکر سمجھیں گے؟

ظاہر ہے، ایک یوٹوپیا ذہنیت یہاں یہ سوال اٹھا سکتی ہے کہ یہ توسیعِ اسلام اگر اِس تیز ترین صورت میں نہ ہوتی؛ یعنی اِس "توسیعی عمل" کو "تربیتی عمل" کے پیچھے پیچھے رکھا

جاتا؛ جب تک ایک علاقے میں لوگوں کی خوب تربیت نہ کرلی جاتی تب تک کوئی نیا علاقہ فتح کرنے کے لیے آگے نہ بڑھا جاتا، تو ایسی خطرناک صورتحال کے یکلخت سامنے آجانے کی نوبت ہی نہ آتی! جبکہ یہاں تو معاملہ ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا! ایسا خطرناک رِسک !risk

ادھر توسیعِ اسلام کی یہ تیز رفتاری ملاحظہ فرمائیے: ثقیف کے لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھی کہ ان کو جہاد اور زکات سے چھوٹ دے دی جائے، تو نبی ﷺ کی طرف سے ان کی یہ شرط قبول کرلی گئی، البتہ فرمایا: یہ اسلام قبول کرلیں، تو زکات بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (سنن ابو داود 3025، صححہ الالبانی)۔ چھوٹ دینے کے ایسے ہی کچھ مزید واقعات بھی ہمیں حدیث وسیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

اِس توسیعِ اسلام میں پس ایک "برق رفتاری" اور معاشرے کو مجموعی طور پر ہی اسلام کے زیرِ نگیں لے آنا، اور بقیہ اشیاء اقتدار کے زیر تاثیر ان کے نفوس میں اتارنے 'وقت' اور 'ماحول' کے فیکٹر کے لیے رکھ دینا ایک حکمت عملی کے طور پر یقیناً نظر آتی ہے۔ پھر 'وقت' اور 'ماحول' کے اِس فیکٹر نے، جو ظاہر ہے "اقتدار" پر ہی بنا کرتا تھا، اپنے حصے کا کام کرکے دکھا بھی دیا۔

یوٹوپیا ذہن میں یہاں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ شروع سالوں میں کوالٹی quality پر جو زور رہا وہ آخری سالوں میں کوانٹٹی quantity پر کیوں چلا گیا؟!

یقیناً اللہ کے رسول ﷺ نے جو کیا وہ وحی کی راہنمائی میں کیا۔ لہٰذا اس پر ہمیں معاذاللہ کوئی سوال نہیں اٹھانا؛ صرف اِس واقعہ کے پیچھے کار فرما حکمتیں تلاش کرنی ہیں۔

حدیبیہ، جسے قرآن مجید میں "فتحِ مبین" کہا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی تحریکی مساعی اور توسیع اسلام میں ایک یکسر نیا موڑ turning point گنا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی نظر جزیرۂ عرب سے گزر کر روم اور فارس پر جا ٹکی تھی؛ اور وہ بھی

اِس پہلو سے کہ یہ وقت کی سپر طاقتیں تھیں۔ بے شک پورا جزیرۂ عرب ابھی مفتوح ہونے سے پڑا تھا؛ مگر اسلامی قلمرو کو ایک عظیم ایمپائر میں ڈھال دینے کے خدوخال رسول اللہ ﷺ کی اپنی پیش قدمی میں دن بدن نمایاں ہونے لگے تھے۔ پچھلی تمام رسالتوں کے برعکس؛ یہ ایک عالمی رسالت ہے اور اس کو بوجوہ پچھلی امتوں سے مختلف ہونا؛ اور جلد از جلد ایک عالمی فنامنا global phenomenon کے طور پر سامنے آنا تھا۔ لہٰذا؛ اسے کم از کم بھی روم اور فارس کی ٹکر کی ایک قوت کے طور پر پیش کر جانا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے آخری سالوں کی حکمت عملی میں خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔

یوں بھی؛ اگر ہم پر وہ "سطح" واضح ہے جو اسلام کو انسانی زندگی میں روپزیر کرانے کے لیے مطلوب ہے... تو یہ "کوالٹی" ایک مخصوص "کوانٹٹی" کو پہنچے بغیر روپزیر ہی نہیں ہوتی۔ یہ اسلام اگر محض کچھ 'انفرادی اعمال' کا نام ہے پھر تو یوٹوپیا حضرات کی بات میں ضرور کچھ وزن ہے کہ کیوں نہ ایک علاقے کے لوگوں پر پوری محنت کر لینے کے بعد ہی ایک نئے علاقے کو ہاتھ لگایا جائے؛ اگرچہ یہ محنت کتنا ہی وقت لے؛ آخر جلدی کس بات کی! لیکن اگر اسلام کچھ 'انفرادی اعمال' سے بڑی ایک حقیقت ہے... تو جب تک وہ اپنے اردگرد شرک کی بعض بڑی بڑی ایمپائرز کو تہ خاک نہ کر دے اور زندگی کا دھارا ایک بہت بڑی سطح پر خدائے واحد کی اطاعت کے رخ پر پھیر نہ دے تب تک 'افراد' کا خدا کی اطاعت کر لینا بھی وہ معنیٰ اور تاثیر نہیں رکھتا جو اِس دین اور اِس رسالت کو ان کی "عبادت" سے مطلوب ہے۔ تب تلک 'افراد' کا خدا کی عبادت کرنا بھی ایک بہت ہی نحیف و لاغر مفہوم رکھے گا۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اِس دین کو جس مفہوم اور جس مزاج پر چھوڑ جائیں گے وہی قیامت تک اِس دین کا صحیح مفہوم اور صحیح مزاج باور ہوتا رہے گا۔

لہٰذا ایک عزت اور تمکنت رکھنے والا اسلام جو اپنے آس پاس شرک کی کسی ایمپائر کو برداشت نہیں کرتا، جو زندگی کے پورے دھارے کو خدا کی عبادت اور اطاعت میں دینے

پر یقین رکھتا ہے، اور جو خدا کی عبادت اور اطاعت پر قائم خود ایک بہت بڑی ایمپائر ہے، جس کی نظر مشرق تا مغرب زمین کے ہر افق پر ہے... ایک ایسا عزت اور تمکنت رکھنے والا اسلام اپنے پیچھے چھوڑ کر جانا بجائے خود ایک ''کوالٹی'' کا مسئلہ تھا نہ کہ 'کوانٹٹی' کا۔

*****

اس مسئلہ پر تفصیلی بات ہم کسی اور مقام پر کریں گے.. رسول اللہ ﷺ کے دعوتی عمل میں ہمیں ایک نُخبہ (ایلیٹelite) اور عوام (public) کے مابین فرق کرنا بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ مہاجرین و انصار ایک چنیدہ جمعیت تھی، یعنی ایلیٹ۔ (نُخبَة)۔ یہ جزیرۂ عرب میں اسلام کا پرچم اٹھا کر کھڑی ہوئی جماعت تھی۔ اِن کی تربیت میں البتہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا گیا تھا۔ اِن کے لیے معیار بھی بے حد سخت تھے۔ اِن پر آپ ﷺ کا مان بھی بہت تھا۔ آخری سالوں میں جو برق رفتار توسیع ہونے لگی تھی وہ بھی یوں بے قاعدہ نہ ہو رہی تھی۔ وہ توسیع بھی بہت حساب رکھ کر ہو رہی تھی۔ یہ برق رفتار توسیع اس نسبت تناسب سے تھی کہ اس کے بگڑے سے بگڑے حالات کو بھی ''مہاجرین و انصار'' کی وہ ایلیٹ ان شاءاللہ سنبھال ضرور لے گی۔

ایک حدیث میں تو عامۃ الناس کو ''اعراب المسلمین'' کی ایک کیٹگری کے طور پر لینے کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے:

وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ – أَوْ خِلَالٍ – فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ، سفَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ، وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَتَحَوَّلُوا مِنْهَا، فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ، يَجْرِي عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللهِ الَّذِي يَجْرِي عَلَى الْمُؤْمِنِينَ، وَلَا

يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ، فَإِنْ هُمْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَقَاتِلْهُمْ (صحيح مسلم، عن بريدة رضي الله عنه، رقم الحديث 1731)

اور جب مشرک دشمنوں سے تمہارا آمنا سامنا ہو، تو ان کے سامنے تین باتیں رکھو، ان میں سے وہ جس کو بھی مان لیں تم ان سے وہی قبول کر لو، اور ان پر ہاتھ اٹھانے سے باز رہو۔ تم ان کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ اگر وہ اسے قبول کرنا مان لیں، تو تم ان سے یہ قبول کر لو اور ان پر ہاتھ اٹھانے سے گریز کرو۔ پھر ان کو اس بات کی طرف بلاؤ کہ وہ اپنی سرزمین چھوڑ کر سرزمینِ ہجرت کی طرف نقل مکانی کر آئیں۔ اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کر لیں تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہوتے ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر عائد ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی سرزمین سے نقل مکان ہو جانے سے انکاری ہوں تو ان کو بتاؤ کہ تب ان کا معاملہ اَعراب المسلمین والا ہو گا، ان پر اللہ کا وہی حکم لاگو ہو گا جو (عام) مومنوں پر لاگو ہوتا ہے، ان کو غنیمت اور فےء میں سے کچھ نہ ملے گا الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والے ہوں۔ اگر وہ اس (پہلی بات) کو قبول نہ کریں تو ان سے جزیہ طلب کرو۔ اگر وہ تمہاری یہ بات قبول کر لیں تو تم ان سے یہ قبول کر لو اور ان سے ہاتھ روک رکھو۔ ہاں اگر وہ اس سے بھی انکاری ہوں تو اللہ سے مدد مانگتے ہوئے ان کے ساتھ عازمِ قتال ہو جاؤ۔

پس یہاں "مہاجرین"[1] ایک کیٹگری ہے جو جہاد کرتی اور باطل کے قلعے لرزاتی ہے۔

---

[1] صرف "مہاجرین" کا ذکر اس لیے ہوا کہ "انصار" دارالہجرت کے مقامی لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ عام لوگوں کو دعوت "مہاجرین" میں شامل ہونے کی ہی دی جا سکتی تھی۔ البتہ یہ کیٹگری ایک ہے، ان دونوں کا ایک ساتھ ذکر سورۃ الحشر میں بھی آیا ہے اور سورۃ التوبۃ میں بھی۔

غنیمت اور فےء کے اموال پر صرف انہی کا حق ہے۔ معاشرے کی قیادت اِسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور دوسری "اعراب المسلمین" کی کیٹگری ہے جن پر اسلام کے عمومی احکام لاگو ہوتے ہیں۔ یہ وہ کیٹگری ہے جو "ہجرت" اور "جہاد" تک نہیں جاتی، مگر ہے مسلمان۔[2] ایک بڑی تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحجرات میں "اعراب المسلمین" کو "اپ گریڈ" ہونے یعنی حقیقی ایمان کی راہ بھی دکھائی گئی؛ کہ اسلام کا اصل معیار بس یہی ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

> حقیقی مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر، پھر کسی شک شبہے میں نہ پڑے، اور جہاد کرنے لگے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہ ہیں (ایمان کے) سچے۔

ہاں ان اعراب میں سے جو چنیدہ لوگ مہاجرین و انصار میں جاملنا قبول کرلیتے، وہ اس فکری، نظریاتی، تہذیبی، ایمانی ایلیٹ میں شامل ہو جاتے جو عام معاشرے کے لیے ائمہ کی حیثیت رکھتی۔ ایک شدید محنت کے نتیجے میں، ہر مفتوحہ علاقے سے اعلیٰ ترین دانے اس ایلیٹ میں شامل کرلیے جاتے جو پھر ہمہ وقت رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہتے؛ جہاں ایک مسلسل عمل کی صورت یہ ہیرے تراشے جاتے؛ اور آخر یہ اپنی اپنی قوم کے لیے تعلیم

---

[2] اِس "اَعراب المسلمین" کو، جن کا کچھ ذکر سورۃ الحجرات کے آخر میں بھی ہے، "منافقین" کے ساتھ خلط کرنا درست نہیں۔ منافقین تو وہ لوگ تھے جو باطن میں کفر کی روش پر اور درپردہ کفار کے ساتھی تھے؛ محض ایمان کا لبادہ اوڑھ رکھے ہوئے تھے۔ جبکہ یہ اَعراب لوگ وہ تھے جو اسلام میں نووارد تھے؛ بہت سے سماجی عوامل کے زیر تاثیر اسلام میں داخل ہوگئے تھے، البتہ اسلام کی حقیقت میں ابھی گہرے اتر پائے تھے اور نہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سطح کو پہنچے تھے۔

اور اسوہ کا ذریعہ بنتے؛ اور گھپ اندھیرے میں مشعل کا کام دینے لگتے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبة:122)

کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے، جو دین کی سمجھ حاصل کریں، اور واپس آکر اپنی قوم کو خبر دار کریں تا کہ وہ بھی ڈرنے لگیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور خلفاء کے ہاتھوں انجام پانے والا اسلامی عمل:

- ایک جانب تیز رفتار بھی اتنا ہے کہ بادیٔ النظر اس میں بہت بڑے بڑے رِسک risk لیے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر یہاں تک دکھائی دیتا ہے گویا ہر حال میں ''توسیع'' کرنا مطلوب ہے! مگر جیسا کہ ہم نے پیچھے کہا، یہ بھی باقاعدہ مطلوب ہے اگرچہ یوٹوپیا ذہن کو یہ کچھ اوپرا ہی لگے۔ اسلام کے اپنی حقیقت اور مزاج کو برقرار رکھنے کے حق میں یہ چیز بھی مطلوب ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے، ''عوام الناس'' کے آگے ابتداءً اسلام کے کچھ موٹے موٹے ہی تقاضے رکھے جائیں؛ تا کہ معاشرے کی زیادہ سے زیادہ زمین ایک بار اسلام کے ہاتھ میں آجائے اور اسلام خاصی مستحکم پوزیشن میں آکر، پوری تمکنت اور مقدرت کے ساتھ ان کے ذہنی سانچوں اور ان کی زندگی کے معیارات کی تشکیل کرے؛ اور ان کے لیے سماجی رجحانات کی تخلیق کرے۔

- دوسری جانب یہ نہایت گہرا اور بلند و بالا چوٹیاں سر کرنے والا ایک عمل ہے۔ ایک ایسی جمعیت جس کی سیرت اور کردار رشکِ خلائق ہوتی ہے اور جو کہ وسیع تر معاشرے کے حق میں ایک ایسے اسوہ اور نمونہ کی صورت پیش کرتی ہے؛ کہ تھوڑے ہی وقت کے اندر یہ ان معاشروں کی بھی کایا پلٹ کر رکھ

دیتی ہے۔

﴿ تیسری جانب، یہ تقسیم فطری اس قدر ہے کہ:

⇐ نہ انسانی کمزوریوں کو یہاں ایک لحظہ نظر انداز کیا گیا ہوتا ہے۔ اور

⇐ نہ انسانی صلاحیتوں کو ایک ذرہ ضائع ہونے دیا گیا ہوتا ہے۔

⇐ معاشروں کو سر تا پیر بدل جانے کے لیے طبعی انداز میں جو ایک وقت درکار ہوتا ہے وہ بھی یہاں دے دیا جاتا ہے، اور

⇐ معاشرے کو لے کر چلنے اور اس میں تبدیلی برپا کرنے والوں کی تولید reproduction میں بھی کوئی ڈھیل نہیں برتی جاتی۔

یہ دونوں کام بیک وقت انجام پاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو پہلے اور دوسرے کو بعد میں انجام دینے سے؛ کوئی ایک بھی انجام نہیں پاتا!

ہاں "بنیادی جمعیت" کی تیاری البتہ ابتداء میں کچھ وقت لگا کر، پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ کرنا ہوتی ہے۔ یہ کام ہم دیکھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے ابتدائی سالوں میں پوری محنت، توجہ اور وقت صرف کر کے انجام دیا۔ جن لوگوں کو ابتدائی سالوں اور اختتامی سالوں کے مابین یہ فرق اس طرح نظر آتا ہے گویا توجہ کا محور "کوالٹی" سے "کوانٹٹی" پر شفٹ کر گیا... ان کی نظر سے اقامتِ دین کی یہ بنیادی حقیقت ہی دراصل اوجھل ہے۔ ابتدائی سالوں میں "بنیادی جمعیت" کی تیاری عمل میں لائی جا رہی تھی۔ بعد کے سالوں میں یہ بنیادی جمعیت میدان میں اتر آئی اور اس کے ذریعے معاشرے کو ہاتھ میں لینے کا عمل شروع ہو گیا تھا؛ لہٰذا وہ خدشے اب غیر ضروری ٹھہرے جو ابتداء میں لازماً مدنظر ہوتے ہیں؛ اور جو کہ بعد میں بھی "عَلم تھام رکھنے والوں" کے حق میں مدنظر ہی رکھے جاتے ہیں۔ اِس "بنیادی جمعیت" نے بعد ازاں کیسے کیسے کارنامے سر انجام دیے، یہاں تک کہ کچھ غیر معمولی بحرانوں کے وقت کیسی کیسی قربانیاں اور کیسے کیسے

"کومپرومائز" compromise کر کے اسلامی عمل کی حفاظت کی اور انسانی بستیوں کو خدائے واحد کی عبادت کے بندھن میں باندھ کر رکھا، یہ چیز جاننے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

*****

موحدین کے "عامۃ الناس" اور "ایمانی ایلیٹ" کے مابین یہ جو فرق ہوا... یہی، بعدازاں "فرقہ ناجیہ" اور "طائفہ منصورہ" کے مابین فارِقdividerبنا۔یعنی

⇐ اول الذکر معاشرے کا وہ عام عنصر جو اپنے عقیدہ و عمل میں گمراہیوں اور ضلالتوں سے بچا ہوا اور باطل کی اتباع سے بری ءو بیزار کر ار کھا گیا ہے۔

⇐ جبکہ ثانی الذکر وہ خاص باصلاحیت عنصر جو باطل سے الجھتا، شرک پر جھپٹتا، بدعات کی سرکوبی کرتا، دین کے لیے قربانیاں پیش کرتا، منصوبے تشکیل دیتا اور اقامتِ حق کا علم تھام کر رکھتا ہے۔ ہجرت و نصرت اور جہاد کرتا ہے۔

"مہاجرین وانصار" اس دوسری صنف کے سرخیل تھے۔ اسلام کی سب ترقی و سرفرازی اِس مٹھی بھر جمعیت کے ہاتھوں ہوئی۔ اِس خصوصی جمعیت کا تسلسل بعدازاں طائفہ منصورہ کی صورت برسرِ عمل رہا۔ اس طائفہ کے دو خصوصی وصف ہوئے: علم اور جہاد۔ علم یعنی حق کا اِحقاق اور جہاد یعنی حق کی نصرت و تمکین۔ ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو علم اور جہاد ہر دو معاملہ میں مردِ میدان ہوئی۔ پھر ایک تعداد ایسی تھی جو علم کی امامت کرتی رہی اور ایک تعداد وہ جو جہاد کے معرکے لڑتی رہی۔ بڑے سے بڑے بادشاہوں کے وقت بھی یہ طائفہ بڑی بڑی اچھی سطح پر اپنا کردار ادا کرتا رہا۔ ہمارا مطالعۂ تاریخ، مختلف ادوار میں مسلم معاشرے کے عروج وزوال کے ذمہ دار اِس خصوصی "کردار" کو تلاش کرتا رہے گا۔

جدیدیت ومابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام

مضامین

امتیاز عبدالقادر
ریسرچ اسکالر کشمیر یونیورسٹی سرینگر

مغربی دنیا میں مذہب اور عقل کی کشمکش ماضی قریب کی انسانی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس کشمکش نے پوری دنیا پر دور رس اثرات ڈالے ہیں۔ کشمکش کا پس منظر یہ ہے کہ مغربی دنیا جس مذہب سے واقف تھی وہ خدا کا نازل کردہ نہ تھا بلکہ اس کی منحرف شکل تھی۔ اولاً اللہ کے نازل کردہ دین کی بنیاد "توحید" پر تھی جبکہ تحریف شدہ مذہب(عیسائیت) میں " تثلیث "کو اختیار کر لیا گیا تھا... اسی طرح اللہ کے دین کے مطابق خدا کا ہر بندہ اس کی عبادت براہِ راست کر سکتا تھا لیکن منحرف مذہب میں خدا اور بندوں کے درمیان پادریوں کا ایک گروہ بھی موجود تھا جس کے " واسطے " کے بغیر خدا سے تعلق کی استواری ممکن نہ تھی۔ اللہ کے نازل کردہ دینِ حق کے مطابق مخلص طالب ہدایت کو اس کی اجازت تھی کہ وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو پڑھے اور سمجھے لیکن تحریف پر قائم "دینی نظام" میں کتابِ الٰہی کی "تعبیر و تشریح" کا کام صرف "دینی طبقہ" ہی کر سکتا تھا۔عام عیسائیوں کے لئے لازم تھا کہ وہ بہر حال ان کی " تشریح" کو قبول کریں۔

اصل دین حق میں نجات کا دارومدار ایمان و عمل پر تھا لیکن منحرف عیسائیت میں کفارے کا عقیدہ گڑھ لیا گیا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسیحؑ نے صلیب پر چڑھکر اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے تمام گناہ بخشوالئے ہیں۔ اسی طرح کتابِ الٰہی کی تعلیمات مبنی بر عدل اور انسانی فطرت کے مطابق تھیں لیکن عیسائیت کے علمبر داروں نے رہبانیت اختیار کر لی تھی جو سراسر انسانی فطرت کے خلاف تھی۔

جدیدیت کا ظہور: اس غلط مذہب کے خلاف مغربی دنیا کے عام انسانی ضمیر نے بغاوت کر دی۔ جدیدیت ان نظریاتی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کے مجموعے کا نام ہے جو ۱۷ویں اور ۱۸ ویں صدی کے یورپ میں روایت پسندی (Traditionalism) اور کلیسائی استبداد کے ردِ عمل میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب کلیسا کا ظلم نقطہ عروج پر تھا۔ تنگ نظر پادریوں نے قدیم یونانی فلسفہ اور عیسائی معتقدات کے امتزاج سے کچھ خود ساختہ نظریات قائم کر رکھے تھے اور ان نظریات کے خلاف اٹھنے والی آواز کو وہ مذہب کے خلاف خطرہ تصور کرتے تھے۔ شاہی حکومتوں سے مل کر انہوں نے ایک ایسا استبدادی نظام قائم کیا کہ کسی بھی آزاد علمی تحریک کو پنپنے کا موقع نہیں ملا۔ چونکہ مذہب موجود تھا وہ غیر معقول بھی تھا اور غیر عادلانہ بھی، اس لئے مغربی ذہن نے یہ رائے قائم کی کہ انسانی معاشرے میں عدل کے قیام کے لئے مذہب کو ترک کرنا ضروری ہے۔

دوسری طرف اسپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل کی وجہ سے عیسائی دنیا میں حریت فکر کی ہوائیں آنے لگی۔ قرطبہ اور غرناطہ میں حاصل شدہ تجرباتی سائنس (Empirical Science) کے درس رنگ لا رہے تھے اور یورپ کے سائینسدان آزاد تجربات کرنے لگے تھے۔ ان سب عوامل نے مل کر کلیسا کے خلاف شدید رد عمل پیدا کیا اور جدیدیت کی تحریک شروع کی۔ چونکہ اس تحریک سے قبل یورپ میں شدید نوعیت کی دقیانوسیت اور روایت پرستی کا دور دورہ تھا، اس لئے اس تحریک نے پورے عہد وسطیٰ کو تاریک دور قرار دیا۔

جدیدیت کی اس تحریک کی نظریاتی بنیادیں فرانسس بیکنؔ (Francis Becon)، رینے ڈیکارٹؔ (Rene Descartes)، تھامس ہوبسؔ (Thomas Hobes) وغیرہ کے افکار میں پائی جاتی ہیں، جن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ دنیا اور کائنات عقل، تجربے اور مشاہدے کے ذریعے قابلِ دریافت ہے اور اس کے تمام حقائق تک سائنسی طریقوں سے ہی رسائی ممکن ہے۔ اس لئے حقائق کی دریافت کے لئے کسی اور سرچشمہ کی

ضرورت نہیں۔ ان فلسفیوں نے مابعد الطبعیاتی مزعومات اور فریبی دعووں کو اس وجہ سے رد کیا کہ وہ ان کسوٹیوں پر پورے نہیں اُترتے۔ ڈیکارٹ نے 'I think therefore I am' کا مشہور اعلان کیا، جو جدید مغربی فلسفے کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious Act of Ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔

علاوہ ازیں پاسکل، مانٹسکیو، ڈیڈارٹ، وسلی، ہیوم، والٹیر جیسے مفکرین نے بھی عقل کی لا محدود بالا دستی اور واحد سرچشمہ علم ہونے کے تصور کو عام کیا۔ یہ افکار عقل پرستی (Rationalism) کہلاتے ہیں اور جدیدیت (Modernism) کی بنیاد ہیں۔ اس تحریک نے مذہبی محاذ پر الحاد و تشکیک کو جنم دیا۔ والٹیر جیسے الحاد کے علمبردار نے مذہب کا کلیتاً انکار کر دیا جبکہ ہیگل مذہب کو تسلیم تو کرتے تھے لیکن اسے عقل کے تابع بتاتے ہیں۔

سیاسی محاذ پر اس تحریک نے انسانی حرکت کا تصور پیش کیا، آزادی فکر، آزادی اظہارِ رائے اور حقوقِ انسانی کے تصورات عام کئے۔ تھامس ہابس کے حتمی اقتدارِ اعلیٰ Absolute Sovereignty کے تصور کو سیاسی فلسفے کی بنیاد قرار دیا۔ جان لاک نے اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے خدا کے بجائے عوام کو اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا۔ والٹیر نے حریت بشر کا تصور پیش کیا۔۔ مانٹلکو اور روسو نے ایسی ریاست کے تصورات پیش کئے جس میں انسانوں کی آزادی اور ان کے حقوق کا احترام کیا جاتا ہے اور حکمرانوں کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔ جدیدیت کی تحریک نے قوم پرستی اور قومی ریاستوں کا تصور بھی عام کیا۔ ان ہی افکار کے بطن سے جدید دور میں جمہوریت نے جنم لیا اور یورپ و شمالی امریکہ کے اکثر ملکوں میں خود مختار، جمہوری، قومی ریاستیں قائم ہوئیں۔

معاشی محاذ پر اس تحریک نے اول سرمایہ دارانہ معیشیت اور نئے صنعتی معاشرے کو جنم دیا، جس کی بنیاد ایڈم اسمتھ کی معاشی فکر تھی جو صنعت کاری، آزادانہ معیشت اور کھلے بازار کی پالیسیوں سے عبارت تھی۔ نئے صنعتی معاشرے میں جب مزدوروں کا استحصال شروع

ہوا تو جدیدیت ہی کے بطن سے مارکسی فلسفہ پیدا ہوا، جو ایک ایسے غیر طبقاتی سماج کا تصور پیش کرتا تھا، جس میں محنت کش کو بالادستی حاصل تھی۔

اخلاقی محاذ پر اس تحریک نے افادیت کا تصور عام کیا۔ جو رویے سماج کے لئے فائدہ مند ہیں، وہ جائز اور جو سماج کے لئے نقصان دہ ہیں، وہ ناجائز رویے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 'مذہب' سے انکار کے بعد جدیدیت کے پاس انسانوں کی اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ اخلاقی بے راہ روی عام ہوگئی اور اس پر گرفت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ جدیدیت کے اس خوفناک انجام کے مظاہر درج ذیل ہیں:

أ. افراد کے اندر مایوسی اور کھوکھلا پن اور خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان
ب. خاندانی نظام کا انتشار
ت. جنسی بے راہ روی
ث. (Feminisim) اور دیگر غیر متوازن رویے مثلاً ہم جنسی (Homosexuality)
ج. ماحولیاتی بحران
ح. سرمایہ داری کا احیاء
خ. عورتوں اور بچوں کے خلاف مظالم
د. (Urbanization) کے پیدا کردہ معاشرتی اور اخلاقی مسائل
ذ. انسانی حقوق کی پامالی
ر. بین الاقوامی قوانین اور ضابطوں کی خلاف ورزی
ز. کمزور ممالک پر طاقتور ممالک کی چیرہ دستی اور عالمی استعمار کا ظہور وغیرہ۔

۲۰ ویں صدی کے آتے آتے یورپ اور شمالی امریکہ کے اکثر ممالک ان افکار کے پُر جوش مبلغ اور داعی بن گئے۔ جدیدیت کو روشن خیالی (Enlightment) اور نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کے نام بھی دئے گئے اور بڑی طاقتوں کی پشت پناہی سے روشن خیالی کا منصوبہ ایک عالمی منصوبہ بن گیا۔ چنانچہ ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر میں مغربی ممالک کا

واحد نصب العین تیسری دنیا (نو آبادیات) میں روایت پسندی سے مقابلہ کرنا اور جدیدیت کو فروغ دینا قرار پایا۔ آزادی، جمہوریت، مساوات مرد و زن، سائنسی طرزِ فکر، سیکولر ازم وغیرہ جیسی قدروں کو دنیا بھر میں عام کرنے کی کوشش کی گئیں۔ معاشی فکر کے معاملے میں مغرب سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ دھڑوں میں ضرور منقسم رہا لیکن سیاسی، سماجی اور نظریاتی سطح پر جدیدیت کے افکار بالاتفاق جدید مغرب کے رہنما افکار بنے رہے۔ نو آبادیات اور تیسری دنیا میں ایسے حکمرانوں کو بٹھایا گیا جو عوام کی مرضی کے خلاف زبردستی ترقی کے جدید ماڈل ان پر تھوپنے پر مامور رہے۔ اسلامی دنیا میں خصوصاً اسلامی تہذیبی روایات کی بیخ کنی کو جدیدیت کا اہم ہدف سمجھا گیا۔ ترکی، تیونس اور سابق سویت یونین میں شامل وسط ایشیا کے علاقوں میں مذہبی روایات سے مقابلے کے لئے ایک سخت ظالمانہ اور استبدادی نظام قائم کیا گیا۔

مابعد جدیدیت، جدیدیت کا ردِ عمل: جدیدیت کی اس ہمہ گیر فکری استبداد نے وہی صورتحال پیدا کر دی، جو عہدِ وسطیٰ کے یورپ میں مذہبی روایت پسندی نے پیدا کی تھی اور جس کے ردِ عمل میں جدیدیت (Modernism) کی تحریک برپا ہوئی تھی۔ جدیدیت کے استبداد کا لازمی نتیجہ شدید ردِ عمل کی شکل میں رونما ہوا اور یہی ردِ عمل مابعد جدیدیت (Post-Modernism) کہلاتا ہے۔

معقول رویہ تو یہ تھا کہ انسان خدا کی طرف پلٹ آتا اور خدائی ہدایت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا لیکن مغربی دنیا ایک طرف دینِ حق سے بڑی حد تک ناواقف ہے اور دوسری طرف وہ اس اخلاقی بے راہ روی کو چھوڑنا نہیں چاہتی جو مذہب کے انکار سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے خدا کی طرف پلٹنے کے بجائے جدیدیت کا ردِ عمل مابعد جدیدیت کی شکل میں سامنے آیا۔ دراصل ابھی تک مغربی انسان کا شعور اور اخلاقی حس اتنی پختہ نہیں ہوئی ہے کہ وہ متوازن ردِ عمل پر قادر ہو سکے۔

مابعد جدیدیت کسی متعین اور مربوط فلسفہ یا طرزِ فکر کا نام نہیں ہے بلکہ یہ " تمام

نظریات کے انکار" کا نام ہے۔ مغرب کا انسان حق کی تلاش میں ناکامی کے بعد مایوس ہو چکا ہے، چنانچہ اس نے اعلان کیا ہے کہ 'حق' نام کی کوئی شئے موجود نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت کے تصور کے مطابق دنیا میں کسی آفاقی سچائی کا وجود نہیں ہے بلکہ آفاقی سچائی کا تصور ان کے نزدیک محض ایک خیالی تصور (Utopia) ہے۔ ان کے نزدیک چاہے سچائی ہو یا کوئی اور اخلاقی قدر، حسن و خوبصورتی کا احساس ہو یا کوئی اور ذوق، یہ سب اضافی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا تعلق انفرادی پسند و ناپسند اور حالات سے ہے، یعنی ایک ہی بات کسی مخصوص مقام پر مخصوص صورتوں میں سچ اور دوسری صورتوں میں جھوٹ ہو سکتی ہے۔ دنیا میں کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جو ہمیشہ اور ہر مقام پر سچ ہو۔ مابعد جدیدیت کے ماننے والے سائنس کو بھی حتمی سچائی کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ لیوٹارڈ (J.F.Lyotard) کہتا ہے:

" سائنس کی زبان اور اخلاقیات اور سیاسیات کی زبان میں گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق ہی مغرب کی تہذیبی تناظر کی تشکیل کرتا ہے"

(The Post-Modern Condition : Knowledge Page8)

ردِ تشکیل کا نظریہ: مابعد جدیدیت کے نزدیک جمہوریت، ترقی، آزادی، مذہب، خدا، اشتراکیت اور اس طرح کے دعوٰوں کی وہی حیثیت ہے جو دیومالائی داستانوں، الف لیلوی قصوں اور عقیدوں کی ہے۔ اس لئے انہوں نے ان تمام دعوؤں کو مہابیانیوں (Meganarratives) کا نام دیا۔ جدیدیت کے مفکرین کا خیال ہے کہ انہوں نے بہت سی 'سچائیاں' تشکیل دی ہیں اور چاہے مذہب ہو یا جدید نظریات، ان کی بنیاد کچھ خود ساختہ سچائیوں پر ہے اسلئے جدیدیت کے دور کی تہذیب، علم وغیرہ انہی مفروضہ سچائیوں پر استوار ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تشکیل شدہ سچائیوں کی رد تشکیل (Deconstruction) کی جائے، یعنی انہیں ڈھا دیا جائے۔ چنانچہ ادب، فنونِ لطیفہ، آرٹ، سماجی اصول و ضابطے ہر جگہ ان کے نزدیک خود ساختہ سچائیاں اور عظیم بیانیے ہیں، جن کی رد تشکیل ضروری ہے تا کہ ما

بعد جدیدی ادب، فنونِ لطیفہ وغیرہ میں ایسے 'غلط مفروضوں' کا عمل دخل نہ ہو۔

مابعد جدیدیت کے عملی اثرات: مابعد جدیدیت کا سب سے نمایاں اثر یہ ہے کہ افکار، نظریات اور آئیڈیالوجی سے لوگوں کی دلچسپی نہایت کم ہوئی۔ عہدِ جدید کا انسان مخصوص افکار و نظریات سے وفاداری رکھتا تھا اور ان کی تبلیغ و اشاعت کے لئے پُرجوش و سرگرم رہتا تھا۔ مابعد جدید دور کے انسان کے نہ کوئی آدرش ہیں اور نہ اصول، اسلئے مِشل (Stephan Mitchal) نے اس عہد کو "Age of no Idealogy" قرار دیا ہے۔

مذہبی معاملات میں وحدتِ ادیان کا نظریہ بہت قدیم ہے۔ مابعد جدیدیت نے اس طرزِ فکر کو تقویت دی ہے۔ اب دنیا بھر میں لوگ بیک وقت سارے مذاہب کو سچ ماننے کے لئے تیار ہیں اور بین المذاہب مکالمات و مباحث سے لوگوں کی دلچسپی روبہ زوال ہے جبکہ دوسری طرف الحاد و مذہب بیزاری کی شدت بھی ختم ہو رہی ہے۔ اس لئے اس عہد کو لادینیت کے خاتمے کا عہد (Age of Desecularisation) بھی کہا جاتا ہے۔ ایک شخص خدا پر بھروسہ نہ رکھتے ہوئے بھی روحانی سکون کی تلاش میں کسی فریبی پیشوا سے رجوع کر سکتا ہے۔ آج اسے کسی ہندو بابا کے ہاں سکون ملتا ہے تو کل کوئی عیسائی راہب اسے مطمئن کر سکتا ہے۔ یہ مابعد جدیدیت ہے۔

حج کعبہ بھی گیا، گنگا کا اشنان بھی
راضی رہے رحمٰن بھی، خوش ہو شیطان بھی

خاندانی نظام اور شادی بیاہ کے بندھنوں کا انکار ہے نہ اقرار۔ عفت، ازدواجی وفاداری اور شادی کے بندھن مابعد جدیدیوں کے ہاں مہابیانیے' ہیں۔ اسی طرح جنسوں کی بنیاد پر علٰحیدہ علٰحیدہ رول کو بھی وہ آفاقی نہیں مانتے۔ نہ صرف مرد و عورت کے درمیان تقسیم کار کے روایتی فارمولوں کے وہ منکر ہیں، بلکہ جنسی زندگی میں بھی مرد اور عورت کے جوڑے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ شادی مرد و عورت کے درمیان بھی ہو سکتی ہے اور مرد مرد و عورت

عورت کے درمیان بھی۔ کوئی چاہے تو اپنے آپ سے بھی کر سکتا ہے۔ مرد اور عورت شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنا پسند کریں تو اس پر بھی ان کے ہاں کوئی اعتراض نہیں۔ یہ سب ذاتی ذوق اور پسند کی بات ہے۔ اس نظریے نے دراصل انسانیت کو شرمسار کیا۔

؎ عمر بھر ہم یوں ہی غلطی کرتے رہے غالبؔ

دھول چہرے پہ تھی اور ہم آئینہ صاف کرتے رہے

فیشن، لباس، طرزِ زندگی ہر معاملے میں کوئی بھی ضابطہ بندی گوارہ نہیں ہے۔ مرد بال بڑھا سکتا ہے۔ چوٹی رکھ سکتا ہے، اسکرٹ پہن سکتا ہے، زنانہ نام رکھ سکتا ہے۔ سوسائیٹی کو کسی بھی رویے کو ناپسند کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر مرد و عورت مادر زاد برہنہ رہنا چاہیں تو سوسائیٹی اس پر بھی معترض نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض مابعد جدیدی، لباس کو آفاقی ضرورت قرار دینے پر معترض ہیں۔ وہ عریانیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر اس طرزِ زندگی کے لئے ویب سائیٹ، ہیلپ لائنز، ڈسکشن فورمز اور نہ جانے کیا کیا شیطانی حربے ہیں۔

آرٹ اور فنونِ لطیفہ میں وہ ہر طرح کے نظم اور پابندی کے خلاف ہیں۔ جدیدیت نے ان محاذوں پر جو اصول تشکیل دئے تھے، مابعد جدیدیت ان کی ردِ تشکیل(De-Construction) چاہتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں:

"ہر طرح کی نظری ادعائیت سے گریز اور تخلیقی آزادی پر اصرار مابعد جدیدیت ہے"

(ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات ص530)

مابعد جدیدی والے کہتے ہیں کہ ادب اور فنونِ لطیفہ حقیقت کی ترجمانی کے لئے نہیں بلکہ حقیقت کی تخلیق کے لئے ہیں۔ اس لئے وہ آرٹ کو ہر طرح کے ادبی، سیاسی اور مذہبی دعوؤں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔

مابعد جدیدیت ایک محاکمہ: مابعد جدیدیوں کا یہ دعویٰ کہ دنیا میں کسی سچائی کا سرے سے وجود نہیں ہے، ایک نہایت غیر منطقی دعویٰ ہے۔ اس دعویٰ میں بڑا ریاضیاتی نقص

ہے۔ یہ کہنا کہ " یہ سچ ہے کہ دنیا میں کوئی سچ نہیں" ایک بے معنی بات ہے۔ " دنیا میں کوئی سچ نہیں ہے" بذات، خود ایک دعوٰی ہے۔ اگر اس بیان کو درست مانا جائے تو اس کی زد سب سے پہلے خود اسی بیان پر پڑے گی اور یہ بیان جھوٹا قرار دیا جائے گا۔ یہ ماننے کے لئے کہ " دنیا میں کوئی سچ نہیں ہے" کم سے کم اس ایک بات کو سچ ماننا پڑے گا۔ "خود ساختہ سچائیوں" کی ردِ تشکیل کی یہ فکر ایسا جال بچھاتی ہے کہ اس میں خود ہی پھنس جاتی ہے اور خود اپنے ہی اصولوں کے ذریعے اپنے اصولوں کا رد کرتی ہے۔ غالباً یہ انسان کی فکری تاریخ کا نہایت منفرد واقعہ ہے کہ کوئی فکر اپنے تشکیل کردہ پیمانوں سے اپنی بنیادوں کو ڈھائے۔

منطقی تضاد کے علاوہ اس جدید فکری جاہلیت کے علمی اثرات بھی نہایت بھیانک ہیں۔ اگر سچائی اضافی ہے اور دنیا میں کوئی قدر آفاقی نہیں ہے اور سچائیاں مقامی تہذیبوں کی پیداوار ہیں تو سوال یہ ہے کہ کس بنیاد پر ایک شخص کو دوسرے کی جیب کاٹنے سے روکا جائے گا۔ اس لئے کہ ہر جیب کترا جس مخصوص تہذیبی پس منظر میں پروان چڑھتا ہے وہ اسے جیب کترنے کے عمل کو ایک ناگزیر حقیقت کے روپ میں ہی دکھاتا ہے، یا اگر کوئی شخص افیم کھا کر چلتی ٹرین کے دروازے سے یہ سمجھ کر نہایت صبر و سکون کے ساتھ باہر نکلنے کی کوشش کریں کہ وہ اپنے گھر کے چمن میں تشریف لے جارہے ہیں تو آخر کس دلیل سے انہیں اس حماقت سے روکا جائے گا؟ وہ نہایت ایمانداری سے وہی سچائی دیکھ رہے ہیں جو افیم کے اثر سے پیدا شدہ ان کے " مخصوص احوال" انہیں دکھارہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچائی کی اضافیت کے نظریے کو مان لینے کے بعد اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، جب تک کچھ حقایق پر عالمی اتفاق رائے نہ ہو اور انہیں قطعی حقایق کے طور پر قبول نہ کیا جائے، اس وقت تک تمدن کی گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔

آج سے تقریباً ستر سال قبل " مابعد جدیدیت" کی اصطلاح استعمال کئے بغیر ۲۰ ویں صدی کے رجل عظیم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے 'نظریات کی شکست وریخت' کی پیشنگوئی کر دی

تھی۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" نامی مشہور تصنیف کے حصہ سوم میں مولانا رقمطراز ہیں:

" دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ نوعِ انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اس کی عمر پوری ہے... یہ زبردست شکست وریخت اس لئے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم تجہیز و تکفین ادا کریں.......... اس (تہذیب) کے پاس اب کوئی اور انچھر ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے"

ان حالات میں انسانیت کے لئے کون سی راہ باقی ہے؟ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"....اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے نظریات ناکام ہو چکے ہیں.... اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نظریے کی تصنیف اور اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت مین صرف اسلام ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے لئے نوع انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے"

اس صورتحال میں مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے؟ مولاناؒ لکھتے ہیں:

"....)مسلمانوں کو) سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہو گا اور وہ صرف اس صورت سے دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں، اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اس کو خود چھوڑ دیں.... پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہو گا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے"

نیز یہ کہ:

" اس (انقلابی) کام کے لئے ایک زبردست تنقیدی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے

جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سرِ نو مدون کرے...... حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں .... ایک طرف پرانے نظامِ تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظامِ تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دے"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جلد ۳ از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ)

مابعد جدیدیت اور اسلام: سچائی کی اضافیت کا نظریہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک باطل نظریہ ہے۔ اسلام اس بات کا قائل ہے کہ عقل انسانی کے ذریعے مستنبط حقائق یقیناً اضافی ہیں اور شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہیں۔ اس حد تک مابعد جدیدیت اسلام سے ہم آہنگ ہے لیکن اسلام کے نزدیک حقائق کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے وہ حتمی اور قطعی ہیں۔ اس ساری بحث میں اسلام کا نقطہ نظر نہایت معتدل، متوازن اور عقل کو اپیل کرنے والا ہے۔ اس نقطہ میں ما بعد جدیدی مفکرین کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات بھی موجود ہیں اور اُن تضادات کی بھی گنجائش نہیں ہے جو مابعد جدیدیت میں پائے جاتے ہیں۔

یہ بات کہ انسانی عقل حتمی نہیں ہے اور بسا اوقات دھوکا کھا جاتی ہے، اسلام کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے کوئی نئی فکر نہیں ہے۔ جدیدیت نے جس طرح عقل انسانی کو حتمی اور قطعی مقام دیا اور عقلیات کو حتمی سچائی کے طور پر پیش کیا۔ اس پر مابعد جدیدی مفکر ین سے بہت پہلے اسلامی مفکرین نے جرح کی۔ بلکہ یہ مبحث صدیوں قبل امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کے افکار میں بھی ملتا ہے۔

امام غزالیؒ نے " تہافت الفلاسفہ" میں ارسطو کی منطق پر خود اسی منطق کے اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے جو تنقید کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عقل کے ذریعے معلوم حقائق کو محض واہمہ قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات کی وسعتیں اور وقت لا محدود

ہے اور انسانی عقل لا محدود کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کے مشاہدات اضافی ہیں اور ان مشاہدات کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج بھی اضافی ہیں۔

جدید اسلامی مفکرین نے بھی جدیدیت پر کلام کرتے ہوئے عقل کی تحدید اور عقل کے ذریعے معلوم حقائق کے اضافی ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقم طراز ہیں:

" انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پاسکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا۔۔ ان کے (علمی قیاسات) غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جو بالآخر غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں"

(بحوالہ دین حق، ص22)

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جزب عمل بے بنیاد سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تارِ حیات

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں تجلیاتِ کلیم و مشاہدات حکیم

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ علم حقیقی (یا حتمی و قطعی دسچائی) کا سرچشمہ باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس نے اپنے علم سے انسان کو اتنا ہی معمولی سا حصہ بخشا جتنا وہ چاہتا ہے۔

" بے شک اللہ وہ ہے، جس سے نہ زمین کی کوئی چیز مخفی ہے نہ آسمان کی" (آل عمران 5)

سورہ بقرہ آیت 255 میں فرماتا ہے:

" جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے او جھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے"۔

اور لوگ اس کے علم میں کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے"

اس طرح جو حقائق علم حقیقی کے سر چشمہ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی الٰہی یا اس کے پیغمبر کی منصوص سنت کی صورت میں ظہور پزیر ہوئے ہیں وہ حتمی صداقت (Absolute Truth) ہیں۔اور ان کے ماسوا دنیا میں حقیقت کے جتنے دعوے پائے جاتے ہیں ،ان کی دو قسمیں ہیں اگر وہ وحی الٰہی سے متصادم ہیں تو وہ باطل مطلق (Absolute False) ہیں اور اگر متصادم نہیں ہیں تو ان کی حیثیت اضافی صداقت (Relative Truth) کی ہے، جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ وحی الٰہی سے منصوص حقائق کے ماسوا تمام امور، خواہ وہ سائنسی امور یا ضوابط ہوں ، یا ریاضی و منطق ، یا معاشیات وسیاسیات یا سماجیات و عمرانیات سے متعلق امور ، تمام دعوے اضافی ہیں ۔ عملی زندگی میں قانون سازی اور ضابطہ سازی کے معاملے میں بھی اسلام نے یہی موقف اختیار کیا ہے ۔ جدیدیت کی طرح وہ نہ ہر معاملے کو آفاقی حیثیت دیتا ہے اور نہ مابعد جدیدیت کی طرح ہر آفاقی ضابطہ و اصول سے انکار کرتا ہے۔وحی الٰہی کی صورت میں وہ بنیادی اصولوں وسمت کو آفاقی حیثیت دیتا ہے اور ان آفاقی اصولوں کی روشنی میں مخصوص وقت، مخصوص مقام اور مخصوس احوال کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھتا ہے بلکہ اجتہادی اور غیر منصوص احکام میں " عُرف " کا لحاظ بھی رکھتا ہے جسے مابعد جدیدی 'تہذیبی اتفاق رائے' (Cultural Consensus) کہتے ہیں۔

وحی الٰہی کی بنیادوں پر چند آفاقی قدروں اور اصولوں کی حتمیت اور ان کے دائرے کے

باہر وسیع تر معاملات میں وحی الٰہی کی روشنی میں نئے طریقوں، ضابطوں اور راستوں کی تشکیل کا راستہ ایک ایسا معتدل راستہ ہے جو اسلام کو بیک وقت دائمی، آفاقی اور مقامی احوال کے مطابق بناتا ہے۔ اور زماں و مکاں کے اختلافات سے ماورا کر دیتا ہے اس لئے اسلام کی بنیاد پر صحیح طور پر بننے والا معاشرہ ماورائے جدید معاشرہ ہوتا ہے۔

ختمِ نبوت ﷺ کا نظریہ اسلام کا ایک بنیادی نظریہ ہے اس نظریے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب زمانے میں کسی ایسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے، جو بنیادی اصولوں میں کسی ترمیم کی متقاضی ہو۔ آنے والی ہر جدت کی نوعیت جزوی اور ذیلی ہی ہو گی اسلئے یہ کہنا کہ اب ہم مابعد جدیدیت کے عہد میں ہیں اس لئے جدیدیت کی ہر جڑ کی ردِّ تشکیل (Deconstruction) ضروری ہے، ایک نہایت لغو بات ہے۔ انسانی حیات میں بیک وقت دائمی اور تغیر پزیر دونوں طرح کے عناصر کار فرما ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس مسئلے پر اپنی تحریر " دین حق " میں بہت دلچسپ اور دلنشین انداز میں بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"کیا یہ واقعہ نہیں کہ تمام جغرافیائی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانین طبعی یکساں ہیں، جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ نظامِ جسمانی یکساں ہے، جن پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں جن کی بنا پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے۔ وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کئے گئے ہیں۔ وہ قوتیں یکساں ہیں جن کے مجموعے کو ہم نفس انسانی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ تمام طبعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں جو انسانی زندگی میں کار فرما ہیں۔ اگر یہ واقع ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے' تو جو اصول انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لئے صحیح ہوں، ان کو عالم گیر ہونا چاہیئے۔" ے

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

خلاصہ بحث یہ کہ مابعد جدیدیت، جدیدیت کا ایک منفی رد عمل ہے اور اس گھٹاٹوپ اندھیرے کا مظہر ہے، جس میں مسلسل کئی نظریات کی ناکامی اور ابطال کے بعد ہمارے عہد کا پڑھا لکھا انسان بھٹک رہا ہے۔ افکار، نظریات اور فلسفوں کی عالی شان عمارتیں اس بُری طرح سے زمین بوس ہو گئیں کہ نئے زمانہ کے فلسفیوں نے عافیت اسی میں محسوس کی کہ سوچنا ہی چھوڑ دیا جائے۔ فکرو خیال اور سچائی کے تصورات ہی کو واہمہ قرار دیا جائے۔ نظریے اور Ideology کو ایک ناپسندیدہ شے باور کیا جائے اور حیات انسانی کو حالات اور افراتفری کے حوالے کر کے مابعد جدیدیت کی " جنت " میں چین کی بانسری بجائی جائے۔ تمام جھوٹے خداؤں کے زمین بوس ہو جانے کے بعد مابعد جدیدیت در اصل لا الٰہ کا اعلان ہے۔ الاّ اللہ کا اعلان باقی ہے جو انشاء اللہ موجودہ کیفیت کا لازمی اور منطقی انجام ہو گا۔ ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

(علامہ اقبالؒ)

مصادر و مراجع:

1. ' دینِ حق' از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی
2. ' ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' از گوپی چند نارنگ
3. .مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام از سید سعادت اللہ حسینی
4. . مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی
5. .A Young Muslim's guide to the Modern World By: Nasr Sayyed .
6. .Principles of Philosophy " By : Descartes Rane " .

.We are all Postmodern now " By : Stephen Mitchel " .

یہ کس کی بیٹی ہے؟

احوال و تعلیقات

ابنِ علی

تصویر سے بھی محسوس ہوتا ہے یہ کوئی پشاور ٹائپ علاقہ ہے۔ سوشل میڈیا پر گردش کرتی ہوئی اس تصویر کی جو ڈسکرپشن لکھی ہے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ غیور پٹھانوں کے علاقے میں اِس بڑے پیمانے پر یہ ایک نئی 'تہذیب' کی شروعات ہیں۔ بہت بڑا ایک ہال ہے، کئی منزلہ۔ لوگ کھچا کھچ بھرے ہیں۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ دُور دُور سے آئے لگتے ہیں۔ سب مل کر نہایت انہماک سے ایک جوان لڑکی کو 'کیٹ واک' کرتے ہوئے دیدے پھاڑ پھاڑ دیکھ رہے ہیں۔ اس پر ہماری جانب سے سوشل میڈیا پر یہ تحریر دی گئی تھی۔ اس کا لنک یہاں بھی تحریر کے آخر میں دیا گیا ہے۔

اتنے 'معززین' اکٹھے ہو کر اس لڑکی میں 'کیا' دیکھ رہے ہیں؟ ہمارے ملک میں تو ایسی گہما گہمی صرف مویشیوں کی منڈی میں دیکھی گئی ہے۔ کسی کی بیٹی کو اتنے لوگ اکٹھے ہو کر دیکھنے لگیں؛ یار اپنے یہاں؟!

یہاں تو خدا بخشے، بیس آدمی آپ کو راہ چلتے ٹوکنے کو موجود ہوتے تھے، وہ سب کہاں چلے گئے؟

کیا یہ زمانۂ جاہلیت پر فلمائی گئی کوئی مووی ہے یا اِس دورِ 'اینلائٹنمنٹ' کا کوئی واقعہ؟

کہتے ہیں اپنے پشاور کا واقعہ ہے؛ اور ابھی حال ہی کا!

سبحان اللہ اوپر سے اوپر کی گیلری تک سے لوگ تاکنے کی کوشش میں ہیں۔ غالباً نیچے بیٹھنے والوں نے زیادہ پیسے دیے ہوں گے... یا پھر اوپر والے لیٹ آئے ہوں گے!

یہ لڑکی بھی مفت یہ 'سروس' نہیں دے رہی ہو گی۔ لیکن تصور کریں سارے پیسے اسی بیچاری کو مل جاتے! لیکن کہاں! اغلباً اس کے پاس بہت کم پیسے آئے ہوں گے۔ بھلا زیادہ کہاں گئے ہوں گے؟ 'منتظمین' کے پاس! زمانۂ جاہلیت میں ان منتظمین کو: نخّاسین کہا جاتا تھا۔ یعنی انسان فروشی کا دھندہ کرنے والے۔ واقعی وہ زمانۂ جاہلیت تھا: کیسے سیدھے لفظ بول دیا کرتے تھے! تبھی لوگ کہتے ہیں کم از کم اُن کی فطرت سلامت تھی!

اس تصویر کو دیکھنا فی نفسہٖ معیوب نہ ہوتا تو میں تجویز دیتا کہ... اسے 'عورت کی آزادی' کے پورٹریٹ کے طور پر رکھا جائے، اور 'عورت کی آزادی' کا مضمون کبھی اس تصویر کے بغیر بیان نہ کیا جائے۔

(ایک تصویر کسی وقت سو کلمات سے بڑھ کر ہوتی ہے)

آپ کو معلوم ہے آپ کی شریف زادیاں یہاں کیسی 'قید' کی زندگی گزار رہی ہیں! انہیں ان کے شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے کِھلا رہے ہیں۔ کیسی محتاجی کی زندگی ہے! ان سب کو 'نخاسین' کے ہاتھ میں دو! ایسی ہی کمال کی کر دیں گے! یہ بھی تو ہمارے ہی کسی بھائی کی بیٹی ہے؛ اِس کے کان میں بھی اغلباً کسی نے پیدائش کے وقت اذان دی ہو گی!

*****

کسی کی غیرت جھنجھوڑی گئی ہے تو مجھے خوشی ہو گی، میں اس پر معذرت نہیں کروں گا۔

https://www.facebook.com/MudeerEeqaz/photos/a.478316525565377.109549.128733833856983/979814528748905/?type=3

23مارچ "مسلمان" کے طور پر اپنی شناخت کرانے کا دن

تنقیحات

مدیر ایقاظ

23 مارچ پر ہمارے سوشل میڈیا فورمز پہ دی جانے والی ایک تحریر۔ ایک سوال جو 23 مارچ کو خصوصی طور پر اٹھانا بنتا ہے۔ لبرل ڈسکورس کے ساتھ ایک مکالمہ:

14 اگست کی بات اور ہے۔ وہ آزادی تو آپ کو معلوم ہے ایک دن کے فرق کے ساتھ بھارت بھی مناتا ہے۔ اور ویسا ایک دن تو تقریباً تیسری دنیا کے ہر ملک میں منایا جاتا ہے۔

مگر 23 مارچ کا واحد مطلب "مسلمان" کے طور پر جہان میں اپنی شناخت کرانا ہے۔ "دین" کی بنیاد پر ہندو سے اپنے راستے الگ کر لینا۔

دنیا میں اپنا وجہِ امتیاز: "مسلمان" ہونا!

باقاعدہ اس بات کو ملک مانگنے کی ایک بنیاد بنانا کہ ہم "مسلمان" ہیں اور اس بنیاد پر ہم ہندو سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا چاہتے ہیں۔

"وطن" کی بنیاد "مذہب" کے فرق کو بنانا۔

حالانکہ اور بھی تو آپ کی پہچان کے بے شمار حوالے ہو سکتے ہیں۔ نہیں۔ صرف "مسلمان" ہونا جو آپ کو قوموں کے مابین اصل پہچان دیتا ہے۔

اور ماشاءاللہ آج سب یہ دن منا رہے تھے!

میں دعوے سے کہتا ہوں یہ لبرل ڈسکورس اگر یونہی بڑھتا رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا

(خدانخواستہ) تو ایک دن آپ کو یہ 23 مارچ کا جشن منسوخ کر دینا پڑے گا (اقبال ڈے کی طرح!)۔ '23 مارچ' کی تاویل میں تم جو مرضی کہہ لو، "مسلمان" ہر حال میں تمہارا پیچھا کرے گا۔ "مسلمان" کو کسی اور قومی تہوار سے تم 'منہا' کر بھی دو، "مسلمان" کو "23 مارچ" سے آخر تم نکال کیسے سکتے ہو؟ تم اس کی ایک سے ایک توجیہ کرنے کی کوشش کرو گے لیکن تمہارا ہر جواب جو '23 مارچ' کی تفسیر میں آئے گا کسی دوسری جہت سے تمہارے اس لبرل عقیدے کا توڑ ہی کرے گا.. تاوقتیکہ تم 23 مارچ کو 'دین پسندوں' کا تہوار مان کر اس سے لاتعلق نہ ہو جاؤ!!! آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں، کیسے؟

تم یہی کہہ لو گے ناں کہ 'ہندو اور مسلمان' کا الگ الگ ہو جانا ارے یہ وہ نہیں جو مُلا کے ذہن میں آتا ہے، یہ تو محض کچھ معاشی جہتوں سے تھا۔ یا تم میں سے وہ لوگ جو یہاں ہمیں کچھ زیادہ چھوٹ دے جاتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ مسلمان کا ہندو سے الگ تھلگ ایک قوم ہونا محض ایک 'رہن سہن' (ثقافت) کے فرق کی بنیاد پر تھا جو آخر ایک الگ ملک کا متقاضی ہوا نہ کہ کسی توحید و شرک کے فرق یا رسالت و شرع محمدی کے اقرار و انکار کی بنیاد پر (توحید اور رسالت ملتِ اسلام اور ملتِ کفر کے مابین فصیلیں اٹھا دینے والا اصل خطِ امتیاز)۔

تو پھر تمہارے دو گروہ ہو گئے:

1. ایک جو اس کو ہندو و مسلمان کے مابین صرف رہن سہن (ثقافت) کے فرق کے طور پر قبول کرتا ہے نہ کہ عقیدوں کے فرق کی بنیاد پر۔

2. اور دوسرا جو ہندو و مسلمان کے مابین 'رہن سہن' کے فرق کو ان کے مابین تفریق کرا دینے والی چیز ماننے کا بھی روادار نہیں۔ (یہ مان لیا تو گویا اسلام پسندوں کے کیس کا اچھا خاصا حصہ مان لیا!) لیکن چونکہ 'پاکستان' کا ٹھیکیدار بھی رہنا ہے بلکہ دینداروں کی اس "پاکستان" سے چھٹی کرانی ہے جس کا ایک بڑا دن 23 مارچ ہے جس کا 'اقبال ڈے' والا حشر

کرنا کوئی آسان نہیں (’23 مارچ‘ جو مسلمان اور ہندو کے مابین ”ملکوں“ کی فصیل بہر حال کھڑی کراتا ہے)... لہٰذا اِس فریق کا پرہیزی کھانا (’مذہب کی بنیاد پر تفریق‘ کے حوالے سے) اس قدر ہے کہ اس تفریق کو صرف ’معاشی‘ جہتوں سے لیا جائے، ’معاشی‘ جہتوں کے سوا کوئی جذبہ 23 مارچ 1940 کو اقبال پارک لاہور میں برعظیم ہند سے امڈ آنے والے انسانوں کے اندر اِن ’بیناؤں‘ کے خیال میں نہیں بول رہا تھا!

*****

پہلے، پہلے فریق کو لے لیتے ہیں جس کا کہنا ہے: ہندو و مسلم کے مابین یہ کوئی عقیدوں، ملتوں اور شریعتوں کا فرق نہ تھا بلکہ اس فرق کا معاملہ ’رہن سہن‘ (ثقافت) کی حد تک تھا جسے یار لوگوں نے باقاعدہ ادیان کا فرق بنا ڈالا!

ٹھیک ہے ہم آپ ہی کی بات کو لے لیتے ہیں۔ توپوں کی اِس گھن گرج میں ”23 مارچ“ کا کیس تو بہر حال آپ نے مانا جب ہند کا بٹوارہ کر دینے کا ”مسلمان“ اور ”ہندو“ ہونے کی بنیاد پر باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ بس اس کی تفسیر آپ کے ہاں ”رہن سہن“ ہے۔ اس کا مطلب ہے:

1. ”مسلمان“ اور ”ہندو“ کے مابین ”رہن سہن“ (ثقافت) کا فرق کوئی عام سا فرق بہر حال نہیں۔ آپ نے بھی مانا، یہ بجا طور پر اتنا بڑا فرق ہے کہ اس کی بنیاد پر دو قومیں ایک دوسرے سے الگ ہو جایا کریں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے راستے جدا کر لیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے ملک الگ ہو جانے کی نوبت آنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ کوئی ایسا عام سا فرق ہوتا تو دونوں کے پرسنل لاء الگ الگ بنا کر گزارہ ہو جاتا۔ آخر کیا مسئلہ ہے مسلمان عید کی چھٹی کر لیں، ہندو دیوالی کی۔ مسلمان کے نکاح، طلاق اور وراثت کے قوانین اور ہوں ہندو کے اور۔ مسلمان عبادت کے لیے مسجد میں جائے، ہندو مندر میں۔ اب بھی، کیا دونوں ملکوں میں ایسا ہو نہیں رہا؟ **ہم پوچھتے ہیں وہ ”رہن سہن“ آخر ہے کیا جو ایک سانجھے ملک**

میں رہ کر برقرار نہیں رہ سکتا؟ مسلمان اور ہندو کے مابین رہن سہن کا فرق۔ ہو گا۔ مگر آپ تو ماشاء اللہ ہمارے ساتھ یہ ماننے لگے کہ یہ ایک اتنا بڑا فرق ہے کہ دونوں فریق اس بنیاد پر اپنا اپنا ملک الگ کر لیں؟ ظاہر ہے، یہ وہ عام سا رہن سہن نہیں جو کسی بھی کمیونٹی کو کسی بھی ملک میں حاصل ہوتا ہے۔ **وہ عام معنیٰ کا "رہن سہن" تو ان دونوں قوموں کا دونوں ملکوں میں اکٹھا اب بھی چل رہا ہے:** ہندوؤں کا رہن سہن پاکستان میں آج بھی ویسے کا ویسا ہے اور مسلمانوں کا رہن سہن بھارت میں آج بھی جوں کا توں۔ **تو پھر کیا یہ (عمومی معنیٰ میں رہن سہن کا فرق) کوئی ایسی بات تھی جو مسلمان دلی، کلکتہ اور لکھنؤ میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے اور ہندو لاہور، حسن ابدال اور میانوالی میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے؟** رہن سہن، یار! آپ ملک الگ کرنے چلے! اس کے لیے چلیے 'آزادیاں' مانگ لیں (یہ 'رہن سہن' کی آزادیاں دونوں ملکوں کے دستور میں درج بھی ہیں)۔ **کیا اس کے لیے باقاعدہ "ملک" مانگ لیے جاتے ہیں؟!** اب یہ جو '23 مارچ' آپ نے پورے قومی جوش و خروش کے ساتھ منایا، جبکہ آپ کو معلوم ہے 23 مارچ 1940 کو لاہور میں کوئی فیشن شو یا کوئی میلہ مویشیاں نہیں ہوا تھا جس کی یاد میں آپ یہ خصوصی دن منا کر آ رہے ہیں، بلکہ یہ "ایک ملک کو دو ملک" کر دینے کی ایک پُرجوش قرارداد تھی جس کی یاد آپ نے (بے سوچے یا شاید ازراہِ منافقت) دھوم دھام سے منائی۔ اسے منا کر "ایک ملک کو دو ملک" کر دینے کے اُس کیس کو آپ نے تسلیم کیا۔ اور یہ "ایک ملک کو دو ملک" کر دینے کی بنیاد تھی: ہندو اور مسلمان کا فرق۔ آپ نے کہا: رہن سہن کی حد تک۔ ہم نے کہا: 'رہن سہن' کا ایک تو وہ (سیکولر) معنیٰ ہے جو آج بھی ہندوؤں کو پاکستان میں حاصل ہے[i] (اپنے مذہب کے مطابق 'پرسنل لائف' گزارنے کی آزادی) اور جو آج بھی مسلمانوں کو بھارت میں حاصل ہے۔ یہ 'رہن سہن' کا فرق اگر اس (سیکولر) معنیٰ میں ہے.. تو آپ یہ گتھی ہمیں سلجھا دیجئے کہ ملک ایک ہونے کی صورت میں اس ('رہن سہن') کو فرق کیا پڑتا اور ملکوں کا بٹوارہ ہو جانے کی صورت میں

اس کے ہاتھ کیا آتا؟ ہاں اگر 'رہن سہن' کا کوئی اور معنیٰ ہے اور وہ اس عمومی معنیٰ سے بڑھ کر ہے جو ہندو کو پاکستان میں حاصل ہے اور مسلمان کو بھارت میں حاصل ہے، اور جس کے لیے لازماً برصغیر کے دو ٹکڑے ہی ہو جانے چاہئیں تھے، **اور جو کہ مسلمان اور ہندو کی مشترکہ قومی زندگی کے اندر ممکن الحصول ہی نہیں تھا** ('23 مارچ' کا واضح مدلول)... تو پھر باقی سب تعبیر کا فرق ہے، باعتبارِ مضمون آج آپ نے ہمارے ''اسلامی پاکستان'' ہی کا جشن منایا ہے، جس پر حق بنتا ہے کہ ہم آپ کو مبارکباد پیش کریں، الا یہ کہ آپ نے ''ہندو و مسلم کے مابین ملک کے بٹوارے'' کی قرارداد کا یہ جشن بے سوچے سمجھے منایا ہو یا ازراہِ نفاق ''مسلمانوں'' کے ایک الگ ملک کے آئیڈیا پر خوشی سے بے حال ہو ہو دکھاتے رہے ہوں۔

2. ایسا کہہ کر آپ نے یہ بھی مانا کہ خود اِس ملک کی بنیاد ہی ہندو سے الگ رہن سہن رکھنا ہے۔ **لہٰذا ہندو کے ساتھ اس رہن سہن کے فرق کو زندہ اور نمایاں کرنا اس ملک کے بنیادی ترین مقاصد میں سے ایک ہوا۔** اور اِس فرق کو حاشیائی کرنا یا ایسا معمولی سا کر دینا جو ہندوستان میں رہ کر بھی مسلمان رکھ سکتا ہے، اِس ملک کے وجود کو بے معنیٰ کر دینا ہے۔ بتایئے لبرل ڈسکورس میں اس بات کی گنجائش بھی کب ہے؟

*****

اور اب دوسرے فریق کو لے لیتے ہیں جس کا کہنا ہے، یہ محض معاشی مفادات کو محفوظ بنانے کے لیے تھا۔

ہم کہتے ہیں مسلمانوں کے معاشی مفادات کو محفوظ بنانا کوئی غلط بات نہیں۔ ہمارے نزدیک تو ہندو سے مسلمان کی ایک ایک چیز کو بچانا ضروری ہے۔ **لیکن یہ معاشی مفادات آپ 'مذہب' کی بنیاد پر ہی کیوں الگ کر رہے ہیں؟** اصل مسئلہ یہاں پر ہے۔ آپ نتیجے پر تو بے شک پہنچ گئے ہیں لیکن اُس سبب کو جھکائی دے رہے ہیں جس نے سب سے پہلے ان

کو دو الگ الگ جماعتیں بنایا اور پھر ان میں وہ بُعد پیدا کیا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے پر اپنے اپنے ''مفاد'' کی فکر کرادی۔ ہم بھی تھوڑی دیر کے لیے کہہ دیتے ہیں، اور ویسے اصولاً بھی اس میں کوئی مانع نہیں کہ: اگر صرف مفادات ہی محفوظ ہوسکتے ہوں تو بھی مسلمان کو ہندو سے الگ ملک دے دیجئے۔ **لیکن آپ تو اُس اصل نقطے کو گول کرانا چاہتے ہیں جس نے 'مفادات' کے اس فرق کو ''ہندو اور مسلم'' کے سوا کوئی اور عنوان دینا قبول نہ کیا۔** تھوڑا سا غور تو کیجئے۔ ظلم زیادتی انسانوں کی سرشت میں ہے۔ تمیز discrimination کی بنیادیں انسانوں کے مابین بے شمار ہیں۔ اِس ہند کے اندر راجپوت کروڑوں میں ہوں گے۔ جاٹ کروڑوں میں ہوں گے۔ گوجر کروڑوں میں ہوں گے۔ یہاں ہندو بھی آپ کو راجپوت ملیں گے اور مسلمان بھی۔ ہندو بھی جاٹ ملیں گے اور مسلمان بھی۔ ہندو بھی گوجر ملیں گے اور مسلمان بھی۔ پنجابی اور مہاراشٹری میں بہت سا فرق ہو سکتا ہے۔ گجراتی اور آسامی میں پرایا پن کے بے شمار پہلو ہوسکتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے 'مفادات' کی یہ سوچ ہندو راجپوتوں اور مسلم راجپوتوں کو کبھی ایک نہیں کرتی؟ کیا ایک برادری نہیں؟ ہندو جاٹوں اور مسلم جاٹوں کو ایک نہیں کرتی؟ ہندو اور مسلم پنجابیوں کو مثال کے طور پر ہندو و مسلم مہاراشٹریوں کے مقابلے پر ایک نہیں کرتی۔ ہندو اور مسلم گجراتیوں کو ہندو و مسلم آسامیوں کے مقابلے پر ایک نہیں کرتی؟ شروع سے آخر تک وہ ایک ہی بات آخر یہاں کیوں ہے جو مسلم راجپوت کے مفاد کو ہندو راجپوت کے مفاد کے مقابلے پر لے آتی ہے؟ مسلم جاٹ کو ہندو جاٹ کے مقابلے پر ہی 'مفادات' کی فکر کرواتی ہے؟ مسلم گوجر کا 'مفاد' مسلم پٹھان کے ساتھ تو نتھی کرواتی ہے لیکن ہندو گوجر کے ساتھ اس کے 'مفاد' ہی کا بیر ڈال دیتی ہے۔ دَلِت (نیچ ذات) اور چودھری برادریوں کے مابین مفادات کا ٹکراؤ ہندوستان کی پوری ایک تاریخ رکھتی ہے۔ لیکن یہ تاریخی ٹکراؤ بھی اس نوبت کو نہیں آتا بلکہ اس کا خیال تک پیدا نہیں ہوتا کہ دونوں کے مفادات الگ الگ ملک کا تقاضا کرنے

لگیں۔ پس آپ نے جس بات کی 'نشاندہی' فرمائی وہ اپنی جگہ بجا، لیکن ہمارا تو سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے اس جنگل میں جہاں انسانوں کے مابین امتیاز کے بے شمار عنوان ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی امتیاز ان کے باہمی مفادات اس حد تک متصادم نہیں ٹھہراتا کہ ان کے مابین 'ملکوں' کا فرق ڈال دینے کو خود آپ بھی جائز کہیں... وہاں ایک فرق ایسا ہے جس نے ان کروڑوں انسانوں کے مابین 'مفادات' کو اس حد تک متصادم اور حسّاس کر دیا ہے کہ خود آپ نے یہ فتویٰ دے ڈالا کہ ان کو ملک الگ الگ کر ہی لینے چاہئیں تھے اور یہ مطالبہ قبول ہونے پر خوشیاں اور شادیانے ہونے چاہئیں! اور اس ایک "جائز فرق" کا نام ہے "ہندو اور مسلمان" جس پر آج سارا دن الحمد للہ آپ جشن مناتے رہے ہیں! **اس کو 'مفادات' کا فرق کہہ کر آپ نے درحقیقت کسی مسئلے کا حل نہیں کیا۔** وہ اصل سوال جوں کا توں ہے۔ آپ کا لبرلزم باقی ہر فرق کو مانتا ہے سوائے اس ایک بات کے جس کا آج آپ جشن مناتے رہے ہیں!

اور اگر کچھ نکتہ ور برصغیر میں "مسلمان اور ہندو" کے اِس فرق کی بابت جو خود ان کے بقول معاشی مفادات کے تصادم سے ملکوں کی علیحدگی تک جا پہنچا، یہ فرمائیں کہ 'مذہب' کا ڈالا ہوا یہ فرق جائز کب ہے، ہماری (لبرلز کی) نظر میں تو یہ افسوس ناک ہے کہ ان کروڑوں انسانوں کے مابین تفریق کے باقی سب عنوان پیچھے چلے گئے اور اس ایک ہی عنوان نے ان کو "دو قومیں" کر دیا۔ نیز یہ کہیں کہ واقعہ تو ایسا ہی ہے کہ 'مذہب' کے فرق نے دونوں کے مابین ایسی دوری ڈال دی کہ دونوں کے 'معاشی مفادات' ایک ساتھ نہ چل سکتے تھے، لہٰذا ہم (لبرل) اس کو ایک واقعے کے طور تو تسلیم کرتے ہیں مگر اصولاً تو 'مذہب' کی اٹھائی ہوئی اِس دوری کو ہم رد ہی کرتے ہیں... تو ہم ان سے کہیں گے کہ پھر یہ آپ کے عقیدے کے خلاف ایک واقعہ ہوا، تم نے سارا دن اس پر بھنگڑے کس بات کے ڈالے؟

ہماری مثال لے لو۔ بنگلہ دیش کے الگ ہونے کو ایک واقعہ کے طور پر تو ظاہر ہے ہم

مانتے ہی ہیں۔ لیکن 'بنگلہ دیش' کی کسی قرارد کے پیش ہونے کے دن ہم جشن نہیں منا رہے ہوتے بلکہ ایسا کوئی دن منایا جارہا ہو تو ہمارے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔

میں تم سے عرض کروں، بے شک میڈیا اس وقت تمہارا ہے، بلکہ شاید سب کچھ فی الحال تمہارا ہے... مگر 23 مارچ کے میوزک بجاتے وقت آج سارا دن تم پرائے میلے میں ناچتے رہے ہو، اور وہ ہمارا میلہ تھا، اگرچہ اِس وقت ہمارے ہاتھ میں کچھ نہ بھی ہو۔

تمہارا یہ سارے جشن منانا ہمارے لیے باعث مسرت ہوا۔ **'مذہب' کے اٹھائے ہوئے 'مفادات' کے ایک نزاع** پر تمہاری یہ خوشیاں چاہے دکھاوے کی ہوں اور تمہارا یہ رقص و سرود چاہے کسی نہ کسی حد تک غیر اسلامی ہو، باعتبارِ مضمون ہمارے ایک کیس کو ثابت کرتا ہے۔

فالحمد لله الذی سخَّرَ خصومَنا لقضیتنا

تحریر کا سوشل میڈیا لنک: https://goo.gl/vnkCk6

---

[i] خود ہماری خواہش ہے لبرل یہاں ہم پر معترض ہوں کہ سیکولر معنٰی کا رہن سہن ہندو کو پاکستان میں مکمل طور کب حاصل ہے جہاں وہ 'اقلیت' قرار دیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ تو اس لیے کہ ابھی پاکستان میں تمہاری مکمل چلتی نہیں ہے۔ خدانخواستہ جس دن تمہاری چلنے لگی اُس دن ریاستی معاملات میں ادیان کا یہ فرق ظاہر ہے ختم ہی تو کر دیا جائے گا۔ یہ تو تمہارے اس کیس کے خلاف دلیل ہوئی۔ یعنی ایک سیکولر پاکستان میں دونوں قوموں (ہندو و مسلم) کا معاملہ اگر ویسے ہی ہونا ہے جو ایک متحدہ ہندوستان میں ہوتا تو '23 مارچ' کے بھنگڑے آپ کس خوشی میں ڈالتے ہیں۔ آپ چودہ اگست منائیں، سمجھ آنے والی بات ہے۔ لیکن 23 مارچ؟ لبرل ہو کر، ادیان کی بنیاد پر اوطان!

23مارچ (قراردادِ پاکستان) پر لبرلز کی خوشی بنتی ہے!

تنقیحات

مدیر ایقاظ

23 مارچ پر ہمارے سوشل میڈیا فورمز پہ دی گئی ایک اور تحریر۔

23مارچ1940

'مذہب' کا فرق.. جو نجانے 'سیاست' میں گھس کیسے آیا۔ اوپر سے یہ قرارداد کہ خاص اِس بنیاد پر ایک ملک کو دو ملک کر دیا جائے۔ لبرل شریعت یہاں تڑپ کر نہ رہ جائے؟! 'مذہب' کو ایسی کوئی حیثیت رکھنے کی اجازت کب ہے!!!

'مذہب' کا ایک اختلاف.. جو برصغیر کے دو فریقوں کے مابین باقاعدہ ایک 'سیاسی' یا 'معاشی' جتھہ بندی کا موجب بنا۔

اور اگر اس کو 'سماجی' بھی کہہ دیں، یعنی "رہن سہن" کا دونوں کے مابین اتنا مختلف ہونا کہ دو الگ الگ ملکوں کی ضرورت مانی جائے، تو اور بھی پھنستے ہیں!

"شریعت" کو ہم فی الوقت بیچ میں نہیں لا رہے۔ مانیں گے ویسے ایک دن یہ شریعت کو بھی، ان شاءاللہ۔ (ہر چیز کے ساتھ از راہِ نفاق چلا جا سکتا ہے تو شریعت کے ساتھ بھی چل لیں گے جس دن اہل شریعت کے پاس وہ کچھ ہوا جس پر لبرلز کی رال بہے؛ کیا مدینہ میں پہلی صف کے اندر نہیں آ کھڑے ہوتے تھے!)۔ لہٰذا شریعت کی بات کسی اور وقت۔ فی الحال 'مذہب' کے اٹھائے ہوئے ایک اختلاف کو برصغیر کی دو جماعتوں (ہندو و مسلم) کے مابین صرف ایک

سیاسی یا معاشی یا سماجی علیحدگی کروا دینے پر ہی مبارکباد دے لیتے ہیں، لبرلز کے ساتھ مل کر!

یادش بخیر 'مذہب' کی اِس حیثیت ہی کے خلاف کیا اپنی پوری تحریک نہ تھی کہ مذہب 'انسانوں' کے مابین سیاسی یا سماجی دوریاں ڈلوانے والی چیز بنے تو آخر کیوں بنے؟ یا لوگوں کے مابین معاشی مفادات کا تصادم کروانے پر منتج ہو تو کیوں ہو؟! 'مذہب' کو ابتداءً اِس حیثیت سے ہی کیوں نہ فارغ کیا جائے! (لبرل ڈسکورس)

قراردادِ پاکستان جو 'مذہب' کو یہ اجازت دیتی ہے (خود اِن لبرلز کی تفسیرات کے مطابق) کہ یہ لوگوں کی سیاسی پہچان، یا معاشی مفادات کے ٹکراؤ یا سماجی فرق کے اندر بولنے لگے۔

"شریعت" کی بات فی الحال نہیں کرتے۔ مذہب کی یہ اِتنی حیثیت بھی کب ہے کہ وہ لوگوں کی سیاسی پہچان یا معاشی مفادات کے ٹکراؤ یا سماجی بُعد کی بنیاد بنے؟ مذہب کے 'انسانوں' کے مابین علیحدگیاں کروا دینے کے خلاف ہی تو اپنی یہ پوری (لبرل) تحریک تھی!

لیکن یہ کیا؟ "پاکستان" پر ہاتھ مار جانے کے لیے اور دین پسندوں کی یہاں سے چھٹی کروا دینے کے لیے... "یومِ پاکستان" پر خوشیاں! قراردادِ پاکستان کا دن منانے کے لیے لبرلز کے بھنگڑے! اسلام پسند ڈالیں تو بات ہے۔ لبرلز؟!

ہمارا دعویٰ ہے یہاں کا لبرل 23 مارچ کی قراردادِ پاکستان پر خوشی کے شادیانے بجا کر نہ صرف ایک کھلے تضاد کا شکار ہے، بلکہ اصولاً یہ اس کے حق میں منافقت ہے۔

ڈاکٹر جعفر شیخ ادریس (سوڈان کے ایک مفکر) نے صحیح کہا تھا: مغربی لبرل کے مقابلے پر دیسی لبرل میں جرأت کا شدید فقدان ہے!

اِسے تو صرف جو درز ملے، یہ اس کے اندر گھستا ہے۔ اور درز میں ہی رہتا ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ اسے وسیع کرنے کی کوشش کرتا ہے! البتہ میدان میں آکر اپنا عقیدہ بیان کرنا اِس کے بس کی بات نہیں۔ https://goo.gl/gikTK7

اسلامک ریپبلک آف گیمبیا

دار السلام برونائی کے بعد گیمبیا بھی اسلامی شریعت کے نفاذ پر گامزن۔

محمد زکریا خان

احوال و تعلیقات

اب جبکہ برونائی اور گیمبیا جیسے چھوٹے ملک ایمانی جرات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور ان ممالک نے اپنے عوام مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے اسلامی شریعت کے راستے کو اختیار کر لیا ہے۔ پاکستان جیسے بڑے ملک اس بات سے نہ شرمائیں اور اور اپنے برادر ملکوں کے نقش قدم پر چل کر اس ملک کے نظریے کو عملی جامہ پہنائیں۔

مغربی افریقہ کے ساحلی ملک گیمبیا کے صدر یحی جامہ نے دسمبر 2015 سے ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا ہے۔ اس سے پہلے صدر یحی جامہ نے کومن ویلتھ سے علیحدگی کا اعلان کیا تھا۔ کومن ویلتھ کی سربراہی برطانیہ کرتا ہے۔

جو لوگ مغربی میڈیا سے متاثر ہیں وہ گیمبیا کے صدر کے اس بیان کو دیوانے کی بڑ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ یحی جامہ ایسے ظریف قسم کے بیانات دیتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایڈز جیسی مہلک بیماری کے علاج کی بابت یہ اعلان کیا تھا کہ گیمبیا نے اس مرض کا علاج جڑی بوٹیوں سے دریافت کر لیا ہے۔

گیمبیا میں اسلامائزیشن کا معاملہ جڑی بوٹیوں جیسا نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گیمبیا کی اقتصادیات کا بہت کچھ انحصار مغربی سیاحوں کی آمد پر ہے۔ گیمبیا کے سفید ساحل سیاحت کے لیے زبردست کشش رکھتے ہیں۔ خاص طور پر برطانیہ کے سیاح یہاں کا بہت زیادہ

رخ کرتے ہیں۔ اسلامائزیشن کا مسئلہ ایک اور وجہ سے بھی سنجیدہ ہے کہ پچھلے سال صدر یحی کی غیر موجودگی میں دو امریکی شہریوں نے فوج کے ایک حصے کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی۔ یحی جامہ کے وفادار سپاہیوں نے اس بغاوت کو ناکام بنا دیا تھا۔ صدر کو ہنگامی طور پر بینجول (دار الحکومت) واپس آنا پڑا۔ صدر یحی جامہ نے اس بغاوت کے پیچھے امریکہ اور مغربی ملکوں کو الزام دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ سازش سینیگال کی مدد سے تیار کی گئی تھی۔

معاملہ اگر جڑی بوٹیوں جیسا ہے تو پھر گیمبیا کا تختہ الٹنے میں کسی ملک کی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کومن ویلتھ سے جو مراعات ملتی ہیں ان سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیوں کیا ہے۔ اور سب سے زیادہ مغرب کی طرف سے بذریعہ سیاحت جو زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے اس کی قربانی کیوں دی جا رہی ہے۔ گیمبیا غریب ملکوں کی نچلی ترین سطح پر ہے۔ اسلامائزیشن کے اعلان سے البتہ اب اعلی ترین سطح پر آ گیا ہے تبھی تو محض اس امکان کی وجہ سے پچھلے سال ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش ہوئی تھی۔ یحی جامہ کی سنجیدگی ایک اور امر سے بھی ظاہر ہے۔ گیمبیا میں اسلامائزیشن کا اعلان انہوں نے ٹھیک اس مہینے میں کیا ہے جب پچھلے سال 14 دسمبر کو ان کا تختہ الٹنے کی سازش کی گئی تھی۔ 11 دسمبر کا دن شاید جمعہ کی برکت کی وجہ سے چنا گیا ہو ورنہ 14 دسمبر کو اعلان ہوتا جس دن تختہ الٹنے کی سازش ہوئی تھی۔ معاملے کی صحیح تصویر سمجھنے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں اس ملک کے بارے میں بنیادی معلومات سے آگاہی ہو۔

مغربی افریقہ کے بڑے ملک سینیگال نے گیمبیا کو تین اطراف (مشرق شمال اور جنوب) سے گھیر رکھا ہے۔ ملک کی مغربی سرحد بحر اوقیانوس سے ملتی ہے۔ یہ وہی ساحل ہیں جہاں کے سفید ریتلے مناظر مغربی سیاحوں کو یہاں کھینچ لاتے ہیں۔ دو ملین (بیس لاکھ) سے کم آبادی پر مشتمل یہ ملک بر اعظم افریقہ کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔ اس کا موازنہ اگر پاکستان سے کیا جائے تو یہ رقبے میں پاکستان سے ستر گنا کم قریب غرب الہند کے جزیرہ جمیکا کے

برابر ہے۔ برطانوی استعمار سے 18 فروری 1965ء کو آزاد ہوا تھا۔ اب تک گیمبیا کے دو صدر ہوئے ہیں جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔ گیمبیا کا دریا جسے دریائے گیمبیا کہتے ہیں ملک کے وسط میں بہتا ہے۔ مشرق سے بہتا ہوا یہ مغرب میں بحر اوقیانوس میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ دریا اور اس کے کنارے کے ساتھ جنگلات ہوٹل اور دوسری دلکش عمارتیں بھی سیاحوں کو یہاں کھینچ لاتی ہیں۔ یہ دنیا کے ان چند دریائوں میں سے ایک ہے جہاں جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ دریائے سندھ کی طرح گیمبیا دریا بھی اس ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح اہم ہے۔ دریا کی دونوں جانب آبادی ہے اور اکثر کاروبار دریا اور سمندری پیداوار سے جڑے ہیں۔

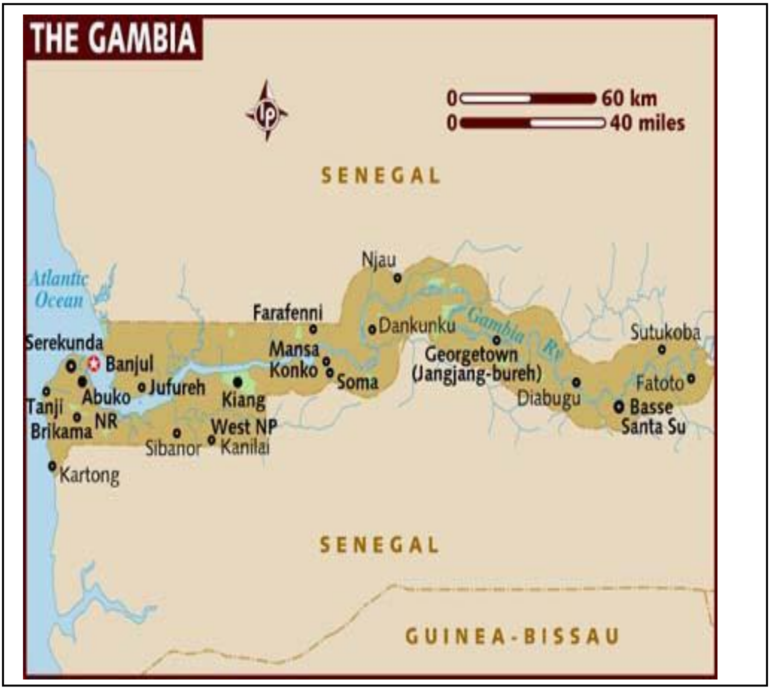

ملک کی ساری اراضی قابل کاشت نہیں ہے۔ جو زمینیں آباد ہیں وہاں مونگ پھلی کی کاشت ہوتی ہے۔ اس فصل کے علاوہ دوسری فصلیں جیسے باجرہ وغیرہ قابل ذکر زرعی پیداوار

میں شمار نہیں ہوتی ہیں۔ گلہ بانی بھی اس ملک کے مسلمانوں کا اہم پیشہ ہے۔ ملک کی اقتصادیات کا انحصار سیاحت اور بیرونی امداد پر ہے جس کے اب متاثر ہونے کا امکان ہے۔

یہاں کے طاقتور بازو اور مردوں کے چوڑے چکلے سینے ہمیشہ برطانیہ کے لیے بالخصوص اور یورپ کے لیے بالعموم اہم رہے ہیں۔ ماضی میں ان جوانوں کو غلامی میں جکڑنے کے لیے یورپی سیاح آتے تھے تو آج سیاحت اور جنس کی ماری میمیں ہمارے نیگرو جوانوں کو بے راہ روی میں مبتلا کرنے کے لیے یہاں آتی ہیں۔ غریب نیگرو شہریت کے لیے یا دو وقت کی اچھی غذا کے لیے میم کے تعفن کو برداشت کرتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ہمارا جوان عفت کے راستے پر چلتے ہوئے اس شیطانی چکر سے نکل جائے گا۔ یہ سرزمین پہلے پندرھوی صدی میں پرتگالیوں کی آماج گاہ بنی۔ ان کی دیکھا دیکھی فرانسیسی اور برطانوی اوباش بھی مہم جوئی پر نکل پڑے۔ بہت جلد پرتگالی تو بے دخل کر دیے گئے لیکن فرانس اور برطانیہ میں دریائے گیمبیا کے گرد و پیش میں ٹھنی رہی۔ ملک کی بے تکی تقسیم اس ہوس کی وجہ سے کئی مرتبہ ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں گیمبیا اتحادی ظالموں کا ایک اہم عسکری مرکز رہا تھا۔ جنگ کے بعد برطانیہ کو جہاں اپنی بہت ساری نو آبادیات سے دست بردار ہونا پڑا وہاں 1965ء میں گیمبیا بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔

آزادی کے بعد ملک میں انقلاب سے پہلے ایک ہی پارٹی حاکم چلی آ رہی تھی۔ People's Progressive Party (PPP) کی قیادت سابق صدر داودا جابرا Dawda Jawara کے پاس رہی ہے۔ سابق صدر جابرا کے اسلامی اقدار کی طرف لوٹنے کا واقعہ عالم اسلام میں نہایت قدر سے دیکھا گیا ہے۔ پہلے وہ اپنے نام کے ساتھ ڈیوڈ لگاتے تھے۔ 70 کی دہائی میں انہوں نے David کو داؤد سے شعوری طور پر بدل دیا۔ سابق پہلے وزیر اعظم اور پھر صدر جابرا میں نام اور رویے کی تبدیلی کو بعضوں نے یہ سمجھا ہے کہ جابرا ایک نو مسلم ہیں۔ ایک انٹرویو میں اسلامی اقدار کی طرف لوٹنے کا سبب بتاتے

ہوئے انہوں نے کہا تھا: كان الصوت يخرج من داخلي يقول لي عد إلى الطفل البريء الذي كان يجلس بين أيدي شيوخه ومعلميه يتلو القرآن (میرے ضمیر سے ہمیشہ ایک آواز نکلتی تھی۔ لوٹ اپنے معصوم بچپنے کی طرف۔ جب وہ مولوی صاحب اور ماسٹروں کے سامنے بیٹھا قرآن پڑھا کرتا تھا)

گیمبیا میں تبدیلی اب کی نہیں پہلے سے چلی آئی ہے۔ اس کی بنیاد وہاں کے قائد اعظم داود اجابرا نے رکھ رکھی ہے۔

نوجوان آرمی افسر یحی جامہ نے 1994ء میں بدعنوانی کو بنیاد بنا کر تیس سال سے قائم پی پی پی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ یحی جامہ کا پورا نام الحاج یحی عبد العزیز ناصر الدین جامہ ہے۔ (اکثر عربی سائٹ پر انہیں جامع لکھا گیا ہے)

انقلاب کے بعد سے اب تک صدر جامہ گیمبیا کے سربراہ چلے آرہے ہیں۔ وہ ایک اعتدال پسند انسان کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے حکومت کے خلاف کو کیا تھا لیکن یہ ایک پر امن انقلاب تھا۔ سوائے سابق پارٹی کے سیاسی معمولات پر پابندی کے انہوں نے کسی کو انتقام کا نشانہ نہیں بنایا۔ پچھلے سال جب دو امریکی شہریوں نے آرمی آفیسر سے مل کر تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی اس میں بھی جو تین لوگ سکورٹی ادارے سے مقابلے میں مارے گئے کسی اور کو قتل نہیں کیا گیا۔ ایک لمبے عرصے سے وہاں کوئی پھانسی کا واقعہ نہیں ہوا۔

صدر جامہ نے کچھ عرصے سے اسلامائزیشن کی طرف سنجیدہ اقدامات کیے ہیں۔ عربی زبان کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ کومن ویلتھ سے نکلتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اس سے استعمار کی یاد وابستہ ہے اس لیے ہم اس کا حصہ نہیں رہنا چاہتے۔

ملک میں اسلامی شریعت کے اعلان کے بعد صدر جامہ نے بہت کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ معمر قذافی کی طرح یہ میڈیا میں رہنے کی کوئی تدبیر ہے۔ ایک ویب

سائیٹ الالوکة نے ملک کے نامور عالم دین شیخ ابو بکر سید دابو کا انٹرویو نشر کیا ہے۔ شیخ نے بتلایا ہے کہ ہم ایک عرصے سے اسلام کی تعلیمات پر گامزن ہیں۔ آپ ہمارے ہاں خواتین میں پردے کے بڑھتے ہوئے رجحان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی شریعت کتنی اہم ہے۔ انہوں نے بتلایا کہ عربی پڑھنے کا رجحان بھی بتدریج بڑھ رہا ہے۔ جامعہ ازہر اور سعودی عرب سے انگریزی ترجمے والے قرآن مجید کے جتنے نسخے یہاں ہدیتاً بھیجے جاتے ہیں وہ یہاں کی ضرورت کے لیے کم پڑ جاتے ہیں۔ شیخ نے مصر سعودی عرب اور کویت کے کردار کو بھی سراہا ہے۔

یاد رہے کہ برادر ملک ترکی نے عسکری تربیت میں صدر جامہ کی مدد کی ہے۔ اس سے پہلے لیبیا یہ مدد فراہم کرتا رہا ہے۔

ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ کوئی دیوانے کی بڑ والا معاملہ نہیں رہنا چاہیے۔ ایک قدم وہ بڑھے ہیں تو چند قدم بڑھنا عالم اسلام کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی عمل میں شریک نوجوانوں اور سرگردہ اداروں سے التماس ہے کہ واقعات کو آئیڈیل کے طور پر دیکھنے کی بجائے حقائق اور توقعات کی نظر سے دیکھیں۔ بیس لاکھ سے بھی کم آبادی اور ایک بڑے شہر کے برابر رقبے والے ملک سے آپ کتنی بڑی توقع رکھ سکتے ہیں۔ اس تناظر میں بذریعہ ترکی جتنی مدد ہو سکے ہمیں اپنے بھائیوں کو خود مختار اور باوقار بنانے پر فراہم کرنا چاہیے۔

میری کرسمس.. 'مقاصدِ شریعت' یا قربِ قیامت؟

تنقیحات

مدیر ایقاظ

قربِ قیامت کیا کیا واقعات نہ ہوں گے!

وَسَیَعُودُ کَمَا بَدَأَ غَرِیبًا.. فَطُوبى لِلْغُرَبَاء!!!

فقہاء کے مواقف کو استہزاء کا نشانہ بنانا ایک معمول کی بات۔ کسی ایک آدھ فقیہ نہیں؛ اکٹھے مذاہبِ اربعہ کو!

کون صاحب لتاڑ رہے ہیں فقہائے مذاہبِ اربعہ کو؟ 'کوئی' ہونا اس کے لیے کیا ضروری ہے؛ جو بھی کالم لکھ سکتا ہو!

مذاہبِ اربعہ کی غلطی ویسے نکالی کس حوالے سے جا رہی ہے؟ کسی معمولی بات یا کوئی جزئی دلیل مِس miss کر جانے پر نہیں؛ بلکہ مقاصدِ شریعت ہی کو نہ سمجھ پانے کی بنا پر!

آپ کو معلوم ہے، شریعت کے دلائل یا شواہد کو دو اقسام کیا جاتا ہے: ایک جزئیات اور ایک کلیات۔ جزئیات جیسے ایک خاص مسئلے یا واقعے میں وارد ہونے والی کوئی دلیل۔ یہ کوئی متعین نص ہو سکتی ہے۔ یا شریعت میں وارد کسی متعین واقعے پر قیاس ہو سکتا ہے۔ فقہاء کے لیے اس سے دلیل پکڑنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ البتہ کلیات بے شمار ادلہ اور وقائع کے استقراء یا تتبع سے حاصل کیے جاتے ہیں؛ اور یہاں فقیہ کا خوب زور لگتا ہے۔ آپ جانتے ہیں، 'مقاصدِ شریعت' کا تعلق اسی دوسری صنف سے ہے۔ یعنی یہ "کلیات" میں آتی ہے۔ حق یہ ہے کہ 'مقاصدِ شریعت' میں کلام کرنے والے فقہاء بہت کم ہوئے ہیں۔ وجہ یہ کہ اس کے لیے نہایت اعلیٰ علمی پایہ درکار ہے؛ یہ عام فقیہ کے بس کی بات نہیں۔ متاخرین میں

سے غزالیؒ، شاطبیؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ وغیرہ ایسے کچھ ہی نام ملیں گے جنہوں نے اس مشکل وادی میں چل کر دکھایا ہے۔ زیادہ لوگوں نے، باوجود بڑے فقہاء ہونے کے، ادھر کا بہت زیادہ رخ نہیں کیا؛ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اتنے پانی میں نہ سمجھتے تھے۔ رَحِمَ اللّٰهُ امْرَءًا عَرَفَ قَدْرَ نَفْسِهٖ۔

یہ واقعہ صرف قربِ قیامت کے لیے باقی تھا کہ ایک کالم نگار فقہائے مذاہبِ اربعہ کی غلطی اور وہ بھی کسی معمولی بات پر نہیں بلکہ 'مقاصدِ شریعت' کو نہ سمجھ پانے کی بنیاد پر نکال کر دکھائے گا... اور اس کا وہ مضمون دھڑا دھڑ 'شیئر' اور 'ٹیگ' ہو رہا ہو گا!

ظاہر ہے اس سے بڑا لطیفہ ہم کریں گے اگر ہم اس کو جواب دینے چل پڑیں اور مقاصدِ شریعت سے اس کے 'استدلال' کی غلطی کو زیر بحث لائیں۔

رَحِمَ اللّٰهُ امْرَءًا عَرَفَ قَدْرَ نَفْسِهٖ۔

کالم نگار کا کہنا ہے، یہ فقہائے (مذاہبِ اربعہ) جو اپنے وقت کے شرکیہ مذاہب اور ان کے مذہبی شعارات سے بیزاری پر مبنی یہ فتاویٰ دیتے چلے گئے ہیں، یہ فقہاء اپنے اِس عمل سے دراصل اس بات کے ذمہ دار ہوئے ہیں کہ دنیا میں دینِ اسلام نہ پھیل سکے! ورنہ اگر فقہاء اُس دور میں نمازیوں کو بتلاتے کہ اپنا "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ... لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" اور 'تبرأتُ من الشرک والکفر' کا پڑھنا ذرا موقوف کر کے خدا کا بیٹا کہنے والوں کے ساتھ اُس مزعومہ 'خدا کے بیٹے' (معاذاللہ) کا برتھ ڈے کیک کاٹ کر آئیں تو آج اسلام دنیا میں چہار دانگ پھیل چکا ہوتا! اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کالم نگار کی رائے میں، فقہائے مذاہبِ اربعہ کا یہ وتیرہ خود اُن کے دور میں بھی تکبر اور غرور میں آتا تھا؛ البتہ وہ لوگ جو آج غربتِ اسلام کے دور میں بھی فقہاء کے اسی دستور پر باقی ہیں وہ خدا کے ہاں ان تین مبغوض ترین لوگوں میں آئیں گے جن میں – ازروئے حدیث – ایک وہ شخص ہے جو تنگدست ہونے کے باوجود تکبر کرتا ہے!

کالم نگار کے خیال میں فقہاء کی نظر نجانے کیوں اس طرف نہ جا سکی کہ سورۃ النساء کی ایک آیت میں ”تحیۃ“ (آداب تسلیمات) سے متعلق جو ایک بات آئی ہے اس میں (کالم نگار کے مطابق) شرک کا ایک شعار منانے والوں کو اُن کے اِس شرکیہ شعار پر مبارکباد دے کر آنا بھی باقاعدہ طور پر شامل ہے! (قاعدہ اگر یہی ہے کہ اس آیت میں کوئی کافر ہو یا مسلم، اس کے ہر قسم کے فعل اور تقریب پر مبارکباد دینے کا وجوب یا استحباب آتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس فعل کا تعلق کیسے ہی شرک یا معصیت سے کیوں نہ ہو... قاعدہ اگر یہی ہے تو معلوم نہیں کالم نگار کا فتوی شراب کی کسی گرینڈ پارٹی میں جانے والوں کو مبارکباد پیش کر آنے کی بابت کیا ہو گا؟ حضرت صاحب آیت کے عموم سے شراب پارٹی پر مبارکباد کے وجوب یا استحباب کو کس دلیل سے مستثنیٰ کریں گے!)۔ چونکہ فقہاء کو سورۃ نساء میں مذکور اِس ”تحیہ“ کے دائرہ کی سمجھ نہ آئی کہ وہ کہاں تک جاتا ہے (یا جا سکتا ہے!) لہٰذا اللہ کے بندوں (فقہاء) نے اتنی بڑی غلطی کی کہ ایک شرکیہ تہوار پر مبارکباد کو حرام قرار دے کر آیت کے مقصود کو معطل کر بیٹھے!

علاوہ ازیں، سورۃ الممتحنۃ کی آیت 8 (لَّا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ”جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا“)۔ اس آیت میں مذکور ”بھلائی اور انصاف کا سلوک“ کو فقہاء ظاہر ہے دنیوی معاملات پر محمول کرتے رہے، یعنی غیر حربی کفار کے ساتھ عام خوشی غمی، تحفہ تحائف، آنا جانا، میل جول اور معمول کا رہن سہن رکھنا اور ان سب معاملات میں ان کے ساتھ ایک نہایت اچھا اور مہربانی کا معاملہ کرنا۔ اور یہ وہ حسن سلوک ہے جو صحابہؓ کے وقت سے لے کر مابعد ادوار تک مسلم معاشروں میں غیر حربی کافروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے اور جس سے متاثر ہو کر اللہ کا شکر ہے

ڈھیروں کے ڈھیروں کافر اسلام قبول کرتے رہے، اور آج بھی ہم بجا طور پر ان کے ساتھ وہ حسن سلوک رکھنے کے داعی ہیں جو سورۃ الممتحنۃ میں ذکر ہوا... کالم نگار کے نزدیک فقہاء کا اِس 'بھلائی اور حسن سلوک' کو دنیوی معاملات تک محدود رکھنا اور اُن کے اعمالِ دین تک کھینچ نہ لے جانا غلط ہے! یہاں ہمارے دین کے عمومی اصول کہ جہاں تک کفار کے دین اور اعمالِ دین کا تعلق ہے تو ان سے ہمیں بہرحال بیزاری ہی رکھنی ہے (اگر کوئی حسن سلوک ہے، اور یقیناً ہے، تو اس کا تعلق عام دنیوی امور سے ہی رہے گا)... ہمارے دین کی یہ عمومی ہدایات کہ کفر کے اعمال اور شعارات سے ہماری علیحدگی اور بیزاری برقرار رہے، 'ہیومن ازم' کی بھاری خوراکیں لے چکے ذہنوں سے چونکہ محو ہیں... لہٰذا کالم نگار کے نزدیک الممتحنۃ کی اس آیت میں مذکور یہ "بھلائی اور مبنی بر انصاف سلوک" اُس وقت تک مکمل نہیں ہونے کا جب تک ہم دینِ کفر کے کسی مذہبی شعار پر ہی اپنی خوشی ظاہر کر کے نہ آئیں! یہ وجہ ہے کہ ان کے خیال میں فقہائے مذاہبِ اربعہ کا وہ مشہور فتویٰ جس میں وہ اہل کفر کے تہواروں پر تہنیت کو حرام ٹھہراتے ہیں، سورۃ الممتحنۃ میں مذکور "حسن سلوک" کے حکمِ شرعی کے ساتھ متصادم ہے!

اپنے صحافیوں کے ایک طبقے کا گویا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے ہاں کفار کے مذہبی تہواروں میں شرکت کرنے کی نوبت آنے سے جو رہ گئی (معاذاللہ) تو اغلباً اس لیے کہ صحابہؓ کو پالا ہی ایسے کافروں سے پڑا رہا جو حربی (اسلام کے خلاف جنگ کرنے والے) تھے! ورنہ کم از کم کچھ کافر اگر صحابہؓ کے دور میں اور ان کے زیر اقتدار خطوں میں ایسے بھی پائے جاتے جو امن کے ساتھ صحابہؓ کے جوار میں رہائش پزیر ہوتے تو آپ دیکھتے صحابہؓ کس طرح (سورۃ الممتحنۃ کی آیت نیز مقاصدِ شریعت پر عمل کرتے ہوئے) ان کے مذہبی تہواروں کو رونق بخش کر آتے ہیں! بس یہ ('میری کرسمس' کا) واقعہ اس وجہ سے ہونے سے رہ گیا کہ صحابہؓ کے دور میں غیر حربی کافر کہیں دستیاب ہی نہ ہو سکے تھے! اور

جب تک دستیاب ہوئے تب تک مذاہبِ اربعہ رونما ہو گئے تھے! سو سورۃ الممتحنۃ کی اِس آیت پر اکیسویں صدی تک عمل معطل رہا؛ اب کہیں جا کر آپ کو یہ 'حکم شرعی' بحال ہوتا ہوا نظر آتا ہے جب ہمارے کچھ جبہ بردار چرچ جا کر پادری کے ساتھ کھڑے کر سمس کاٹنے کی تصویر بنوا کر آتے ہیں! یہ ہے شریعت کی روح کو زندہ کرنا!

ظاہر ہے ہم کالم نگار کو کسی بات کا جواب نہیں دے رہے۔ اور نہ دینا بنتا ہے۔ البتہ یہ تجویز کریں گے کہ وہ اپنے 'مقاصدِ شریعت' اور اپنے فہمِ سورۃ الممتحنۃ کے ساتھ تصادم کو مذاہبِ اربعہ تک محدود نہ رکھیں۔ بیہقی، مصنف عبد الرزاق اور دیگر کتب میں حضرت عمرؓ کا یہ حکم نامہ آتا ہے کہ مسلمان کفار کے گرجوں میں ان کے تہواروں کے موقع پر نہ جائیں کیونکہ یہ خدا کے غضب کا محل ہیں۔ (یہاں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا حسن سلوک اپنی جگہ حق ہے مگر اس کا مطلب اُن کے مذہبی اعمال کے لیے قربت ظاہر کرنا نہیں ہے)۔ لہٰذا حق بنتا ہے کہ کالم نگار بحق ہیومن ازم دورِ صحابہؓ تک کی خبر لیں! اس اصلاح اور نظر ثانی کا دائرہ خاصا وسیع کرنا پڑے گا!

”سماجی مومنٹم“ اٹھانے کی فکر کیجئے: آپکے پاس بڑی قوت ہے 1

احوال و تعلیقات

مدیر ایقاظ

ملک میں آگے پیچھے لبرل ایجنڈا بر داروں کو خوش کرنے والے اقدامات، اور اسلام پسند تنظیموں کی پریشانی اور 'عین وقت' پر کچھ مبنی بر تشویش بیانات، میٹنگز وغیرہ، کے تناظر میں سوشل میڈیا پر ہماری دی گئی ایک تحریر۔

اسلامی تحریکیں انتخابی اکھاڑے میں اس وقت جو مرضی کر لیں (ہم بھی اس کے مخالف نہیں) لیکن اس کے آپشن یہاں فی الوقت نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اسلامی تحریکیں الیکشن جیتیں یا ہاریں (بلکہ ہمیشہ ہاری ہیں، جیتی کب ہیں) سیاست میں البتہ بہت بڑا بڑا کردار ادا کر جاتی رہی ہیں۔ اس نکتے پر براہ کرم غور فرمائیے۔ ”سیاست“ میں اپنے اثرانداز ہونے کے لیے یہ جس 'چیک' کو اللہ کے فضل سے بڑی کامیابی کے ساتھ کیش کرا لیتی رہی ہیں، وہ ہے ”معاشرے میں اسلام کی جڑیں“ اور ”اسلام کے حق میں پبلک موبلائزیشن“۔ اسی سے تحریکِ پاکستان کے وقت ”حالات“ نے اسلام کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ اسی سے دستور میں قراردادِ مقاصد اور تکفیرِ قادیانیت وغیرہ ایسے عظیم الشان اقدامات عمل میں لائے گئے، باوجود اس کے کہ دینی قوتوں کے اپنے ووٹ اُس وقت بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ اِسی سے آپ جہادِ افغانستان میں سرخرو ہوئے۔ اور اِسی سے بہت

سارے برج الٹے گئے۔ خدارا اس نقطے کو سمجھئے؛ ہم آج بھی طاقت کے دھانے پر بیٹھے ہیں۔

"سماجی مومنٹم" جو اسلام کے حق میں ہو اور پبلک میں اس کو ایک زبان میسر آ گئی ہو، آپ کی قوت کا راز ہے۔ یہ خودبخود سیاسی مومنٹم میں ڈھلتا ہے اور بھٹو جیسے 'لیفٹسٹ' بھی آپ کی رَو میں بہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر نواز شریف ایسے 'رائٹسٹ' بھی لبرل رَو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔[1] خدارا اس کا ادراک کیجئے۔ اور 'نواز شریف' کو موضوع بنانے کی بجائے اس جانب توجہ فرمایئے: لبرلزم کے مقابلے پر اپنی سیاسی جنگ کو انتخابی کھیل سے وسیع تر کر لیجئے۔ آپ کے آپشن بڑھ جاتے ہیں۔

***

چند ہفتوں کے دوران لبرل جہت کے پے در پے کئی اقدامات کے پس منظر میں، ہمارا چند ماہ پیشتر کا اداریہ (http://eeqaz.co/112015_idaria/) ایک بار پھر توجہ چاہتا ہے۔ اس کے چیدہ اقتباسات یہاں پیش خدمت ہیں:

***

قیامِ پاکستان کا مومنٹم اپنی پوری قوت کے ساتھ دو تین عشرے تک ہی چل سکتا تھا۔ یعنی ساٹھ، بڑی حد ستّر کی دہائی۔ یہ تو شکر کیجئے، کچھ اضافی توانائی اس کے بعد بھی اسے افغان جہاد کے دم سے میسر آئی رہی جو نوّے کی دہائی تک معاملہ اُسی رخ پر چلتا رہا بلکہ ضیاء الحق

---

[1] یہ بات غور طلب ہے اسلامی سیکٹر "شوکتِ اسلام" کی رَو اٹھا لینے کے نتیجے میں، بہت تھوڑی سیٹوں کے باوجود بھٹو سے بہت کچھ لے لینے میں کامیاب رہا۔ دوسری جانب ایم ایم اے کے وقت بہت ساری سیٹیں رکھنے کے باوجود یہ مشرف کو بہت کچھ دے کر چھوٹا۔ واضح بات ہے ایک مسلم ملک میں آپ کی قوت کا راز 'سیٹوں' سے بڑھ کر کسی اور چیز میں ہے، کاش اس بات کا ادراک کر لیا جائے۔ یہ تیز رفتار پسپائی فی الفور نہ روکی گئی تو کچھ بہت بڑے بڑے حادثے ہو سکتے ہیں اور آپ عشروں کے حساب سے پیچھے دھکیلے جاتے رہیں گے، خدانخواستہ۔

ایسی اسلام پسند شخصیت کے دم سے کچھ مزید توانا نظر آیا۔ ورنہ یہ فرق قیامِ پاکستان کے دو تین عشرے بعد ہی دیکھنے میں آسکتا تھا۔ اسلامی سیکٹر نے اس مومنٹم سے کچھ بروقت فوائد اٹھائے بھی۔ مثلاً قراردادِ مقاصد کی منظوری، 73 کے آئین میں اسلامی اجزاء کی شمولیت، قادیانیوں کی تکفیر، توہینِ رسالت کی سزا اور کچھ دیگر اسلامی امور کو ریاستی فورم سے پاس کروالینا۔ وقت سنبھال لینے کا یہ ایک اچھا ثبوت تھا۔ بلاشبہ یہ کام اُسی مومنٹم کے بل پر کر لینے کا تھا جب 'قرض خواہ' منہ میں زبان رکھتا تھا اور 'مقروض' اپنے آپ کو اس کا کچھ دَیندار مانتا تھا۔ اُس بھلے دور میں ہی یہ چیزیں اگر پاس نہ کروالی گئی ہوتیں تو آج جب 'قرض خواہ' حالات کے تیور دیکھتے ہوئے دبک گیا ہے بلکہ اپنے 'قرض' کی بات اونچی آواز میں کرنے پر 'حوالات' کا خطرہ محسوس کرنے لگا ہے... اسلامی سیکٹر آج نہ صرف اس پوزیشن میں نہیں کہ قراردادِ مقاصد یا قادیانیوں (ایسے 'معزز و بااثر شہریوں') کی تکفیر یا قانون ناموس رسالت وغیرہ ایسی 'بھاری' اشیاء پاس کرواکر دکھادے، اور نہ دُور دُور تک ایسا زور پا لینے کی اس کے ہاں کوئی صورت نظر آتی ہے، بلکہ ڈر یہ پیدا ہوگیا ہے کہ (خدانخواستہ) ایک مسلسل لبرل تخم ریزی کے نتیجے میں کوئی شاطرانہ کوشش اب اگر کسی وقت ایسی ہوتی ہے کہ ان اسلامی اقدامات کو ایک ایک کرکے 'ترمیمات' کی نیند سلادیا جائے تو اس کے آڑے آنے کے لیے مطلوب دم خم بھی شاید ہمارے اسلامی سیکٹر کے اندر موجود نہیں۔ یعنی وہ چیزیں جو اُن بھلے وقتوں میں پاس کروالی گئی تھیں آج ان کو بچا رکھنا ہی تقریباً ایک چیلنج ہے۔ یہ ناتوانی 'سیٹوں' کی سلاجیت سے نہ جائے گی اور نہ ایم ایم اے یا ملی یکجہتی ایسی کسی بے فائدہ مشقت سے۔

”سماجی مومنٹم“ اٹھانے کی فکر کیجیے: آپکے پاس بڑی قوت ہے 2

احوال و تعلیقات

مدیر ایقاظ

چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا لہٰذا اس ملک کی قیادتیں ایک عرصے تک اپنے آپ کو اسلام کا زیربار سمجھتی رہی ہیں۔ یہ ایک اچھی چیز تھی مگر کافی اُس وقت بھی نہیں تھی۔ نیز یہ اپنی اُس فائدہ دہی کے اعتبار سے وقتی ہی ہو سکتی تھی۔ پس یا تو عین اُسی ہلے میں ملک کو اسلام کی پٹڑی پر چڑھالیا گیا ہوتا؛ اور پھر ملک کا اپنا دستور اور نظام ہی ایک ایسا تسلسل بن جاتا کہ ہر نئے آنے والے کو اسلام کا پابند ہی ہو کر رہنا پڑے (جیسا کہ ہماری اسلامی تاریخ میں بڑی صدیوں تک رہا کہ جو بھی آئے، خواہ جائز طریقے سے خواہ ناجائز طریقے سے، نظامِ مملکت اسلام ہی ہو)۔ یہ بہرحال کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاہم جب ایسا نہیں ہوا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ملکی قیادتوں کو ”نفاذِ اسلام“ کے حوالے سے آپ قیامت تک اُس ایک نعرے کا قرض یاد دلاتے چلے جائیں جو ملک کے قیام کے وقت یہاں کی قیادتوں نے ایک بار لگا لیا تھا؟

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ حکمرانوں کو آپ ان کا وہ اسلامی نعرہ یاد نہ دلائیں جو انہوں نے قیامِ پاکستان کے وقت زور و شور کے ساتھ بلند فرمایا تھا۔ ”پاکستان کا مطلب کیا؟“ پر ضرور ان کو جھنجھوڑیں۔ حسبِ مقدور ان کا گھیراؤ کریں۔ اُن لاکھوں شہیدوں کی جانب سے ان کا گریبان پکڑیں جنھوں نے محض اسلام کی خاطر یہ اتنا سارا خون دیا تھا نہ کہ اِن کے اللوں تللوں اور اِن کی الیکشن باریوں کے لیے۔ مگر یہ وہ قرض ہے جس کی سند تک غائب کرائی جارہی ہے اور اس کے لیے ایک نئی انتھروپالوجی پڑھانے والے چینل وجود میں لائے جاچکے ہیں... جو یہ سوال اٹھانے لگے کہ قیامِ پاکستان کا محرک اسلام کب تھا! جنھیں خوب معلوم

ہے کہ ان کے سامنے اب وہ نسل نہیں جس نے پاکستان بنایا یا بنتے دیکھا تھا؛ بلکہ یہاں اُس کی پوتا یا پڑپوتا نسلیں ہیں جن کا حافظہ (memory) ہی تعلیم اور ابلاغ کے کمپیوٹر میں کہیں اُڑ گیا ہے۔ یہ ایک کمال 'سافٹ ویئر' انجینئرنگ ہے؛ جبکہ تعلیمی اور ابلاغی ساہوکار کی سب ٹریننگ اسی میدان میں رہی ہے؛ اور اب اپنی اس محنت پر اس کو ناز بھی ہے۔ پس ایک ایسا قرض جو لگ بھگ ایک صدی پرانا ہو اور جس کی سند بھی ڈھنگ سے لکھی گئی اب نہ ملتی ہو، بلکہ باقاعدہ ایسی 'اَسناد' اس کے مقابلے پر تیار کرالی گئی ہوں جو ایسے کسی قرض کو ہی ناثابت کر ڈالیں... غرض سو سال پرانا ایک قرض جس کی سب حیثیت اب زبانی کلامی رہ گئی ہو اور جسے 'مُلا کا وہم' یا شاید 'مُلا کی دھونس' قرار دیا جانے لگا ہو، اور جس کو منوانے کے لیے اب نہ کوئی مضبوط وکیل ہمارے پاس رہ گیا ہو اور نہ کوئی ڈھنگ کا چینل یا فورَم یہاں پایا جاتا ہو، ایک ایسا قرض آخر کب تک کسی کو زیربار رکھنے میں کامیاب رہ سکتا ہے؟ لازماً اس میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب دَیندار قرض خواہ کو اُلٹا آنکھیں دکھانا شروع کر دے؛ اور شاید یہ وقت ہماری قومی زندگی میں آچکا ہے۔

اسلامی سیکٹر کو لازماً سماجی قوت کے کچھ اضافی امکانات کا بندوبست کرنا ہوگا؛ حکمرانوں کو محض 47ء والے 'قرض' کی یاددہانی اب کافی نہیں۔ بے شک اِس یاددہانی میں بھی سستی نہ ہونی چاہئے۔ یہاں؛ وہ سبھی ساز اور سُر ضرور از سرِنو چھیڑے جائیں جو تیس اور چالیس کے عشروں میں اسلامیانِ برعظیم ہند کو نئی منزلوں کی جانب گام زن کرنے کے لیے اقبال و دیگر عمائدینِ ملت نے قوم کے وجود میں چھیڑ ڈالے تھے۔ مگر اِس ادراک کے ساتھ کہ اِس عمل کی نتیجہ خیزی اب ایک حد تک ہی ہو گی۔ سماجی طاقت کے کچھ ٹھوس عوامل[1] کا

---

[1] اسلامی سیکٹر کن ذریعوں سے طاقت کے کچھ موثر عوامل تک رسائی پا سکتا ہے، اس پر ہم نے اپنے جولائی 2015 کے اداریہ میں کچھ روشنی ڈالی ہے، بہ عنوان ''فاعلیت کا فقدان''۔

آپ کی پشت پر ہونا ناگزیر رہے گا؛ اور اصل اُمید ان ٹھوس عوامل کے ساتھ ہی رکھنا ہو گی۔ گو اندیشہ یہ ہے کہ اسلامی سیکٹر اپنی حالیہ ناتوانی کے سبب، اور ایک خرانٹ دین بیزار میڈیا کے ہوتے ہوئے، تحریکِ پاکستان کے وہ اسلامی سُر بھی شاید ہی یہاں چھیڑ پائے۔ ہمارا یہ اسلامی سیکٹر تو میڈیا کے حربوں کو سمجھنے میں فی الحال ناکام جا رہا ہے؛ اسے مات دینے کی توقع اس سے کیونکر رکھی جائے؟

یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ زمانی طور پر ہم جیسے جیسے قیام پاکستان والی دَہائی سے دور ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ہم اپنی پشت پر موجود اُس مومنٹم کی طاقت کھوتے چلے جائیں گے جو گزشتہ صدی کے وسط میں اِس قوم کو "سوئے حرم" لے چلا تھا۔ تاثیر کے کچھ اضافی اسباب ہماری ناگزیر ضرورت ہے۔ تیار رہنا چاہئے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات ہمارے حق میں پہلے سے زیادہ بے رحم ہو سکتے ہیں۔

یہ سب کچھ.. اور ابھی فتویٰ نہیں لگایا!

احوال و تعلیقات

مدیرِ ایقاظ

ایک مخصوص سوچ جو ایسے ہر موقع پر لازماً پھوٹ آتی ہے۔ اِس حوالہ سے سوشل میڈیا پر دی گئی ہماری ایک تحریر:

دین سے متمسک نوجوانوں کو بڑے عرصے سے ایک طبقہ یہاں 'توحید' کے نام پر کنفیوز کرتا آرہا ہے۔ کوئی دوسرا تیسرا سوال آج مجھے اس مضمون کا موصول ہو رہا ہے کہ ممتاز قادری مرحوم کا جنازہ پڑھ کر کیا ہم نے گناہ تو نہیں کر لیا؟ اس کے حق میں دعائے مغفرت کرنا یا اس کے لیے 'رحمہ اللہ' کا لفظ بول دینا کیا صریحاً حرام اور ہمارے عقیدہ کی خرابی کا موجب تو نہیں ہو چکا؟

ظاہر ہے عقیدہ کس کو پیارا نہیں؟!

خاص ان نوجوانوں کے خیال سے جنہیں 'توحید' کے نام پر ایسی بحثوں میں الجھایا جارہا ہے، میں اس پر چند کلمات کہہ دیتا ہوں۔ البتہ اس (کنفیوز کرنے والے) طبقے کی کوئی خدمت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ وقتاً فوقتاً یہ صریح انداز ہمارے پیجز پر اس طبقہ کی بابت اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ قاضی حسین احمد رحمہ اللہ کی وفات پر ہم نے خالصتاً دعائیہ پیرائے میں مرحوم کے لیے خدا سے جنت اور بلندیِ درجات کی دعاء کی تھی۔ (ہمارے فیس بک پیج پر دیا گیا ایک سٹیٹس، جو شاید اب بھی دستیاب ہو)۔ اس پر یہ حضرات عین موقع پر ہمیں یاد دلانا نہیں بھولے کہ دوزخ میں جانے کا بھی امکان تو ہے! ایسے بے رحم لوگوں کے ساتھ آپ کیا بحث کریں گے؟ بھائی یہ آپ کو مسلسل اِس 8 کے ہندسے میں گھمائیں گے: نہ

یہ مرحوم کو مشرک کہیں گے۔ نہ یہ اُس کو مسلم مانیں گے۔ نہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ معتزلہ کے 'منزلۃ بین المنزلتین' پر ہیں (یعنی ایک آدمی کو نہ مشرک کہنا اور نہ مسلم؛ بلکہ ان 'دونوں کے بیچ میں کچھ' ماننا۔ معتزلہ کی ایک معروف بدعت)۔ 'تکفیری' کے الزام سے بچنے کے لیے یہ اُس کو 'مشرک' کہنے پر بھی معترض ہوں گے، لیکن اس کو 'مسلم' کہہ دینے پر سراپا احتجاج بھی ہو جائیں گے! اور پھر صرف اتنا نہیں کہ خود اس کے لیے رحمت اور مغفرت کے الفاظ نہیں بولنے۔ ہمیں بھی اس سے روکنا ہے۔ حرام جو ہے! اُس کے لیے استغفار کر لینے پر آدمی کو 'عقیدے' کی باقاعدہ فکر کروا دینی ہے! (شاید آپ جانتے ہوں، 'رحمہ اللہ' کے خلاف یہ تحریک کہاں تک پہنچتی ہے اور مختلف ادوار کے کیسے کیسے شہداء و صالحین اس کی زد میں آتے ہیں)۔ سب کو سورۃ توبہ کی ایک آیت کا مصداق ٹھہراتے ہوئے!

حیرت یہ کہ دلیل سورۃ التوبہ کی آیت مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ سے جو ایسے بدکاروں کے لیے استغفار کو حرام ٹھہراتی ہے جو صاف مشرک ڈیکلیئر ہو چکے اور جو قطعی طور پر ملت سے خارج ہیں۔ دلیل وہاں سے۔ اور اس کا اطلاق اُن بھلے لوگوں پر جن کو یہ خود بھی مشرک ڈیکلیئر کرنے پر تیار نہیں! بحث یہ کہ اُس بھلے آدمی کے پاس (ان لوگوں کے خیال میں) کوئی عذر نہیں بچ گیا تھا۔ بھئی اگر عذر نہیں بچ گیا تو کرو بسم اللہ، اس کو 'وہ' کہہ دو جس کے لیے استغفار شریعت میں حرام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ جرأت بھی نہیں۔ 'احتیاط' اس قدر دامن گیر ہے کہ اس کو 'وہ' کہے بغیر ہی اس کے لیے استغفار حرام ٹھہرا دینا ہے! آخر اس بات کی دلیل؟ آیت کوئی اور بات کرتی ہے: ایک شخص جو مشرک ہے۔ آپ ایک اور بات کرتے ہیں: 'ہم نے تو اس کو مشرک کب کہا ہے'! تو پھر یہ کوئی اور شخص ہوا۔ 'وہ' تو نہ ہوا جس کی بابت آیت بات کرتی ہے۔ آیت ہے مشرک کے بارے میں، یعنی کافر۔ مشرک آپ اُس کو کہتے نہیں۔ لیکن حکم اُس کا عین وہی جو آیت میں ایک (ڈیکلیئرڈ) مشرک کے لیے آیا ہے! آپ کو اِدھر سے پکڑیں، آپ اُدھر

چلے جاتے ہیں۔ اُدھر آپ کو مرحبا کہنا چاہیں آپ اِدھر گھوم آتے ہیں۔ حکم نہیں لگانا، چھوٹ دینی ہے (بعد اس کے کہ اس کا کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا!)۔ اور (یہ چھوٹ مرحمت فرما رکھنے کے بعد) پکڑ اس کی وہ کرنی ہے جو حکم لگے (ڈیکلیئرڈ) شخص کی کی جاتی ہے (کسی پر 'مشرک' کا حکم لگانے کا مطلب ہی یہ کہ: اس کو بطور مسلم ملی رہنے والی چھوٹ ہمارے یہاں اب ختم ہو چکی)!

یعنی 'حکم' لگانے کو تو (بظاہر) سکِپ skip کرنا ہے۔ جو کہ ان (باقی ماندہ) احکام کی طرف جانے کا اصل دروازہ ہے۔ البتہ ('حکم' لگانے والی جگہ سے ایک بڑی چھلانگ بھرتے ہوئے اور پیر زمین کو نہ لگنے دیتے ہوئے) وہاں جا پہنچنا ہے جہاں حکم لگانے کے بعد ہی پہنچا جاتا ہے! یعنی ایک حکم لگ جانے کے لوازم کو بغیر وہ حکم لگائے ہی لازم کر دینا اور باقاعدہ لوگوں کو ان (لوازم) کا پابند کرتے پھرنا!!! ایسے لطائف بھی یہاں ہوتے ہیں! کوئی پوچھے، اس کی بنیاد؟ فرمائیں گے، میں اس کے لیے کوئی عذر جو نہیں پاتا! ویسے مہربان اتنا ہوں کہ آپ نے دیکھا میں نے اُس پر 'مشرک' کا حکم تھوڑی لگایا ہے! میں نے تو اُسے مشرک قرار دینے سے پہلے اُس پر صرف وہ احکام لگا دیے ہیں جو مشرک قرار پانے کے بعد ہی اُس پر لگنے کے تھے!

مختصراً، اُس ایک حکم کو زبان پر لانے سے پرہیز ہے جس پر (شرعاً) ان تمام احکام کا انحصار ہے جو یہ فرفر لگاتے ہیں!

کافر کہے بغیر ہی تمام احکام آدمی پر کافروں والے لگا دو، نہ آپ پر 'تکفیری' ہونے کا گناہ آیا اور نہ اُس بیچارے کے احکام 'مسلمانوں' والے[1] رہے! بس اس کے لیے اتنی سی علمی

---

[1] ''مسلمانوں والے'' کچھ موٹے موٹے احکام جو بعض احادیث میں بصراحت بیان ہوئے: جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے میں چلنا (اُس کے لیے دعائے مغفرت)۔ وہ سلام کہے تو اس کا

بے قاعدگی مطلوب ہے کہ وہ ایک لفظ مت بولو جس پر باقی سب لفظوں کا انحصار ہے!!! کسرِ نفسی اور فراخدلی بھی رہی: بہت سارے حکم لگا کر بھی ابھی یہ کوئی 'حکم' نہیں لگا رہے ہوتے! ایک معیَّن آدمی کے حق میں بس دعائے مغفرت کرنے کو جملہ مسلمانوں کے حق میں حرام اور خود اُس معیَّن شخص کے لیے امکانِ نجات کو معدوم [2] ٹھہرا دیا ہے، کوئی فتویٰ تھوڑی لگایا ہے۔ 'فتویٰ' کے سر پر تو بڑے بڑے سینگ ہوتے ہیں، خدا کا شکر ہے آپ نے کبھی وہ نہیں دیکھا!

*****

اسی پوسٹ کے نیچے ہمیں موصول ہونے والا ایک سوال:

یہ... حضرات ایک اور پراپیگنڈہ بھی فرماتے ہیں کہ رحمہ اللہ کہنے والے اور جنازہ پڑھنے والے لوگ یہ 'حرکتیں" مصلحت کے باب میں کرتے ہیں۔ یعنی ان کا گمان ہوتا ہے کہ اصلاً یہ لوگ بھی "وچوں" "وہ' ہی سمجھتے ہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہیں لیکن سیکولرز کے خلاف محاذ کی مصلحت کی وجہ سے کسی کو شہید قرار دے رہے ہوتے ہیں کسی کو رحمہ اللہ۔ یہ

جواب دینا (ایک حدیث میں: اس کو از خود سلام کہنا)۔ بیمار پڑے تو عیادت کرنا۔ وہ تمہاری دعوت کرے تو اسے قبول کرنا۔ چھینک لے تو اُسے یرحمک اللہ کہنا۔ مشورہ مانگے تو اسے خیر خواہی والا مشورہ دینا۔ مدد مانگے تو اسے مدد دینا۔ (یہ سب کچھ ظاہر ہے استطاعت سے مشروط ہے)۔ غرض ایک بھرپور سماجی قربت و یگانگت۔

[2] ایک آدمی کی مغفرت کا اگر امکان ختم نہیں ہے تب تو ظاہر ہے ہم اللہ سے یہ منت سماجت کر سکتے ہیں کہ یہ آدمی اس فریق میں سے ہو جسے نجات ملے گی۔ شریعت ہمیں ایسے ہی آدمی کے لیے بخشش مانگنے سے روکے گی جس کی بابت خدا نے نجات کا امکان ہی ختم کر ڈالا ہو۔ یعنی جب ایک بات کا امکان ہی نہیں تو اس کے لیے دعاء کیسی؟ یہ ہے 'مشرک' ڈیکلیئر کر دیے گئے شخص کے لیے دعائے مغفرت سے ممانعت۔

ہمارے حق میں ان کا سوء ظن نہیں حسن ظن ہوتا ہے!!!! اور ہم سادے لوگ اس قسم کی "مصلحت" جن کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی کہ جس کے تحت کسی کو "شہید" قرار دیا جا سکتا ہو۔ شہید کی ایک اور قسم "مصلحتاً شہید"!!! ویسے مصالح کا یہ "استعمال" بھی فقہ کا ایک نیا باب بن سکتا ہے۔ https://goo.gl/Ltmlau

جواب:

یعنی زندہ اور اِن کے اپنے دور میں موجود لوگوں کی بابت اِن کی افسانہ نگاری کا یہ حال ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جانا چاہئیے جب یہ ابن تیمیہ وغیرہ ایسی گزری ہوئی شخصیات کو کسی موضوع پر اپنی تائید میں لے کر آتے ہیں اور اس میں یہ جمہور علمائے توحید کے موقف سے ہٹے ہوتے ہیں!

کوئی پوچھے یہ بات اُن لوگوں نے اپنے 'باطنی' عقیدہ کی بابت اِن حضرات کو خود بتائی ہے یا یہ ان کی خودساختہ ترجمانی ہے؟

اس طرزِ عمل سے مجھے اہل کوفہ کی وہ افسانہ گری یاد آجاتی ہے جو وہ اہل بیت کی غیر موجودگی میں ان کے 'بی ہاف' پر کرتے تھے۔ اہل بیت کی وہ بالکل واضح بات جو ان خودساختہ ترجمانوں کے پھیلائے ہوئے افسانوں کے خلاف پڑتی، کسی 'نادیدہ مصلحت' کے کھاتے میں ڈال کر 'آئی گئی' کر دی جاتی اور "اصل بات" وہی باور کرائی جاتی جو یہ (خودساختہ ترجمان) اہل بیت کی بابت اُن کی غیر موجودگی میں لوگوں کے اندر پھیلاتے رہے تھے۔ غرض پورا ایک باطنی منہج یہاں سے نکل آیا: اہل بیت خواہ قسمیں اٹھالیں، سادہ لوح پیروکاروں کو پوری عقیدت کے ساتھ اس کا اعتبار کرنے سے انکاری ہو جانا ہو گا اور اس کی 'تفسیر' اہل کوفہ کے ہاں جا کر ڈھونڈنا ہو گی!

مفتی تقی عثمانی کی ایک عبارت پر اعتراض کا جائزہ

تنقیحات

حامد کمال الدین

سوال:

جمہوریت پر آپ بھی وقتاً فوقتاً قلم اٹھاتے ہیں۔ حضرت العلام مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جمہوریت پر میری نظر میں ایک نہایت خوب نقد کرتے ہوئے، یا شاید حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کے ضمن میں، اغلباً کہیں لکھ رکھا ہے:

"جمہوریت کا سب سے پہلا رکن اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرت رائے کی بنیاد پر ہوا ہو، وہ واجب التعمیل اور ناقابل تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ کثرت رائے کے اس فیصلہ پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اگر دستور حکومت عوامی نمائندوں کے اختیار قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کر دے (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن وسنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لیے واجب التعمیل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لیے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرت رائے نے عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر کثرت رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔" (حکیم الامت کے سیاسی افکار، ص ۱۸)

https://www.facebook.com/ammar.nasir.71/posts/10208576523475005

حضرت مفتی صاحب کے اس بیان پر نقد کرتے ہوئے کسی سیاق میں جناب عمار ناصر صاحب نے لکھا ہے:

یہ نکتہ پہلے سے بھی بڑھ کر عجیب بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ دین وشریعت بلکہ دنیا کے کسی بھی قانون یا ضابطے کی پابندی قبول کرنے کا آخر وہ کون سا اسلوب یا پیرایہ ہو سکتا ہے جس میں یہ امکان موجود نہ ہو کہ کل کلاں

کو پابندی قبول کرنے والا اس کا منکر ہو جائے گا؟ مثال کے طور پر ایک شخص کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرتا ہے تو اسے اس بنیاد پر مسلمان تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مرضی اور آزادی سے یہ فیصلہ کیا ہے، حالانکہ اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ کسی وقت اسی آزادی کی بنیاد پر اسلام سے منحرف ہونے کا فیصلہ کر لے۔ اب کیا اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ چونکہ کل کلاں کو وہ اپنی مرضی سے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے، اس لیے آج اس کے کلمہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی نفسہ واجب الاتباع نہیں سمجھتا، بلکہ اپنی ذاتی پسند اور مرضی کی وجہ سے قبول کر رہا ہے؟ دنیا کے ہر معاہدے اور ہر ضابطے کی پابندی کی بنیاد اسی آزادی پر ہوتی ہے جو انسانوں کو حاصل ہے اور جو آج کسی پابندی کے حق میں اور کل اس کے خلاف بھی استعمال ہو سکتی ہے، لیکن ہم اس آزادی کے منفی استعمال کے بالفعل ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی مستقبل کے امکانی مفروضوں کی بنیاد پر حال میں یہ قرار نہیں دیتے کہ فلاں شخص یا گروہ درحقیقت اس قانون یا ضابطے کو فی حد ذاتہ واجب الاتباع ہی تسلیم نہیں کرتا۔

https://www.facebook.com/ammar.nasir.71/posts/10208576557755862

آپ کیا سمجھتے ہیں کیا واقعتاً حضرت مفتی تقی عثمانی کی عبارت میں کوئی جھول ہے یا عمار خان ناصر صاحب کی تنقید اس پر بے جا ہے۔

جواب:

عبارت مذکورہ حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہ کے خیالات ہیں یا حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے افکار، ہم طالبعلموں کی نظر میں یہ ایک نہایت درست اور حق بات ہے۔ شریعت کے مرتبہ و مقام کی بابت اہلِ دین کے اعتقاد کی بالکل صحیح عکاسی حضرت مفتی تقی عثمانی کی اس عبارت کے اندر ہوئی ہے۔ مشرق تا مغرب علمائے عقیدہ نے دورِ حاضر کے ایک جدید تصور 'جمہوریت' پر بلاشبہ ایسا ہی نقد کر رکھا ہے۔ اس عبارت یا اس سے پھوٹنے والے کسی پہلو کو مضحکہ خیز جاننا (اگر محترم عمار صاحب نے فی الواقع ایسا کہا ہے) میرے نزدیک علمائے اسلام اور فقہائے مغرب ہر دو کے پیراڈائم کے عدم ادراک کا نتیجہ ہو گا۔

مفصل گفتگو تو اس موضوع پر کسی اور وقت کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم اس پر چند کلمات ہی کہہ سکیں گے، مگر ایک مختصر مقدمہ کے بعد۔

مقدمہ: کسی بھی رائج نظام سے، خواہ وہ جمہوریت ہو یا کچھ اور، نفاذِ شریعت کی خاطر آپ کو سرِ دست جو مل سکتا ہو اسے چھوڑ دینے میں اگر اہل اسلام کا نقصان نظر آتا ہو تو اندریں حالات اسے لے لینا اور بات ہے (اور صحیح ہے)۔ یہاں تک کہ ایک 'دی ہوئی صورتحال' a given situation میں اس کو سراہا بھی جا سکتا ہے۔ 'بسا غنیمت' بھی باور کیا جا سکتا ہے۔ مَا لا یُدرَكُ كلُّه لا يُترَكُ جُلُّه کے باب سے۔ تاہم اُسے حق ہونے کی سند دینا بالکل اور بات ہے۔ ایسی سند البتہ اسے تبھی دی جا سکتی ہے جب وہ شرعِ آسمانی کے تابع ہو اور **خدا اور رسولؐ کا فرما دینا وہاں آپ اپنی ذات میں آئین** ہو.. اور تمام متنازعین کے مابین عند الاختصام اس کا حوالہ بھی خدا اور رسولؐ کا فرمانا ہو نہ کہ اس کی کوئی فی زمانہ 'ریپلیسمنٹ' replacement۔ "جماعت" یا "سوسائٹی" کی سطح پر "اسلام" جس رویہ کا نام ہو گا وہ ہے ہی یہ کہ تمام متنازعات میں، اور تمام مختصمین کے یہاں، حوالہ "اللہ و رسول" ہوں (فقہاء یا کوئی مجلسِ علماء وغیرہ اگر کسی حد تک آئے گی تو وہ محض اس "حوالہ" کی درست و معیاری تعبیر کے باب سے)۔

پس یہ دو باتیں ہوئیں۔ ایک: کسی نظام میں نفاذ شریعت کے لیے کچھ گنجائش پاتے ہوئے اسے قبول کرنا (تاہم اس کے شریعت سے متصادم جوانب کو بدستور غلط ہی ماننا، جیسا کہ ہمیں مفتی تقی صاحب کے ہاں نظر آتا ہے)۔ دوسرا: اس کو عین حق ہونے کی سند دے ڈالنا۔ حضرت مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ یا حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کی محولہ بالا عبارت ان دو باتوں کے فرق کی روشنی میں سمجھنی چاہئے۔ کیونکہ اسے نظر انداز کرنے سے بھی کچھ مفاسد جنم لے سکتے ہیں؛ اور فی الوقت یہاں انتہا پسندوں کا غلغلہ ہے۔

اب ہم اصل موضوع پر آتے ہیں۔

فاضل معترض یہاں جس چیز کو نظر انداز فرما رہے ہیں وہ ہے کسی انسانی اجتماعیت کو "پابند

کرنے والا مطلق حوالہ" An Absolute Binding Reference؛ جس سے وہاں کا اجتماعی سیٹ اپ اپنے حق میں سندِ جواز پاتا ہے (derives its legitimacy)۔ اِس پوائنٹ پر اسلامی اور مغربی پیراڈائم کو گڈمڈ کر دینے کے باعث فاضل معترض ایک بات پر تعجب در تعجب فرمارہے ہیں۔ التزام اور اطاعت binding کا یہ "مطلق حوالہ" وہ چیز ہوتی ہے جو ایک قوم کی اجتماعی زندگی میں ہر ہر چیز کو، ہر ہر صورت میں، اووَررائیڈ override کرے؛ اور وہاں پائی جانے والی ہر مخلوق کا ہر اختیار اور ہر تصرف اس ایک حوالہ کے تابع (subject to) رکھ کر دیکھا جائے۔ جیسے ہی وہاں کی کسی مخلوق کا کوئی تصرف اس "مطلق حوالہ" Absolute reference سے تصادم کرے گا، اِلغاء nullify ہو گا۔ اور اگر وہ مخلوق اس تصادم پر بضد ہو تو اُس کی اپنی حیثیت legitimacy اِلغاء nullify ہونے لگے گی۔ اور اگر بالفرض کسی وقت وہ طاقت اور دھونس کے بل پر اپنی حیثیت اِلغاء نہ ہونے دے تو کم از بھی یہ ڈیکلیئر کر دیا جائے گا کہ وہ نظام اِلغاء ہو چکا۔ اب یہ کوئی اور نظام ہے۔ اس کے لیے 'باطل نظام' ایسی قاموس کا استعمال بھی تب آپ مباح جانتے ہیں۔

یہ "مطلق حوالہ" The Absolute Reference of Binding ایک قوم کی حیاتِ اجتماعی میں بے شک کسی وقت ایک آئینی 'کلاز' clause کی صورت میں بھی پایا جائے مگر اس کی اپنی حیثیت کسی ایک عدد 'کلاز' سے اوپر ہوتی ہے۔ آئینی دفعات یا ترامیم یا اقدامات وغیرہ اُس کے تابع رہ کر تفسیر ہوتے ہیں؛ وہ کسی آئینی دفعہ یا ترمیم یا اقدام کے تابع رکھ کر تفسیر نہیں ہوتا۔ وہ "مطلق حوالہ" The Absolute Reference of Binding گویا اس نظام کا 'واجب الوجود' ہوتا ہے۔ وہاں کی ہر چیز اس کی طرف لوٹتی ہے اور وہ کسی چیز کی طرف نہیں لوٹتا۔ اس پر گویا دنیا ختم ہو جاتی ہے اور اس سے پرے beyond صرف خلا ہوتا ہے؛ یعنی عدم۔ اس کا سقوط نظام کا سقوط ہوتا ہے۔

یہ "مطلق حوالہ" The Absolute Reference of Binding جماعۃ

المسلمین (مسلم معاشرہ + اسلامی ریاست)[1] کے ہاں ہوتا ہے: "اللہ و رسول"۔ اور مغرب کی مجوزہ 'ماڈرن سوسائٹی' کے ہاں: "حاکمیتِ عوام"۔

مانا کہ آپ اِن دونوں حوالوں کو یکجا کر لیں گے، پھر بھی ان میں سے "مطلق" ایک ہی رہے گا۔ اور جب ایک "مطلق" ہوا تو دوسرا اپنی اس حیثیت میں نہ رہا۔ اِس معنیٰ میں؛ البتہ آپ دونوں کو 'یکجا' نہیں کرتے؛ بلکہ ایک کو قبول کرتے ہیں۔ 'مطلق' کی حیثیت میں دوسرا رد ہی ہو جاتا ہے۔ اب ایک بنیادی فیصلہ آپ کو یہاں کرنا ہوتا ہے کہ آپ کی حیاتِ اجتماعی میں اطاعت کا مطلق اور بالاترین حوالہ کیا ہے؟ اس کی پڑتال بھی بہت آسان ہے: وہ چیز جس کے ساتھ تصادم ہو جانے سے آپ کے نزدیک یہ ڈیکلیئر ہو جائے گا کہ ملک کا نظام توڑا گیا ہے، اُس چیز کو آپ وہاں کا "مطلق حوالہ" کہیں گے۔ اسی کو ہم کسی ماحول میں قائم "سیاسی عقیدہ" بھی کہتے ہیں؛ جو ہر دم وہاں مانا اور منوایا جا رہا ہوتا ہے؛ صبح شام اس پر ایمان اور استقامت کے لیے دُہائیاں پڑ رہی ہوتی ہیں؛ ہر چوپال اور چینل پر اس کی "تواصی"[2] جاری ہوتی ہے؛ اور اس کے توڑے جانے پر سخت سے سخت 'وعیدیں' نشر ہونا کسی کو اوپرا نہیں لگتا؛ بلکہ یہ اس کا "حق" مانا جاتا ہے۔ یہ "سیاسی عقیدہ" ہی ہمارے مابین اِس وقت اصل زیرِ بحث ہے؛ اور اسی کے اندر حاکمیتِ عوام کو 'شیر والا حصہ' Lion's share ملا ہونے پر نقد کرنا مفتی تقی عثمانی کی عبارت کا مقصود نظر آتا ہے۔

ذرا آپ غور فرمائیں تو 'ماڈرن سوسائٹی' میں آئین کی آئینی حیثیت آپ وہاں کے آئین سے نہیں لیتے؛ خود آئین اپنی یہ حیثیت وہاں پر قائم سیاسی عقیدہ سے لیتا ہے۔ وہاں کا

---

[1] اس موضوع پر دیکھئے ہماری تحریر: دستوری بحثوں سے پہلے "جماعۃ المسلمین" اور 'جدید معاشرے' کا فرق: https://goo.gl/WSMCgc

[2] "تواصی" یعنی ایک دوسرے کو بکثرت ایک بات کی تلقین، اور صبح شام ایک دوسرے کو اس پر پختہ رہنے کی تاکید۔

"سیاسی عقیدہ" جس چیز کو آئین کہے اصل میں آئین وہ ہے اور صرف اس وقت تک آئین ہے جب تک وہاں کا "سیاسی عقیدہ" اسے آئین مانے؛ ورنہ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی:

ایک 'ماڈرن سوسائٹی' کے آئین میں آج عموماً اِس مضمون کی عبارتیں تحریری یا زبانی درج ہوتی ہیں کہ: (1) یہاں پائی جانے والی بالاترین دستاویز یہاں کا آئین ہے۔ اور (2) اِس آئین کا تقرر یا اس میں ردوبدل کرنے والی واحد اتھارٹی یہاں پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت ہے۔ دو تہائی سے وہ جو پاس کر دے وہ آئین ہے۔

تیسری دنیا میں رہتے ہوئے اب ذرا دیر کے لیے فرض کرتے ہیں: ایسے کسی ملک کے 'منتخب' سیاستدان 'دو تہائی اکثریت' سے کسی وقت یہ 'آئینی ترمیم' کر ڈالتے ہیں کہ آئندہ سے الیکشن ختم؛ اب یہی لوگ یہاں کی تاحیات پارلیمنٹ؛ اور موجودہ وزیر اعظم ہی اب یہاں کا تاحیات فرمانروا۔ یہاں تک کہ اس سے معارض کوئی دفعہ اگر آئین میں پائی جا رہی تھی تو سب سے پہلے انہوں نے اسے ہی دو تہائی ووٹ سے تبدیل کر ڈالا... تو 'ماڈرن سوسائٹی' کو یہاں آپ کے خیال میں کیسا ردعمل سامنے لانا ہو گا؟ اہل جمہوریت آپ کے نزدیک یہاں کس قسم کا ردعمل کرنے کے "مجاز" یا "مکلف" ہوں گے؟ آئین میں ایک باقاعدہ 'آئینی' طریقے سے یہ ترمیم ہو چکی کہ آئندہ سے اب یہاں تقریباً بادشاہت ہے!

میرا نہیں خیال کہ آپ یہ کہنے میں ذرا تردد کریں گے کہ پارلیمنٹ کا ایسا ایک غیر جمہوری اقدام "رد" ہے اور کسی صورت "قبول" نہیں۔ بے شک وہ پارلیمنٹ کی 'دو تہائی اکثریت' کا متفقہ تصرف ہے پھر بھی وہ اِلغاء void & nullify ہی ہو گا۔ وجہ؟ کوئی بھی سسٹم اپنے ہتھیاروں سے اپنی موت نہیں کرواتا۔ لہٰذا 'دو تہائی' بے شک ہو، پھر بھی اس کا فیصلہ اب "آئین" کہلانے کے لائق نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ 'دو تہائی' کا تصادم اب یہاں کے "سیاسی عقیدہ" سے ہے۔ نظام کے اصل مرجع سے ہے۔ اس کا ٹکراؤ اب یہاں کے

اطاعت اور اختیارات کے پیراڈائم سے ہے۔ اس کا تعارض اب یہاں کے "مطلق حوالہ" Absolute Reference of Binding سے ہو گیا ہے؛ یعنی حاکمیتِ عوام۔

یا اس مثال کو آپ ایسے بھی لے سکتے ہیں، اور جو کہ ہمارے ملک میں بارہا پیش بھی آ چکا ہے: صدرِ مملکت نے آپ کے آئین ہی کی کسی دفعہ کا سہارا لے کر پارلیمنٹ کو تحلیل اور کابینہ کو فارغ کر ڈالا اور پھر آئین کی کسی ایمر جنسی کلاز کا سہارا لے کر اپنے اقتدار کو طول دینے کی ٹھان لی۔

پہلی مثال میں پارلیمنٹ اور دوسری میں صدرِ مملکت کے اس فیصلہ کو بزور لاگو کرنے کی بھی کوئی صورت فرض کریں 'تیسری دنیا' کے اس ملک میں مہیا کر لی گئی ہے... اب عملاً تو ظاہر ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ (خونریزی کا فتویٰ جمہوریت کو بحال کروانے کے لیے دیا جا سکتا ہے اور نہ شریعت کو بحال کروانے کے لیے)۔ لیکن ایسا 'غیر جمہوری' اقدام کر چکی جنتا کو ایک ناجائز ٹولہ تو کہیں گے! اُسے اپنا یہ اقدام واپس لینے پر مجبور کر دینے کی خاطر ایک عدد 'تحریکِ بحالیِ جمہوریت Movement for Restoration of Democracy' لانچ ہو جانے کا جواز یا وجوب تو نکلتا ہے! اور یہ تو 'جمہوریت' کا کم از کم حق ہے! جمہوری اصولوں کو پامال کرنے والے کی legitimacy تو چیلنج ہو گی! آپ کا وہ 'نظامِ حق' جو وہاں پر قائم سیاسی عقیدہ (حاکمیتِ عوام) پر کھڑا تھا، اب غیر موجود non-existing کے حکم میں تو جائے گا! اصل مسئلہ یہاں ہے برادرم: 'اسٹام' تو آپ کسی سے 'اسلامی اصولوں سے کبھی منحرف نہ ہونے' کا بھروا سکتے ہیں اور نہ 'جمہوری اصولوں سے کبھی منحرف نہ ہونے' کا۔ کوئی فرد کل کیا کرتا ہے، سرے سے غیر متعلقہ ہے۔ مسئلہ ایک نظام میں کسی حرکت کا پیشگی 'سٹیٹس' اور 'سنگینی' طے ہو رہنے کا ہے؛ کہ کس قسم کا انحراف ایک نظام کی صحت پر کس نوعیت کا اثر ڈالتا ہے۔

محترم عمار خان صاحب سے پس ہم اتنی درخواست کریں گے کہ وہ اپنی اس عبارت میں ذرا

دیر کے لیے ”اسلام سے انحراف“ کی جگہ ”جمہوری اصولوں سے انحراف“ کے الفاظ رکھ لیں۔ پھر جو چیز ”جمہوری اصولوں سے انحراف“ کے معاملہ میں یہاں یا کہیں پر بھی تجویز ہوتی ہے اور جیسی سنگینی کسی 'غیر جمہوری' اقدام سے متعلق تسلیم ہوتی ہے ویسی ہی چیز وہ ”محکماتِ شریعت سے انحراف“ کے معاملہ میں تجویز فرماتے ہوئے جمہوری پیراڈائم میں اس کی گنجائش ڈھونڈیں؛ آپ کو اُس ”پوائنٹ“ کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی ان شاء اللہ ہو جائے گی جس کا ایضاح حضرت تقی عثمانی مدظلہُ یا حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں مقصود ہے۔ جمہوریت کے حوالے سے ان کے کلام میں اصل محلِ ابطال نقطہ یہ ہے۔

پس جتنا سا بھونچال آ جانا تیسری دنیا کے کسی ملک میں 'مارشل لا لگ جانے' یا 'آئین توڑے جانے' کے نتیجہ میں محترم عمار خان صاحب کی نظر میں کسی 'جمہوری معاشرے' کے اندر جائز ہو... زیادہ نہیں تو اتنا سا بھونچال کسی لا الہ الا اللہ پڑھنے والے معاشرے میں ”محکماتِ شریعت توڑے جانے“ پر بھی اگر جائز ٹھہر جائے تو یہ اشکال سرِ دست ان شاء اللہ رفع ہو جاتا ہے۔

اب یہ بحث ہم یہاں نہیں کریں گے کہ ان میں سے کونسی چیز لا الہ الا اللہ پڑھنے والی ایک قوم کی زندگی میں سنگین تر ہو گی۔ کونسی چیز ایک لا الٰہ الا اللہ پڑھنے والی قوم کی حیاتِ اجتماعی میں زیادہ بڑی گالی کی حیثیت رکھے گی: عوام کا مینڈیٹ توڑا جانا یا اللہ مالک الملک کی شریعت توڑی جانا؟ legitimacy[3] کی قبا کا تار تار ہونا آیا وہاں زیادہ متصور ہو گا یا یہاں؟ اِس ”زیادہ“ یا ”سنگین تر“ کی بحث کسی اور وقت۔ فی الحال دونوں کی سنگینی 'یکساں' مان لی جائے تو بھی ایک مسئلہ سرے لگتا ہے۔

واللہ الموفّق.

[3] Legitimacy کے مسئلہ پر عرصہ پہلے لکھی گئی ایک تحریر ایقاظ میں آنا ابھی باقی ہے۔ اس سے متعلقہ ایک نوٹ کی طرف فی الحال ہم ریفر کرسکتے ہیں: https://goo.gl/6Yi3ym

مفتی کاکاخیل کے ایک شاگردِ رشید کی فرمائش پر

تنقیحات

حامد کمال الدین

جناب مفتی عدنان صاحب کاکاخیل نے اپنی فیس بک ٹائم لائن پر کہیں ہماری ایک پرانی تحریر — ازراہِ کرم — شیئر فرمارکھی ہے (لنک: https://goo.gl/bVbLj9)۔ ہماری اس تحریر میں عالم اسلام پر مسلط حالیہ نظام یا صورتحال پر ایک مختصر نقد ہے اور اس کی مزاحمت کی ضرورت کا کچھ عمومی تذکرہ۔ اس پر تبصرے ہیں۔ حمایت میں بھی مخالفت میں بھی۔ کوئی چیز خلافِ معمول نہیں۔ تاہم ایک تبصرے پر مفتی صاحب حفظہ اللہ کے ایک شاگردِ رشید نے ہمیں توجہ دلاتے ہوئے فرمائش کی ہے کہ اس کا جواب ضرور صاحب تحریر ہی کی طرف سے آنا چاہیے۔ یہ کامنٹ مفتی صاحب کی اسی پوسٹ پر اس لنک پہ دیکھا جاسکتا ہے: (https://goo.gl/TfUeyi)۔ کامنٹ نگار کوئی فرنود عالم صاحب ہیں۔ سبھی کامنٹ فرمانے والے بھائی ہمارے لیے قابل قدر ہیں اور ان کی رائے قابل اعتناء۔ مذکورہ کامنٹ کا جہاں تک تعلق ہے، خود ہماری رائے میں اس کا مخصوص طور پر جواب ضروری نہیں۔ مگر تلمیذ الشیخ — أعزھما اللہ ونصر بھما الدین ۔ کی خواہش پر ہم چند باتیں عرض کردیتے ہیں:

1۔ جمہوریت ایسے ایک جدید مسئلہ سے متعلق کسی قول کو یوں جھٹ سے اکابرِ دیوبند کے ہاں ایک طے شدہ مسئلہ کے طور پر پیش کرنا میری نگاہ میں خاصا بڑا تحکُّم ہے۔ خاص مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک موقف کو 'دیوبندی اجتہادات' میں شامل کرنا شاید دیوبند کے علمی حلقوں میں محل نظر ہو، کجایہ کہ دیوبندی مواقف اس میں محصور بھی ہوجانے لگیں۔ اگر ایسا ہو تو 'جمہوری فکر' سے بھی پہلے شاید 'سوشلسٹ فکر' دیوبندی آباء سے منسوب ہونے کا حق رکھے! حاشاھم عن ذٰلک۔ ابوالکلام رحمہ اللہ اکابر دیوبند میں نہیں آتے؛ اغلباً ان کا ذکر

تبصرہ نگار کے ہاں بھی اِس زمرے میں نہیں آیا۔ مولانا مدنی رحمہ اللہ دیوبند میں یقیناً ایک بڑا نام ہیں۔ مگر خود وہ کس علمی اپروچ کے تحت ایک چیز کو مسلمانوں کے معاملات سلجھانے اور کچھ بحرانات پر قابو پانے کے لیے اختیار کرنے کے قائل تھے، الگ سے ایک تھیسس ہے اور علمی مکالمہ چاہتا ہے۔ اور اگر کچھ عبارتوں کے ظاہری و سرسری معانی پر کلام کو محمول کرتے ہوئے ایک بات کو حضرت علیہ الرحمہ کا باقاعدہ علمی موقف ہی قرار دیا جائے، جو کہ ہے ویسے محل نظر، تو بھی مکتبِ دیوبند کے اقوال کو اس میں محصور کر دینا؟! اس پر فاضل تبصرہ نگار سے یہی کہا جا سکتا ہے: لَقَد ضَيَّقْتَ وَاسِعًا۔ دیوبند ایک بڑا سمندر رہے۔ حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کا جمہوریت پر نہایت جاندار نقد میری نظر سے گزرا ہوا ہے۔ دیگر فضلاء کے اقوال بھی وقتاً فوقتاً دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس مسئلہ پر پورے مکتب کو ایک ہی قول پر قرار دے ڈالنا میری نظر میں ایک خاصا بڑا دعویٰ ہے، کجا یہ کہ مکتب کے ایک استاذ اور مفتی کو اس سے خروج کرتا جان کر 'نازیبائی' کا طعنہ بھی دیا جائے! اہل علم پر استدراک اگر بنتا بھی ہو تو وہ ذرا اور قسم کا اسلوب چاہتا ہے۔ یہ اسلوب میرے علم کی حد تک نہ تو دیوبندی طلبۂ علم میں پایا جاتا ہے اور نہ دیوبندی عوام میں۔ تبصرہ نگار کا تعلق اگر غیر دیوبندی مکتب فکر سے ہے، تو ان کا مفتی کاکاخیل صاحب کو دیوبندی مذہب کی تعلیم دینا یا دیوبندی 'اجماع' سے خروج پر سرزنش فرمانا کچھ اور بھی معنی خیز ہے!

جہاں تک کسی قول کی نسبت پورے ایک مکتب سے کرنے کا تعلق ہے تو وہ عقیدہ و فقہ کے روایتی مسائل کی حد تک تو میرے خیال میں درست ہے، گو وہ بھی ہر مسئلے میں نہیں۔ البتہ جہاں تک جدید پیش آمدہ مسائل و اصطلاحات کا تعلق ہے تو ان میں کسی بھی ایک مکتب کے علماء کے ہاں بہت کچھ سنے اور کہے جانے کی گنجائش موجود ہے؛ اور یہاں پر "تحریرِ مسئلہ" ایک بہت بڑا استقصاء چاہتا ہے۔ لہٰذا ان مسائل میں کسی پورے ایک مکتب کی ترجمانی کا دعویٰ خاصی بڑی بات ہو گی۔ اللہ اعلم

2۔ ’جمہوریت‘ اِس پوری تحریر میں دراصل ہمارا موضوع ہی نہیں ہے۔ خود یہ جملہ ہماری اسی تحریر میں لائقِ توجہ ہے:

”اس نظام کا بنیادی نکتہ صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ایک غلام قوم کو چلایا جائے اور غلام رکھا جائے۔ اس سسٹم کا کسی وقت ’جمہوری‘ شکل اختیار کر لینا اور کسی وقت ’آمریت‘ والا روپ دھار لینا میرے نزدیک کچھ بڑا فرق نہیں رکھتا۔ میری نظر میں یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں جب آپ اس سکے کو اچھالتے ہیں تو کبھی ایک رخ اوپر آجاتا ہے تو کبھی دوسرا“۔

درج بالا عبارت سے واضح ہے کہ ہم اِس نظام کو ’جمہوریت بمقابلہ آمریت‘ والے ڈائلیکٹ سے بڑے کسی تناظر میں لے رہے ہیں۔ یعنی ہم اِسے ایک نظامِ باربرداری کے طور پر لے رہے ہیں؛ ہمارے کسی مسلم ملک میں اس کا ’جمہوری‘ اور کسی مسلم ملک میں اِس کا ’آمرانہ‘ چہرہ خاص ہمارے زیربحث موضوع کے لحاظ سے غیر متعلقہ ہے۔ بھائی ہم اگر ایک ’آمریت‘ کے دور میں ہوتے یا کسی ’بادشاہت‘ والے ملک میں ہوتے تو اِس نظامِ برداری پر ہماری تنقید اور اس میں ذکر ہو جانے والی اچٹتی مثالوں سے شاید آپ یہ نتیجہ نکالنے چل پڑتے کہ ہمارا نشانۂ تنقید اصل میں ’آمریت‘ یا ’بادشاہت‘ ہے! جبکہ ہمارا موضوع نہ یہ نہ وہ۔ ہمیں تو درکار ہے ”ما أنزل اللہ“ کا معاشرے کے حق میں حتمی مرجع ہونا، یہ ہمیں ”فرد (واحد)“ کے ذریعے ملتا ہے تو ہمارا کام ہوتا ہے، ”عوام“ کے ذریعے ملتا ہے تو ہمارا کام ہوتا ہے (کسی کا نہ ہوتا ہو؛ ہمارا ہوتا ہے۔ اِس قدر کھلے ہیں ہم تو اِس معاملہ میں۔ یعنی ”عوام بمقابلہ فرد“ ہمارے ڈسکورس کا مرکزی نقطہ ہی نہیں ہے)۔ ہمارا نشانۂ تنقید ہوتا ہے یہاں کا وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی سٹیٹس کو a political, social, intellectual status quo جس میں انسانوں کا مرجع صاف صاف ”اللہ اور اس کا رسولؐ“ نہیں ہے۔ یعنی ایک ایسا اجتماعی سیٹ اپ جو کسی سبب سے ”ما انزل اللہ“ کی اپنی

پابند کن حیثیت own binding status کو نہ ماننے پر کھڑا ہے اور مسلسل ایک غیر آسمانی نقشے پر ہمارے فکرو نظر سے لے کر ہمارے سماج تک کی ساخت کیے چلا جا رہا ہے۔ رہا یہ کہ وہ کن اَشکال میں اپنا ظہور manifestation کرتا ہے، بادشاہت یا جمہوریت، یاافسر شاہی، یاٹیکنو کریسی، یک پارٹی سسٹم یا کثیر پارٹی سسٹم وغیرہ وغیرہ؟... تو وہ ہمارے اِس اصل مضمون کے اعتبار سے غیر متعلقہ ہے؛ اور اگر اس کا کچھ ذکر ہے تو محض ضمنی ہے۔ اور ایسے مقامات پر اصطلاحات کے اندر الجھنا تو آخری درجے کی نادانی۔

اصطلاحات ہمارے نزدیک نرے ظروف containers ہیں۔ لہٰذا ہم ان پر کبھی نہیں الجھتے۔ کم از کم ایک بنیادی مضمون کے طور پر بالکل نہیں الجھتے۔ ہماری بحث ہوتی ہے ایسے کسی ظرف container میں ڈال رکھے گئے مظروف content پر، جو کہ دیکھنے میں آیا ہے جدید اصطلاحات کی اسلامیائی گئی اشیاء Islamized items کے معاملہ میں ہر شخص کے ہاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، لہٰذا اس پر الجھنا بے فائدہ ہے۔ بلکہ ایک درجے میں گمراہ کن misleading۔ یہاں تک کہ مضمون content کے اعتبار سے ہم خیال لوگوں کے مابین بھی یہ چیز اختلاف ظاہر کروانے کا موجب ہو سکتی ہے۔

مثلاً بہت امکان یہ ہو گا کہ 'جمہوریت کو قبول کرنے' کے تحت آپ جس چیز کو قبول کر رہے ہوں مضمون content کی حد تک مجھے بھی اس سے کوئی بہت بنیادی اختلاف نہ ہو۔ (میری بات اس شخص سے ہو رہی ہے جو ایک وسیع معنیٰ میں اہل السنۃ والجماعۃ کے پیراڈائم سے وابستہ ہے؛ یعنی نصِ شرعی کی حاکمانہ حیثیت اس کے ہاں کسی بھی طرح محل نظر نہیں؛ معروف سیکولر ڈسکورس کا حامل شخص یہاں میرا مخاطب نہیں)۔ اِسی طرح 'جمہوریت کو قبول نہ کرنے' کے تحت میں جس چیز کو رد کر رہا ہوں بہت امکان یہ ہے کہ مضمون content کی حد تک آپ بھی اس کو رد ہی کرتے ہوں۔ تو پھر جھگڑا کس بات کا؟

بے شک ہم ذاتی طور یہ موقف رکھتے ہیں کہ اصطلاحات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں

کے ہاں اہل کفر کا تشبُّہ نہ ہو، غیر ہدایت یافتہ ملتوں (مغضوب علیہم اور ضالین) سے ہماری مغایرت اس سطح پر بھی برقرار ہی رہے، ظروف بھی ہمارے اپنے ہوں اور مظروف بھی، مشروب بھی ہمارا اپنا ہو اور جام بھی کہیں سے مستعار نہ ہو، تاہم اپنے کسی مسلمان بھائی کے ساتھ ہمارا بنیادی تنازعہ اس بات پر بہر حال نہ ہو گا کہ ایک حلال مشروب وہ میخانے سے اٹھائے گئے کسی جام میں بھر کر کیوں پی رہا ہے۔ بنیادی جھگڑا اگر ہو گا تو وہ مشروب پر ہی ہو گا۔ یہاں تک کہ مشروب میں کافر سے خریدی گئی کوئی حلال چیز شامل ہے تو بھی یہ کوئی جھگڑنے کی بات نہیں ہو گی۔ اس لیے؛ اپنے متبع سنت بھائیوں کے ساتھ ہم تو لفظوں اور عبارتوں پر الجھتے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ مضمون content میں بیشتر مقامات پر اہل سنت کا کوئی اختلاف ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور یہ بات ہمیں "ما أنزل اللہ" کی حاکمانہ حیثیت عالم اسلام میں قائم کروانے اور "ما أنزل اللہ" کو ردیا حاشیائی کر رکھنے والے سٹیٹس کو کو عالم اسلام میں رد کروانے کے لیے الحمد للہ ایک وسیع بنیاد فراہم کرتی ہے، اگر ہم اس کا اندازہ کر لیں۔

لہٰذا ہمارا اصل موضوع تحریرِ مذکورہ کے اندر بھی بیرون سے حملہ آور وہ الحادی استحصالی صورتحال ہے جو کسی بھی جمہوری یا غیر جمہوری چولے میں ہم پر حملہ آور ہوتی ہے اور جس نے ڈیڑھ سو سال کے مختصر عرصہ میں ہمارے سب سماجی و تعلیمی خدوخال بدل ڈالے ہیں۔ اصل رونا اس کا ہے میرے بھائی اس پوری تحریر میں! ہم ایک بہت بنیادی بات پر آپ کی توجہ لے رہے ہیں اور آپ ایک نہایت غیر بنیادی بات پر حضرت مدنی اور اقبال و مودودی کو آپس میں بھڑوا رہے ہیں! یہاں تک کہ اقبال کے اپنے ہی دو اقوال کو آپس میں بھڑوا رہے ہیں، درحالیکہ ان کے مابین تطبیق بھی بڑے آرام سے ہو سکتی ہے! آپ غور فرمائیں تو شاید ہم اُس شر کی نشاندہی کر رہے ہوں جس کے خلاف حضرت مدنی اور اقبال و مودودی یکساں مزاحمت کے داعی تھے اور صبحِ قیامت تک رہیں گے! تعبیرات کے اختلاف کے باوجود یہ سب مجاہدینِ حریت تھے میرے بھائی، جو ہم نہیں ہیں! اس مغربی ڈسکورس

کے خلاف جو ہمارا اصل نشانۂ تنقید ہے اور جو کہ مسلسل ہمارے فکر و نظر سے لے کر ہماری سوسائٹی تک کی تشکیل کیے جا رہا ہے، یہ تمام بزرگ اپنے اپنے طور پر اور اپنے اپنے میدان میں شمشیر بکف تھے اور ان کی ساری زندگی اس کے خلاف مزاحمت میں ہی گزری۔

دوبارہ میری درخواست ہوگی، ہمارے ساتھ باعثِ نزاع مسئلہ 'جمہوریت' کو خوامخواہ نہ بنایا جائے، خصوصاً 'جمہوریت' کی اُس نظری صورت کو جو کسی وجہ سے بہت سارے متبعینِ سنت کے یہاں کچھ مخصوص حدود و قیود کے تحت قبول ہوتی ہے۔ ہماری تنقید ایک نظامِ قائم پر اس سے ایک وسیع تر تناظر میں ہے؛ اور اس پر ان شاء اللہ یہ سب طبقے متفق ہوں گے۔ ہماری 'مزاحمت' کا حوالہ بھی دراصل وہی ہے۔ براہِ کرم اس کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ڈیڑھ سو سال میں ہماری تعلیمی academic، ثقافتی intellectual اور سماجی ساخت ایک خالصتاً غیر آسمانی (مغربی) نقشے پر جو ہو رہی ہے اور پورے تسلسل اور زور و شور کے ساتھ جاری ہے، اس کے خلاف مزاحمت کی ضرورت کا انکار آخر کون کر سکتا ہے؟ اور اس کے خلاف مزاحمت ہم میں سے کون کر رہا ہے؟ ان لفظی بحثوں میں الجھنے کی بجائے، آیئے کچھ اس طرف توجہ دیں۔ آپ دوبارہ میری وہ تحریر پڑھ لیجیے، اس میں آپ کو 'مزاحمت' کا یہی معنیٰ واضح اور جلی صورت کے اندر ملے گا۔

3۔ حضرت مدنی و حضرت اقبال میں کامیاب مقابلہ کروا لینے کے بعد، تبصرہ نگار کا رخ جمہوریت اور خلافت کا مقابلہ کروانے کی طرف ہو جاتا ہے؛ اور وہ بھی میری ایک تحریر پر تنقید فرماتے ہوئے۔ خلافت کا لفظ میری اس پوری تحریر میں نہیں ہے! تحریر میں اس کا کچھ ذکر ہوتا تو شاید اس سے میری بات کا مقصود اور سیاق بھی کچھ واضح ہوتا اور یہ بھی شاید معلوم ہو سکتا کہ صورتِ موجودہ میں 'خلافت خلافت' گردان فرمانے والی جماعتوں سے خود ہمارا نقطۂ نظر کس قدر مختلف ہے۔ لیکن ایک بات کا ذکر ہوئے بغیر اس پر تنقید کر کے تو میرے اس بھائی نے تمام مسئلے ہی حل کر ڈالے! اب کوئی مسئلہ ہو تو بات کریں!

اپنے زمانے کے فتنوں سے آگاہی کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟

حامد کمال الدین

تنقیحات

فیس بک پر ہمارے یہاں ایک عبارت دی گئی:

'ایکسپوژر' کی نحوست

ابن الراوندی (تاریخ اسلام کا ایک مشہور زندیق) کا اٹھنا بیٹھنا اہل الحاد کے ساتھ ہو گیا۔ جب بھی اس معاملہ میں اسے روک ٹوک کی جاتی، کہتا: بھائی ان کے مذہب کو سمجھنے بھی تو دو! آخر خود ملحد ہو گیا اور خدا پر طعن بکنے لگا۔

(لنک: https://goo.gl/ezgWIH)

جس پر ہمیں سوال موصول ہوا:

آپ کیا نصیحت کرتے ہیں؟ فتنوں سے آگاہی کا کیا طریقہ کار ہونا چاہیے

اس پر ہمارا مختصر جواب تھا:

(1) پہلے عقیدۂ سلف پڑھیں اور اسی میں رسوخ حاصل کریں۔

(2) اپنے دور کے علمائے سنت سے وابستہ ہو جائیں۔ یہ ورثۃ الأنبیاء ہیں۔ یعنی انبیاء کی غیر موجودگی میں بس یہی ہیں۔

(3) پھر ان کی راہنمائی میں اپنے دور کے فتنوں کی بابت بصیرت حاصل کریں۔ فردی فروق individual differences کو سامنے رکھتے ہوئے وہ آپ کو بتا سکیں گے کہ آپ کس درجے میں فتنوں کے 'قریب' جا کر ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید اکثر لوگوں کو وہ یہ بھی کہیں کہ تم ان فتنوں کو سمجھنے کے لیے بھی ان کے قریب

مت جاؤ؛ نو نقذ نہ تیرہ ادھار

''ایمان'' جس دولت کا نام ہے وہ کسی خطرے میں ڈالنے کی چیز نہیں۔ لاکھوں کروڑوں سال کی اخروی زندگی بس اسی ایک چیز پر سہارا کرتی ہے۔

اس پر یکے بعد دیگرے ہمیں دو سوال موصول ہوئے۔ پہلا سوال ''عقیدۂ سلف'' تک رسائی سے متعلق تھا کہ وہ ہو کیسے جبکہ اس پر یہاں اتنا بڑا خلجان پیدا کر دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرا سوال بنیادی طور پر ایک اعتراض تھا اور وہ یہ کہ بڑے بڑے مختلف راستوں پر چلنے والے بھی ''عقیدۂ سلف'' پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور بسا اوقات تو حوالے بھی ایک سے مصادر کے دیتے ہیں، تو پھر ''عقیدۂ سلف'' کسی مسئلہ کا حل کیسے؟

ان دونوں سوالوں کا وہاں ہم نے جو جواب دیا، یہاں ہم ان کو دو الگ الگ مضمونوں میں دے رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے اگلے دو مضمون:

- عقیدۂ سلف تک رسائی۔
- عقیدۂ سلف، دہشت گردی اور جدت پسندی۔

عقیدۂ سلف تک رسائی؟

حامد کمال الدین

تنقیحات

سوال: عقیدۂ سلف کس کو کہا جائے گا؟ اگر یہ پہلو کلیئر ہو جائے تو آسانی ہو جائے گی۔ https://goo.gl/bM8tOl

سوال: عقیدہ سلف کی بعض مستند نمائندہ کتب کے نام بھی اگر یہاں درج ہوتے تو بہت اچھی بات تھی ، کم از کم ایک نمائندہ کتاب کا نام تو ہونا چاہیے (قرآن مجید اور کتب احادیث کے علاوہ) https://goo.gl/rRERt5

جواب:

ان شاءاللہ یہ مسئلہ بالکل پیچیدہ نہیں، باوجود اس کے کہ کچھ لوگوں نے اس سوال کو الجھا کر کہ 'کونسا عقیدۂ سلف'؟ فلاں والا؟ فلاں والا؟ یا فلاں والا؟... اصل میں یہ گراؤنڈ بنانے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ "عقیدۂ سلف" کوئی چیز ہوتی ہی نہیں، لہٰذا سب سمتیں اس معاملہ میں ایک برابر ہوئیں، اور اس لیے... اسلام کی یہ نئی نئی تعبیریں بھی جو کتاب و سنت کے نام پر کچھ دلیل بازی کر سکتی ہوں (اور جو کہ بالعموم ہیومن ازم کا ایک لاشعوری پرتو ہیں)... اسلام کی یہ سب نئی نئی تعبیریں بھی اصولِ دین کے بیان و تفسیر میں اتنی ہی ویلڈ valid ہوئیں جتنی کہ کسی کے خیال میں مقرراتِ سلف!

*****

اصطلاحات کے حوالے سے ذرا واضح کرتے چلیں:

"**عقیدہ**" سے ہماری مراد ہوتی ہے: اعتقاد creed کے معاملہ میں کتاب و سنت کے کچھ سٹینڈرڈ standard و طے شدہ established معانی و تفسیرات۔

"**سلف**" کا مطلب: امت کے پیش رَو predecessors۔ جو کہ اصل میں صحابہؓ ہیں

جنہوں نے نزولِ وحی کا زمانہ پایا اور صاحب وحی سے وحی کو براہِ راست پڑھا اور سمجھا اور صاحبِ وحی سے اس پر باقاعدہ سند پائی، اور پھر صحابہؓ کے بعد ان کے سند یافتہ شاگرد تابعینؒ و تبع تابعینؒ جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ صحابہؓ سے پڑھے اور قدم قدم پر اہل بدعت و انحراف سے بھی الجھے، اور صحابہؓ کا ایک باقاعدہ علمی تسلسل بنے، خصوصاً گمراہ فرقوں کے مقابلے پر (یعنی پٹڑی سرکنے کے مقامات پر)۔

یوں **"عقیدۂ سلف"** سے مراد ہو گی: اعتقاد کے باب میں کتاب و سنت کے وہ سٹینڈرڈ معانی و تفسیرات جو سلف کے وقت سے طے شدہ established چلے آتے ہیں۔

*****

"عقیدۂ سلف" کس کو کہا جائے گا؟ بھائی میں اس کے جواب میں اگر کچھ خاص متون texts کا ذکر کر دوں، اور بلاشبہ کسی دوسرے مقام پر ایسا کیا جا سکتا ہے، تو فی الحال ایک سائل کے لیے یہ گنجائش رہ جائے گی کہ فلاں اور فلاں حضرات تو عقیدۂ سلف کے نام پر کوئی دوسرا ٹیکسٹ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اس لیے، کم از کم اِس مقام پر میں صرف وہ بات عرض کروں گا جو آپ کو ایک واضح ٹریک track پر چڑھا دے۔ رہ گئے کچھ ایسے فرق differences جو "عقیدہ" کو "سلف" سے لینے کا دعویٰ کرنے والوں کے مابین بھی آپ کو نظر آئیں گے... تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ فرق کتنے بھی بڑے ہوں، اور ان کو کتنا بھی بڑھا چڑھا کر بیان کر لیا جائے، اُن ضلالتوں کے مقابلے پر کچھ نہیں جو آپ ان لوگوں کے ہاں دیکھیں گے جو اصولِ دین کو لینے میں فہم و تفسیرِ سلف کا پابند رہنے کے سرے سے روادار نہیں۔

یہ وضاحت ہو جانے کے بعد اب ہم آپ کے سوال پر آجاتے ہیں۔

مختصراً:

1۔ آپ اپنی اپنی بہترین صوابدید میں جن مؤلفین اور معلمین کی یہ صنف بندی کر

سکتے ہوں کہ وہ اپنے علمی دعووں میں جھوٹے اور خائن نہیں (ان کے جھوٹ پکڑنے کے بہت سے چیک بھی ہیں اور بڑے آسان ہیں، جن کے ذکر کا یہ مقام نہیں)، ایسے قابل اعتماد مؤلفین اور معلمین کو چھانٹ لیجئے۔ (ایک عامی کا اجتہاد اسی قدر ہوتا ہے کہ یہ اپنی بہترین صوابدید اور دیانت کا استعمال کرتے ہوئے کسی فقیہ یا عالمِ سنت کا تعین کرے جس سے یہ دین کا علم اور فتویٰ لے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ایسے ہر عامی کا "تلاشِ عالم" کا اجتہاد لازماً درست ہی ہو گا۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر اس نے سنت کا عالم تلاش کرنے میں اپنی بہترین صوابدید اور دیانت سے کام لیا ہے تو اپنا فرض ادا کر لیا ہے؛ اور یہاں غلطی ہو جانے پر بھی ان شاء اللہ وہ اکہرے اجر کا امید وار ضرور ہے)

2۔ ایسے معلمین، مؤلفین اور تالیفات (آپ کی صوابدید کے مطابق) اپنے علمی دعووں میں سچے ہونے کے ساتھ ساتھ ... اپنی اس بات کو باقاعدہ "سلف کے عقیدہ" کے طور پر پیش کر رہے ہوں (نہ کہ 'اپنے' فہمِ کتاب و سنت کے طور پر)۔ اور میں آپ سے عرض کر دوں اس دعویٰ کے ساتھ بات کرنے والے مؤلفین اور تالیفات علمی دنیا میں بے حد گنی چنی ہیں) کہ فلاں اور فلاں بات سلف کے اعتقادات ہیں)۔ لہٰذا آپ کا کام یہاں حد درجہ آسان ہو جاتا ہے۔ زیادہ عقائد جو متاخرہ ادوار میں بنے ہیں، ان کے پیش کرنے والے یہ دعویٰ ہی نہیں کرتے، اور نہ کر سکتے ہیں، کہ فلاں اور فلاں عقیدہ صحابہ اور تابعین و تبع تابعین سے چلا آتا ہے۔ لہٰذا وہ مؤلفین اور تالیفات چھانٹ لیجئے جو دعویٰ کریں کہ میں تمہیں دورِ سلف کا عقیدہ بیان کر کے دے رہا ہوں۔ مثال کے طور پر امام طحاویؒ اپنا "عقیدہ" کا متن لکھتے ہیں تو عین اس کے شروع میں یہ صراحت کرتے ہیں: [هذا ذكر بيان عقيدة أهل السنة والجماعة على مذهب فقهاء الملة أبي حنيفة النعمان بن ثابت الكوفي وأبي يوسف يعقوب بن إبراهيم الأنصاري وأبي عبد الله محمد بن الحسن الشيباني رضوان الله عليهم أجمعين وما يَعْتَقِدُونَ مِنْ أُصُولِ الدِّينِ وَيَدِينُونَ بِهِ رَبَّ العالمين "یہ ہے بیان عقیدۂ اہل

سنت و جماعت کا، بر مذہب فقہائے ملت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری اور محمد بن الحسن شیبانی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا۔ یعنی اصولِ دین میں جو جو ان کا اعتقاد ہے اور رب العالمین کو حاضر ناظر جان کر جن جن باتوں کا وہ اعتقاد رکھتے ہیں"]۔ ظاہر ہے امام طحاوی جیسا دعویٰ آخر کتنے مؤلف کر سکتے ہوں گے؟ اس سے زیادہ قوی انداز میں وہ کتابیں آتی ہیں جو عقیدہ کی "کتب مُسنَدۃ" کہلاتی ہیں، یعنی جو پوری سند کے ساتھ مسائلِ اعتقاد کو نبی ﷺ، صحابہؓ اور بزرگانِ تابعینؒ و تبع تابعینؒ سے بیان کرتی ہیں مانند: "الإيمان" لقاسم بن سلّام المتوفى 224ھ. "الإيمان" لابن أبي شيبة المتوفى 235ھ. "السنة" لابن أبي عاصم المتوفى 287ھ. "السنة" للخلّال المتوفى 311ھ. "التوحيد" لابن خزيمة المتوفى 311ھ. "الشريعة" للآجُری المتوفى 360ھ۔ "الإبانة الكبرى" لابن بطة المتوفي 387ھ. "الإيمان" لابن مندة المتوفى 395ھ. "التوحيد" لابن مندة ۔ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ کتابیں آتی ہیں جو ایک ایک بات کی اسناد تو نہیں لاتیں لیکن وہ اپنے مضمون میں عقیدۂ سلف ہی کے بیان کی پابندی کرتی ہیں جیسے امام أحمد بن حنبل المتوفی 241 ھ کی "أصول السنة" اور "الرّدّ على الزنادقة". ابن قتیبۃ المتوفیٰ 276ھ کی "الاختلاف في اللفظ والرد على الجهمية" اور ابو الحسن أشعري المتوفیٰ 324ھ کی "الإبانة عن أصول الديانة". وغیرہ۔ یہ چند مثالیں ہیں۔ ورنہ عقیدہ پر لکھے گئے متون بہت زیادہ ہیں۔

3۔ یہ سب متون اپنے (سلف کے بیانِ عقیدہ کے) ایک بہت بڑے حصہ میں متفق ہی ہیں، کچھ فرق ہو گا تو تعبیرات کا۔ لہٰذا ایک بڑا مسئلہ تو آپ کا یہیں ختم ہوا۔ ہاں ایک محدود ایریا میں ان کے ہاں کچھ فرق بھی مل جائے گا۔ یہ ایریا یا تو تعددِ آراء پر محمول ہو گا جن میں سے آپ کسی ایک قول کو اختیار کر لیں گے۔ یا کسی وقت مسئلہ 'تنقیح' کا بھی ضرورتمند ہو سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں تنقیح کی ضرورت آپ کو روایاتِ حدیث تک میں پڑتی ہے اور محدثین کے اختلافات تک میں صحیح کو غلط سے چھانٹ دینا پڑتا ہے۔ مگر سلف کے عقیدہ کے دعویٰ

کے ساتھ بیان ہونے والے مقامات میں ایسے اختلافی مقامات بہت کم ہیں۔

4۔ سلف کی نسبت سے ائمہ و علماء نے جو "بیانِ عقیدہ" کیا ہے وہ دو طرح کا ہے: (ایک) ایمان کے حقائق کا وہ بیان جو کتاب اور سنت کی تفہیم و تفسیر میں سلف سے ماثور ہے۔ اس کی حیثیت مستقل نوعیت کی ہے۔ (دوسرا) وہ بیان جو ہر دور میں سامنے آنے والی ضلالتوں کے بالمقابل اسلام کے کلاسیکل عقیدہ کا بیان اور دفاع ہوا ہے۔ یہاں چونکہ ایک ضلالت ہی نئی تھی سو اس کے مقابلے پر سنت عقیدہ کا بیان بھی ایک ایسے انداز سے ہونا لازم تھا جو اس ضلالت کے سامنے آنے سے پہلے نہ تو ہوا اور نہ ضروری تھا۔ (بیانِ عقیدہ کی) اس دوسری قسم کی حیثیت مستقل نوعیت کی نہیں۔ گو طلبہ کو اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بدعتوں اور ضلالتوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے ایک کلاسیکل پیٹرن classical pattern سے آگاہی پا سکیں۔

غرض یہ دعویٰ کرنا کوئی اتنا آسان نہیں کہ 'میں جو بیان کر رہا ہوں وہ دورِ سلف کا عقیدہ ہے'۔ اس لیے کہ سلف سے ماثور عقائد اتنی معتبر کتب کے اندر مدوَّن ہیں گویا انسائیکلوپیڈیا ہوں۔ یہ چیک کرنا مشکل نہیں کہ یہ عقیدہ سلف سے کہاں مروی ہوا ہے۔ اور حق تو یہ ہے، جیسا کہ ہم نے کہا، متاخرہ ادوار میں جو عقائد بنا لیے گئے ہیں ان کے ماننے والے بالعموم یہ دعویٰ کرتے بھی نہیں ہیں کہ یہ سلف سے ماثور ہیں۔ ایسے لوگ بالعموم اس مضمون کی بحثیں کرتے ملیں گے کہ 'یہ ضروری کیا ہے کہ عقیدہ سلف ہی سے ماثور ہو، ہم آپ کو دلیل جو دیتے ہیں'۔ بس ایسے لوگوں سے ہوشیار رہیے۔ عمر بن عبد العزیز کے الفاظ میں یہ (فکری) خانہ بدوش ہیں؛ آج کہیں تو کل کہیں۔ ان کی نقل مکانی مسلسل رہتی ہے۔ آئے روز ان پر نئے رنگ آتے ہیں (اور سب سے بُرا رنگ ہیومن اسٹ دور کا) جبکہ خدا کا دین ایک ثابت معلوم حقیقت ہے۔ "عقیدہ" ایک پیچھے سے چلی آنے والی روایت legacy ہے نہ کہ 'انکشاف' discovery نما کوئی چیز۔

عقیدۂ سلف سے اعراض.. کہیں دہشتگردی تو کہیں جدت پسندی

تنقیحات

حامد کمال الدین

ہمارے مضمون (عقیدۂ سلف تک رسائی؟) پر ایک اعتراض وارد ہوا ہے:

عقیدۂ سلف کا نام لینے والے ایک طرف حکمرانوں تک کے وفادار اور دوست۔ دوسری طرف اسی عقیدۂ سلف کا نام لینے والے ہر سُو دہشت پھیلاتے اور لوگوں کا قتلِ عام کرتے پھریں۔ یہ عقیدۂ سلف اگر آپ کو اتنے مختلف نتائج پر پہنچاتا ہے تو پھر یہ علاج کس مرض کا ہے؟

جواب:

بھائی دہشتگردی اور لوگوں کا قتل عام محض دماغ کے فتور کا نام ہے۔ اس کا کچھ تعلق عقیدۂ سلف کے ساتھ نہیں ہے، اگرچہ یہ کسی بھی عقیدے کا نام لیں یا کہنے کو کسی بھی دلیل کا سہارا لیں۔ غیر ذمہ دار لوگوں کے ہتھے کچھ بھی چڑھ سکتا ہے۔

اس کا الزامی جواب میں یوں دے سکتا ہوں: محض "قرآن" یا محض "کتاب و سنت" کو حجت ماننے والے کیسے کیسے بُعد المشرقین نتائج پر نہیں پہنچتے؟ یہ اعتراض جو اوپر ذکر ہوا، آخر انہی حضرات کی طرف سے ہے نا جو سلف کے مقررات کو حجت ماننے پر تیار نہیں؟ یا جو محض "قرآن" یا محض "کتاب و سنت" کی حجیت کے دعویدار ہیں؟

تو پھر آیئے دیکھتے ہیں کہ خالی "قرآن" کو ماننا یا محض "کتاب و سنت" کو ماننا کیسے کیسے متعارض نتائج تک پہنچاتا ہے۔

اپنی اَقْول سے کتاب و سنت کو سمجھنے والوں کو آپ نے اس حد تک آزاد خیال تو دیکھ ہی رکھا ہوگا کہ وہ لبرلز کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فلسطین اور کشمیر تک میں کافر کے خلاف

ہتھیار اٹھانے کو فساد کہتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ تک کو کافر کہنے کے روادار نہیں۔ اور ان سب باتوں کی دلیل اپنے تئیں 'کتاب و سنت' سے دیتے ہیں۔

دوسری طرف دیکھیے: موجودہ دور میں دہشتگردی کی اصل بنیاد رکھنے والی مصر کی (شکری مصطفیٰ کی تاسیس کردہ) جماعۃ التکفیر والہجرہ بھی کسی 'سلف' وغیرہ کو نہیں مانتی۔ دورِ حاضر کی جماعتوں اور فرقوں پر عربی انسائیکلوپیڈیا (الموسوعة الميسرة فى الأديان والمذاهب والجماعات المعاصرة) میں مصر کی اس جماعت کے عقائد کی بابت لکھا ہے:

وكل من أخذ بأقوال الأئمة أو بالإجماع حتى ولو كان إجماع الصحابة أو بالقياس أو بالمصلحة المرسلة أو بالاستحسان ونحوها فهو في نظرهم مشرك كافر.

والعصور الإسلامية بعد القرن الرابع الهجري كلها عصور كفر وجاهلية لتقديسها لصنم التقليد المعبود من دون الله تعالى فعلى المسلم أن يعرف الأحكام بأدلتها ولا يجوز لديهم التقليد في أي أمر من أمور الدين۔ قول الصحابي وفعله ليس بحجة ولو كان من الخلفاء الراشدين. (ج 1 ص 336)

> ہر وہ شخص جو ائمہ کے اقوال پر چلے یا اجماع پر چلے خواہ وہ صحابہؓ کا اجماع کیوں نہ ہو، یا قیاس پر چلے، یا مصلحہ مرسلۃ یا استحسان وغیرہ سے دلیل لے، وہ ان کے نزدیک کافر مشرک ہے۔
>
> چوتھی صدی ہجری کے بعد کے سب ادوار ان کے نزدیک کفر اور جاہلیت کے ادوار ہیں۔ اس لیے کہ (ان ادوار میں) تقلید کا بت پوجا جاتا رہا ہے خدا کی عبادت کے مقابلے میں، جبکہ مسلمان پر واجب ہے کہ وہ احکام کو ان کے دلائل سے ہی جانے (!)۔ تقلید ان کے نزدیک امورِ دین میں سے کسی بھی امر کے اندر جائز نہیں۔ صحابی کا قول یا فعل بھی ان کے نزدیک حجت نہیں خواہ وہ خلفائے راشدین میں سے کیوں نہ ہو۔

کیا خیال ہے، اجماع، سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، مواقفِ صحابہ، اقوال ائمہ وغیرہ

ایسی اشیاء کی ہر گز کوئی حجیت نہ ماننے میں "جماعۃ التکفیر والہجرۃ" کا کیا وہی عقیدہ نہیں جو یہاں "المورد" وغیرہ کا ہے؟ دونوں کی حجت براہِ راست کتاب وسنت سے!

اور نتائج کتنے مختلف؟

ایک کے نزدیک یہود و نصاریٰ اور ہندو بھی کافر نہیں۔ جبکہ دوسرے کے نزدیک میں، آپ، سب نماز پڑھنے والے کافر اور مشرک، اور سب کے جان اور مال مباح!

ایک کے نزدیک مرزا قادیانی بھی شاید کافر نہیں۔ جبکہ دوسرے کے نزدیک یہاں کے راسخ العقیدہ ترین مسلمان بھی کافر!

بھائی عقیدۂ سلف کو ماننے والے اللہ کے فضل سے ضلالت اور گمراہی کے جن گڑھوں میں گرنے سے محفوظ رہتے ہیں انہیں جاننے کے لیے آپ عقیدۂ سلف کے کچھ متون ہی پڑھ لیں (جن کا ہم نے اپنے مضمون "عقیدۂ سلف تک رسائی؟" میں کچھ ذکر کیا ہے) آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے کیسے خطرناک مقامات پر ناپیدا کنار بحثوں سے آپ کی جان چھوٹتی اور مقرراتِ سلف کے دم سے ان مقامات پر آپ کو ایک وثوق ملتا ہے۔

’عقیدہ‘ سے الرجک.. یا فکری رعونت؟

تنقیحات

حامد کمال الدین

’عقیدہ‘ کی اجارہ داری بلاشبہ مذموم ہے

درست ہے کہ موجودہ دور میں ایک ایسی مخلوق پائی گئی ہے جو اپنے تئیں ’عقیدہ‘ کے نام پر آسمانی اجارہ رکھتی ہے۔ کس کو اہل سنت میں ماننا ہے، کس کا نام خارج کر ڈالنا ہے، یہ فیصلے اِن حضرات کے حجروں میں ہوتے اور اِن کے کی-بورڈز keyboards سے صادر ہوتے ہیں۔ گویا سب کو اِنہی سے سرٹیفکیٹ لینا ہے! کون سلفی ہے اور کون غیر سلفی، اس کے باقاعدہ انڈیکس ملتے ہیں اور تقریباً ہر سال ریویو review ہوتے ہیں۔ اِن حضرات کی ’گردانِ سلف‘ سنیں تو بزرگانِ سلف بلاشبہ دنیا کی مظلوم ترین جماعت قرار پائیں گے جن کے خودساختہ self-appointed ترجمان فوجداری کے ساتھ ساتھ بداخلاقی اور بے رحمی میں مثال قائم کرتے ہیں۔ یہ سب صحیح ہے اور واقعتاً ایسا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں ’عقیدہ‘ کو بطور لفظ یا بطور مضمون متروک ٹھہرا دینے کی دلیل نہیں۔ ’قرآن فہمی‘ کے نام پر کیا آپ کے یہاں کوئی بے قاعدگی یا کوئی جہالت یا کوئی لٹھ ماری اور فوجداری نہیں ہوتی؟ تو کیا ’قرآن فہمی‘ کو بھی متروک ٹھہرا دیا جائے؟ ’لسانِ عربی‘ یا ’ادبِ جاہلی‘ کے نام پر دین کی چولیں نہیں ہلائی جا رہیں؟ کونسا لفظ یا کونسا عنوان چھوڑا گیا ہے جس کی صورت نہیں بگاڑ دی گئی؟ ایسی باتوں سے عوام الناس کسی چیز سے بدک اٹھیں، عین متوقع ہے۔ لیکن مدعیانِ دانش بھی یہی کام کریں، سمجھ سے بالاتر ہے۔

*****

اور اُن حلقوں کا رویہ اور بھی حیران کن ہے جو 'تصوف' کا تو (لفظاً و مضموناً) سر گرم ترین دفاع کریں گے۔ اسے حدیث میں وارد 'احسان' کی ہی ایک بھولی بھالی صورت قرار دیں گے۔ 'تصوف' کے معترضین کو ایک غیر ضروری سلبیت پر قرار دیتے ہوئے ان کا ایک ایک اشکال رفع کرنے میں عرق ریزی فرمائیں گے۔ 'صحابہؓ کے ہاں ایک لفظ نہ پائے جانے' کے باوجود اس کی اچھی سے اچھی توجیہ ڈھونڈ لانے کی کوشش فرمائیں گے۔ اسلامی اصطلاحات کی لڑی میں 'تصوف' کی گنجائش ثابت کرنے کے لیے ٹھیک ٹھاک زور صرف کریں گے... تاہم 'عقیدہ' کا لفظ سنتے ہی ماتھے پر ایک نہ ختم ہونے والی تیوری اور غایت درجہ انقباض: بھائی یہ کیا عقیدہ عقیدہ کی رَٹ ہے، کیا اس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا، ذرا بتاؤ تو سہی قرآن و حدیث میں یہ لفظ کہاں آیا ہے؟! ایک اچھی بھلی شرعی اصطلاح 'ایمان' کے ہوتے ہوئے آپ کیا ایک نیا لفظ ایجاد کرنے چل دیے؟! 'عقیدہ' لفظ 'ایمان' کا متبادل یا قائم مقام کیسے ہو سکتا ہے؟!

'عقیدہ' لفظ 'ایمان' کا قائم مقام؟

شریعت میں 'احسان' کے ہوتے ہوئے 'تصوف' کا لفظ کس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایجاد ہوا اور اپنے ساتھ اور کیا کچھ لایا، ہمیں نہیں معلوم۔

البتہ 'عقیدہ' کا لفظ 'ایمان' کے قائم مقام کبھی بھی استعمال نہیں ہوا۔ امت کے اندر گمراہیوں اور انحرافات کو ضبط میں لانے، بدعات کے رد اور متقدمین صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے کتاب و سنت سے سمجھے ہوئے کچھ سٹینڈرڈ مضامین جو صفاتِ خداوندی، تقدیر، حقیقتِ کلامِ پاک، حقیقتِ رسالت و نبوت، معجزات، کرامات، ملائکہ، برزخ، آخرت، شفاعت، رؤیتِ خداوندی، جہاد، سنت، جماعت، امامت، بیعت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اجتہاد، مسائل و تعریفِ ایمان، اہل قبلہ سے تعامل وغیرہ ایسے امہات الامور کی بابت

ایک تسلسل کے ساتھ سامنے آئے، اور جس سے اس چیز کی باقاعدہ بنیاد اٹھی کہ ان خطیر موضوعات پر کتاب و سنت کا سٹینڈرڈ فہم جو قرونِ سلف میں وارثانِ نبوت (مدرسہ صحابہ) میں چلا اسی کو الفاظِ وحی کے فہم و تطبیق میں اپنے لیے راہنما دستور مانا جائے اور اس سے ہٹ کر کوئی اپج اختیار کرنے کو گمراہی اور بربادی کا پیش خیمہ... سلف سے مروی ان اشیاء پر مشتمل جو ایک علمی اثاثہ باقاعدہ مدون ہوا[1] ... اس کے لیے لفظِ 'عقیدہ' مستعمل ہوا۔ آج جو نابغہ

---

[1] اِس اثاثہ یا اِس مضمون کا محض اندازہ کرنے کے لیے کسی اصولِ کتب کی لائبریری میں جا کر امت کے اہل اتباع کے ہاں مرجع جانے والی ان دستاویزات پر ایک نظر ڈال آنا آپ کے لیے مفید رہ سکتا ہے۔ "عقیدہ" پر ابھی یہ چند ٹیکسٹ مذکور ہوئے ہیں، ورنہ فہرست طویل ہو سکتی تھی:

- "الفقه الاكبر" منسوب بہ امام ابو حنیفہؒ (متوفیٰ 150ھ)، جو کہ بالعموم اصحابِ ابی حنیفہؒ کے اعتقاد کو ڈاکومنٹ کرنے والا ایک ٹیکسٹ ہے، مؤلف ائمۂ احناف میں سے جو بھی ہو۔
- "الایمان" مؤلفہ امام ابو عبید قاسم بن سلّام ھروی بغدادی (متوفیٰ 224ھ)،
- "اصول السنة" مؤلفہ امام احمد بن حنبلؒ (متوفیٰ 241ھ)،
- "العقيدة" رواية ابی بكر الخلّال عن احمد بن حنبل)
- "شرح السنة" مؤلفہ امام مزنیؒ (م 264ھ)،
- "السنة" مؤلفہ ابن ابی عاصمؒ (م 287ھ)،
- "السنة" مؤلفہ امام مروزیؒ (م 294ھ)،
- "صريح السنة" مؤلفہ امام طبریؒ (م 310ھ)،
- "السنة" مؤلفہ امام ابو بکر الخلّال (م 311ھ)،
- "التوحيد" مؤلفہ امام ابن خزیمہؒ (م 311ھ)،
- متن "الطحاوية" مؤلفہ امام ابو جعفر الطحاویؒ (م 321ھ)،
- "الإبانة عن أصول الديانة" مؤلفہ امام ابو الحسن الاشعریؒ (م 324ھ)،

اٹھ کر کہے کہ یہ سب خطیر مضامین میں تم کو کتاب و سنت سے اپنی اقوال کے ساتھ پڑھا سکھا جاتا ہوں، ہم اس سے صاف معذرت کریں گے، اس کو سننے کی ضرورت تک نہ جانیں گے (کجا یہ کہ اُس کے کہنے پر اس بات کے قائل ہوں کہ 'عقیدہ' پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کہیں گے عقیدہ پڑھنے کی ضرورت تو بے حد ہے البتہ اس کے مقابلے پر تمہاری بات سننے کی ضرورت شاید نہیں ہے) اور اپنے 'دورِ سلف کے عقیدہ' سے ہی چمٹ کر رہیں گے۔ یہاں کے مبتدی نوجوانوں کو بھی ایسے شخص کے 'رجوع الی الکتاب والسنۃ' سے خبردار کریں گے۔ نیز ایسے عقیدہ الرجک شخص کے 'بیانِ ایمان' سے بھی لوگوں کو خوب متنبہ کریں گے۔ ان سب امہات الامور میں دورِ سلف کے اندر جس چیز کی گونج رہی صرف اسی کو فہمِ کتاب و سنت میں اپنے لیے امام کا درجہ دیں گے اور اس سے ہٹنے یا اس کو نظر انداز کرنے کی سوچ ہی کو بدعت کا پہلا زینہ قرار دیں گے۔ اِس معاملہ میں اتنی سی سختی اور اتنی سی صراحت کو اپنے حق میں اتنا ہی ضروری جانیں گے جتنی سی سختی و صراحت یہ حضرات کسی ایسے شخص کے سامنے اختیار کریں گے جو اِنہیں زہر کھانے کا مشورہ دے۔

*****

{ "مقالات الإسلاميين واختلاف المصلين" مؤلفہ ابوالحسن اشعریؒ،

{ "شرح السنة" مؤلفہ امام بربہاریؒ (م329ھ)،

{ "الشريعة" مؤلفہ ابوبکر محمد بن الحسین الآجریؒ (م360ھ)

{ "الإبانة عن شريعة الفرقة الناجية ومجانبة الفِرَق المذمومة" مؤلفہ ابن بطۃ العکبریؒ (م387ھ)،

{ "اصول السنة" مؤلفہ ابن ابی زمنین المالکیؒ (م399ھ)،

{ "شرح اصول اعتقاد اهل السنة والجماعة" مؤلفہ امام لالکائیؒ (418ھ)،

{ "لمعة الاعتقاد" مؤلفہ ابن قدامہ مقدسیؒ (م620ھ)۔

{ "التمسک بالسنن والتحذير من البدع" مؤلفہ امام ذہبیؒ (م748ھ)۔

حق یہ ہے کہ 'ایمان' کا متبادل 'عقیدہ' ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اور لفظ۔ واضح رہنا چاہیے، ہمارے (اور تمام مدرسۂ اہل سنت کے) بیان میں 'عقیدہ' ہرگز لفظ 'ایمان' کے متبادل کے طور پر نہیں لایا جاتا۔ اِن دونوں کی اپنی اپنی دلالت ہے اور اپنا اپنا استعمال۔ مثلاً آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ 'فلاں شخص کے عقیدہ میں خرابی ہے' لیکن یہ کہنا آسان نہ ہو گا کہ 'فلاں شخص کے ایمان میں خرابی ہے'! وجہ یہی کہ اِن دونوں کی دلالت الگ الگ ہے اور یہ بات بحمد اللہ ان لوگوں پر بھی واضح ہے جو لفظ 'عقیدہ' کے استعمال پر معترض ہوتے ہیں۔

لفظِ 'عقیدہ' سے ناگواری.. کچھ غیر سادہ وجوہات!

ہاں یہاں ایک چیز توجہ طلب ہے: طبعی بات تھی کہ جب یہ حضرات کسی کے 'ایمان' پر معترض ہونا اپنے لئے آسان نہیں پاتے اور جو کہ واقعتاً آسان نہیں (بلکہ ممکن نہیں)، تو پھر کسی کے 'عقیدہ' پر معترض ہونے کا تصور بھی اِن اصحاب کے دعوتی و تحریکی مشن میں ناپید پایا جاتا، باوجود اِس کے کہ یہ حضرات بگاڑ کے اِس دور میں مسلم معاشروں کی اصلاح اور تجدید بھی کر دینا چاہتے تھے!

یہیں سے ہمیں اس ناگواری کی کسی قدر سمجھ آتی ہے جو 'عقیدہ' کا لفظ سن کر ماتھے پر بل لانے کا موجب ہوتی ہے: لفظِ 'عقیدہ' کی تاریخی دلالت چونکہ یہ ہے کہ باطل فرقوں کا رد اور بدعات کی بیخ کنی کی جائے اور امت کو دستورِ سلف پر واپس لایا جائے۔ جبکہ اِدھر یہ خیال کہ دین کی تجدید و اقامت اس کے بغیر ہی انجام پا جائے اور محض ایک عدد 'سیاسی تحریک' پر ہی کفایت کی جائے، آخر کیا ضروری ہے کہ ابن حنبل و ابن تیمیہ کی طرح اہل بدعت کی مخالفت مول لیں (بلکہ اس بات کو یہ عقیدہ گریز حضرات شاید کسی 'فرقہ واریت' پر بھی محمول فرمائیں!).. لہٰذا لفظ 'عقیدہ' کی اصطلاح سے یہاں ایک گونا وحشت تو ہونا تھی!

پس لفظِ عقیدہ سے یہ تنفر ہماری نظر میں بے وجہ نہیں۔ اور نہ یہ محض 'اصطلاحات' میں

تنگی یا وسعت کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے امہات الامور میں ائمہ ُسنت کے پورے ایک طرزِ تعامل کو ’کوئی خاص چیز‘ نہ جاننے کی اپروچ ہے۔ نیز ’ایمان‘ اور ’قرآن‘ کی تفسیر میں ایک حد تک آزادی وخود مختاری پانے کی کوشش اور اپنی اقُول چلانے کی دبی خواہش۔ اور یہی بات اصل پریشان کن ہے۔ ورنہ اگر محض اصطلاح کی بات ہے تو ہم اسے ’عقیدہ‘ نہ سہی ’فقہِ اکبر‘ کا نام دے لیتے ہیں (جیسا کہ اصحابِ ابی حنیفہؒ کے ہاں عین اِسی مضمون کے لیے چلتا رہا)۔ یہ عقائدی گمراہیوں کے رد پر تو کم از کم آئیں۔ مدرسہ ُصحابہؓ سے تعلیم یافتہ ائمہ کے بیانِ ایمان و قرآن کو ایک معیار کے طور پر لینے پر تو آمادہ ہوں۔ اصل مسئلہ تو وہاں ہے۔ ورنہ اصطلاح میں مسئلہ کیا ہے؟ ہم اسے ’فقہِ اکبر‘ نہ کہیں ’اصولِ دین‘ کہہ لیں جیسا کہ ائمہ ُشافعیہ کے ہاں عین اسی مضمون کے لیے یہ اصطلاح رائج رہی۔ چلئے اس کے لیے محض ’سنت‘ کا لفظ بول لیتے ہیں جیسا کہ آپ کے لیے کتاب ”اصول السنۃ“ مؤلفہ امام احمد بن حنبلؒ (متوفی 241ھ)، ”شرح السنۃ“ مؤلفہ امام مزنیؒ (م264ھ)، ”السنۃ“ مؤلفہ امام ابن ابی عاصمؒ (م287ھ)، ”السنۃ“ مؤلفہ امام مروزیؒ (م294ھ)، ”صریح السنۃ“ مؤلفہ امام طبریؒ (م310ھ)، ”السنۃ“ مؤلفہ امام ابو بکر الخلّال (م311ھ)، ”شرح السنۃ“ مؤلفہ امام بربہاریؒ (م329ھ)، ”اصول السنۃ“ مؤلفہ امام ابن ابی زمنین المالکیؒ (م399ھ)، ”شرح اصول اعتقاد اھل السنۃ والجماعۃ“ مؤلفہ امام لالکائیؒ (418ھ)، ”التمسک بالسنن والتحذیر من البدع“ مؤلفہ امام ذہبیؒ (م748ھ) ایسے عناوین سے مترشح ہے۔ (واضح رہے ان سب کتب میں لفظ ”سنت“ کا بنیادی ریفرنس ’اعمال‘ کی سنتیں نہیں بلکہ وہ ’سٹینڈرڈ‘ عقیدہ ہے جو دین کے امہات الامور میں امت کے عہدِ اول کے ہاں دستور مانا گیا اور جس سے ہٹنے والے کو اہل بدعت اور اہل فرقہ جانا گیا)۔ غرض ان حضرات کے ہاں مسئلہ ہمیں محض ’اصطلاح‘ سے کچھ بڑا نظر آتا ہے۔ بلکہ کچھ نہیں... خاصا بڑا۔

*****

"عقیدہ" کی اصطلاح کی اصل افادیت یہی ہو سکتی تھی کہ کسی کے 'ایمان' کو موضوعِ بحث بنائے بغیر اُس کے یہاں پائی جانے والی اُن اشیاء کی اصلاح کر دی جاتی جن پر وہ اپنے تئیں "ایمان" رکھتا ہے۔ بلکہ وہاں اُس کے ہاں کوئی بگاڑ یا انحراف پایا جاتا ہے تو بلاخوفِ ملامت اُس کی بھی اُس کو نشاندہی کر کے دے دی جاتی، اور جبکہ یہ بھی حق ہے کہ کسی کے 'عمل' کو چھیڑنے سے اُتنا شدید ردعمل سامنے نہیں آتا جتنا کہ اُس کے 'عقیدہ' کو چھیڑنے سے۔ (مگر یہاں خیال یہ تھا کہ قدیم اور جدید ہر دو جاہلیت کو چھیڑے بغیر ہی معاشرے میں "حق" کی پیش قدمی کے لیے راستے کھلتے چلے جائیں گے!)

چنانچہ یہ اعتراض اگر صرف اُن طبقوں کی طرف سے آتا جنہیں ہم دیکھتے کہ معاشرے میں "عقیدہ" کی جنگ تو بالفعل لڑ رہے ہیں، ہاں صرف 'لفظ' کی حد تک اِس پر کوئی تحفظ رکھتے ہیں.. تب تو اِس کی ایک لفظی وضاحت کر دینا ہم بھی اپنی طرف سے کافی جانتے؛ لیکن نظر یہ آتا ہے کہ مسئلہ محض ایک 'لفظ' کے استعمال یا عدم استعمال سے کہیں بڑا ہے!

چنانچہ بالعموم آپ دیکھیں گے کہ جن طبقوں کے ہاں 'عقیدہ' کی اصطلاح سے ایک شدید قسم کا 'نظریاتی پرہیز' پایا جاتا ہے ان کا یہ 'پرہیز' صرف 'اصطلاح' کی حد تک نہیں رہ جاتا (اگر ایسا ہوتا تو حرج کی کوئی بات نہ تھی)۔ حق یہ ہے کہ وہ 'مضامین' ہی جن کو 'عقیدہ' کے ذیل میں بیان کیا جاتا تھا، خصوصاً جن کو آج کے اِس عقائدی بگاڑ کے بالمقابل سامنے لایا جانا ضروری تھا، وہ اکثر مضامین ہی ہمارے اِن قابل قدر اصحاب کی اصلاحی و تجدیدی مساعی میں شدید حد تک روپوش دیکھے گئے ہیں۔ آج کے اِس انحراف اور ابتداع کے بالمقابل یہ حضرات اگر اُن موضوعاتِ حق کو اٹھا کر کھڑے ہوتے جو یہاں پائے جانے والے شرک اور گمراہی کا سر کچلنے کے لیے ضروری ہیں، پھر تو ہم اِس کو محض ایک 'لفظی' نزاع کے طور پر ہی دیکھتے، اور جو کہ ہرگز کوئی بڑا مسئلہ نہ ہوتا، لیکن واقعہ یہ ہے

کہ 'عقیدہ' کے حوالے سے 'اصلاح' اور 'تجدید' کا وہ پورا نقشہ ہی اِن حضرات کی نظر سے اوجھل ہے جو عرصہ دراز سے یہاں داعیانِ حق آگاہ کا منتظر ہے۔

'عقیدہ' یا 'فقہِ اکبر' یا 'اصولِ دین' ایسی کسی اصطلاح کی ضرورت کیوں پڑی؟

رسول اللہ ﷺ دنیا میں مبعوث ہوئے تو لوگوں کو آپؐ پہ نازل شدہ حقیقت پر ایمان لانا تھا اور یا پھر اُس کا کھلا منکر ہونا۔ آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے اِس بات کا امکان ہی نہ تھا کہ اسلام کا کوئی اور 'ایڈیشن' پایا جاتا۔ البتہ بعد ازاں 'اسلام' کے نام پر ہی بہت کچھ پایا جانے لگا۔ یوں پہلے جس چیز پر 'ایمان' لایا جانا ضروری تھا، اب اُس کی 'چھان پھٹک' کر لینا بھی ضروری ہو گیا تھا کہ آیا یہ وہ چیز تو نہیں جس کو 'اِسلامی حقیقت' میں ٹھونس دینے کی کوشش ہوئی ہے، جبکہ ایسی کوششیں امت کی تاریخ کا ایک معلوم واقعہ ہے اور جو کہ شکلیں بدل بدل کر آج بھی جاری ہے۔ وہ چیز جس کو 'اسلامی حقیقت' میں ٹھونس دینے کی کوشش ہوتی ہے، ہماری شرعی اصطلاح میں اُسی کو 'بدعت' کہا جاتا ہے۔ ہر بدعت گمراہی ہے، مگر سب سے سنگین بدعت وہ ہے جو اسلام کے بنیادی تصورات (عقائد) کے اندر کی گئی ہو۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ امت کے اندرونی محاذ پر صحابہ و تابعین و اتباعِ تابعین سب سے بڑھ کر عقائدی انحرافات کے خلاف ہی سرگرمِ عمل رہے۔

چنانچہ امت کی تاریخ میں ــــ دورِ نبوی کے بعد ــــ بہت جلد ایسا ہو گیا کہ آدمی کو خالص اسلام پر 'ایمان' بھی لانا تھا مگر اس سے پہلے خالص اسلام کا 'پتہ' بھی کرنا تھا (خصوصاً نصوص کے معیاری فہم کے معاملہ میں)۔ یعنی اب اُس کو ایک کی بجائے دو کام کرنا تھے۔ اول الذکر کو تو 'ایمان' ہی کا نام دیا جاتا تھا، البتہ ثانی الذکر پر آدمی کو جو محنت کرائی جانا تھی، اُس کو 'تصحیحِ اعتقاد' کا نام دیا گیا۔

یعنی 'ایمان' کا عمل تو ہو بہو مطلوب تھا، مگر وہ 'چیز' جس پر ایمان لایا جانا تھا، جب محل نزاع ہوئی تو اُس کی تلاش اور تعین الگ سے ضروری ہو گیا تھا۔ اِس 'چیز' کے لیے ائمہ ٔسلف کے ہاں 'صالح اعتقاد' کا لفظ بولا گیا۔ کیونکہ اب وہاں پر 'فاسد اعتقاد' بھی پایا جانے لگا تھا جس پر اگر 'ایمان' لانے دیا جاتا تو یہ ایمان "نجات" کی بجائے 'كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ' کی طرف لے کر جاتا۔

اب جب 'اسلام' ہی کے کئی ایڈیشن پائے گئے، تو لازمی تھا کہ 'ایمان کی دعوت' کے ساتھ ساتھ وہ مستند مندرجات contents بھی موضوعِ بحث آتے جن کو ایمان کے غیر مستند مندرجات سے چھانٹ دینا ضروری تھا۔ اِن مستند مندرجات کیلئے 'عقیدہ' کا لفظ استعمال ہونے لگا اور ان کو قلب وجوارح میں روبزیر کرانے کا نام بدستور 'ایمان' رہا۔

یہی وجہ ہے کہ کسی شخص یا گروہ کے ہاں آپ 'عقیدہ' کے بگاڑ کی نشاندہی کر سکتے ہیں، البتہ 'عقیدہ' کی جگہ اگر یہاں پر 'ایمان' کا لفظ رکھیں یعنی اُس کے ہاں 'ایمان' کے بگاڑ کی نشاندہی کریں، تو یہ بات کسی قدر نامناسب ہو جاتی ہے، جس کا اعتراف اغلباً یہ حضرات خود بھی کریں گے۔ پس اِن دونوں لفظوں کی اپنی اپنی دلالت ہے، نہ تو ان کو خلط کر دینا درست ہو گا اور نہ ان کو ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر لینا۔

'ایمان' کو 'عقیدہ' کے مقابلے پر رکھ کر دیکھنا!

'عقیدہ' کی بجائے آپ 'ایمان' کا لفظ کیوں نہیں بولتے...؟

آپ یہ جان کر حیران رہ جاتے ہیں کہ خود یہی مسئلہ کہ 'ایمان' کی تعریف کیا ہے، لفظ 'ایمان' کا اطلاق کہاں کیا جائے اور کہاں نہیں... اس قدر معرکۃ الآراء رہا ہے کہ اِسی ایک مسئلہ پر امت کی تاریخ میں دو گمراہ فرقے وجود میں آئے، ایک خوارج اور دوسرا مرجئہ۔ علمائے اہل سنت نے اِن دونوں محاذوں پر جو جنگ لڑی، بلکہ آپ غور کریں تو یہ

جنگ آج بھی لڑنا پڑ رہی ہے، خود اس کا نقشہ بھی علمائے اہل سنت سے 'عقیدہ' کے بعض بنیادی مباحث پڑھ کر ہی سمجھ آ سکتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں، 'ایمان' کی درست تعریف کرنے تک کے لیے آپ کو 'عقیدہ' کے کچھ معروف مباحث کی جانب رجوع کرنا ہوتا ہے!

خود قرونِ ثلاثہ ہی میں 'اسلام' کے نام پر پائے جانے والے باطل کے خلاف اگر 'عقیدہ' کی جنگ کی نوبت آ گئی تھی، اور بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کو اِس کے لیے میدان میں اترنا پڑا تھا، تو حضرات آج جب اسلام کی سب بنیادیں ہی ہلا کر رکھ دی گئی ہیں، اور تو اور لا الہ الا اللہ کی حقیقت ہی ایک بڑی سطح پر روپوش کرا دی گئی ہے بلکہ اس کو مسخ کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی.... آج اپنے معاشروں کو 'عقیدہ' کی یہ جنگ لڑ کر دینا ضروری کیوں نہ ہو گا؟

'ایمان' کی محنت سے تو کوئی مفر ہی نہیں، لیکن اس کی تہہ میں اگر 'عقیدہ' کا خالص پن بھی ہو، تو ایک تحریکی عمل کی وہ تصویر سامنے آ جاتی ہے جس کا زمانہ بڑی دیر سے منتظر ہے!

*****

نوٹ: یہ مضمون ہماری ایک گزشتہ تحریر کی توسیع ہے، جو کہ ہماری کتاب "شروطِ لا الہ الا اللہ" کی ایک فصل ہے بعنوان: "کیا عقیدہ لفظ ایمان کا متبادل ہے؟" (جس کا ویب لنک نیچے دیا گیا ہے)۔ واضح رہے، اسلام کے کلاسیکل ڈسکورس کا احیاء اور تحفظ ایقاظ کے مرکزی مضامین میں سے ایک ہے۔ اس موضوع پر ہم اپنی کتاب "فہمِ دین کا مصدر" بھی مطالعہ کے لیے تجویز کریں گے۔

http://eeqaz.com/ebooks/014shurootEd2/014ShurutEd2-22.htm

محمد قطبؒ کی کتاب "دعوت کا منہج" سیاسۃ شرعیۃ والے حصے کو ڈیل نہیں کرتی

تنقیحات

حامد کمال الدین

ہمارے ایک دوست کو موصول ہونے والا ایک سوال جو ہمارے دوست نے آگے ہماری طرف بھیج دیا:

... صاحب السلام علیکم دو دن پہلے ... صاحب نے ایک پوسٹ کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ اسلامی انقلاب کے لئے اب کسی تیسرے اجتہاد کی ضرورت ہوگی جمہوری طریقہ اور طاقت کے استعمال کا طریقہ ناکام ہو چکا ہے.....اس پوسٹ پر آپ نے ذکر کیا تھا کہ محمد قطب کی "دعوت کا منہج "کا مطالعہ کیا جائے تیسرا منہج بیان ہوا ہے...میں اس کتاب کا مطالہ کر چکا ہوں لیکن کچھ باتیں سمجھ نہیں آئیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں شاید آپ سمجھا سکیں...

محمد قطب صاحب کا کہنا ہے کہ اسلامی تحریک کو عقیدے کی دعوت پر معاشرے کو کھڑا کرنا ہوگا... مطلب پہلے عقیدے کی زبردست دعوت دی جائے اسی سے باقی اعمال اور معاملات میں ایک اللہ کی عبادت کا شوق پھوٹے گا پھر جو لوگ اسے قبول کریں انہیں جمع کر کے ان کی تربیت کی جائے بالکل نبوی منہج پہ، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں اختیار کیا.... اور پھر اس تربیت یافتہ جماعت کی توسیع ہوگی۔ اس طرح سے یہ جماعت پورے معاشرے کو اسلامی بنانے کی جدوجہد کرے گی اور معاشرے کی زمین کو اسلامی نظام کے لئے تیار کرے گی۔ اس میں اسلامی نظام زندگی کی تڑپ اور پیاس پیدا کرے گی اور طویل عرصے تک یہی کام ہوگا... یہاں تک بات بالکل صاف ہے۔ الجھن اس کے بعد شروع ہوتی ہے.. دو سوال میرے ذہن میں آتے ہیں حامد کمال الدین صاحب سے تو کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہوتا شاید آپ اس الجھن کو دور کر

دیں... وہ دو سوال یہ ہیں:

1. پاکستانی معاشرہ ۲۰ کروڑ کی آبادی پر مشتمل ہے... کتنا فیصد معاشرہ تبدیل کرنا پڑے گا تب جا کر اسلامی حکومت کے لئے کوئی آثار نظر آئیں گے ؟
2. فرض کریں معاشرہ تیار ہے اسلامی نظام کے لئے لیکن اب وہ آخری اقدام کیا ہوگا جس کے ذرے سے اقتدار اسلام پسندوں کے ہاتھ میں آئے گا؟ جمہوری انتخابات اور طاقت کے استعمال کی ناکامی کی بات تو ہو گئی عاطف صاحب کی پوسٹ پر... تیسرا طریقہ کیا ہوگا؟ کیونکہ دعوت ، تنظیم ، تربیت اور معاشرے کی اصلاح تو لازمی ہیں ہر منہج میں.... آخری اقدام پر کچھ روشنی ڈالئے محمد قطب یا حامد کمال الدین صاحب کی فکر کے مطابق...

جزاک اللہ.. آپ کے جواب کا انتظار رہے گا.

جواب

محمد قطب کی وہ کتاب بھی ایک عمومی لائحۂ عمل دیتی ہے کیونکہ صرف "دعوت" والے حصے سے بحث کرتی ہے۔ سیاسۃ شرعیۃ والا حصہ اس میں آیا ہی نہیں ہے۔ البتہ اس وقت کی صورتحال کے حوالے سے لانگ ٹرم اور شارٹ ٹرم میں کسی ملک کے تحریکی عمل کو کیسے چلنا ہے، یہ نسبتاً ایک مختلف موضوع ہے، اور ہر ملک میں اس کی صورت مختلف ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو 'منہج' کہنا ہی غلط ہے۔ یہ تو ماپ لے کر جوڑا سینے والی ایک بات ہے جو ایک ہی شخص کے لیے چند سالوں کے فرق سے مختلف ہو سکتا ہے، کجا یہ کہ اس کو ایک 'دائمی' حیثیت دے کر ہر کسی کو 'ٹرائی' کروائیں! جہاں تک 'منہج' کی بات ہے تو اس میں صرف دعوت ہی کا بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ محمد قطب نے بیان کیا ہے۔ لیکن 'منہج' کے ماسوا معاملات میں یہ کتاب آپ کی تشفی نہیں کرائے گی کیونکہ یہ اس کا موضوع ہی نہیں ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں صاحبِ تصنیف سے ملاقاتوں کے نتیجے میں الگ سے بھی ہوا۔ لہٰذا کسی الجھے ہوئے سوال میں اس کتاب کو بطور حل پیش کرنا درست نہ ہو گا۔ تاہم آپ کے یہ

دوست دوسرے بہت سے نیک لوگوں کی طرح اگر کسی وجہ سے 'منہجِ انقلاب' سے متاثر ہیں، تو شاید انہیں بہت ابتداء سے ہماری فریکوینسی frequency کو سمجھنا پڑے گا۔ ان کے سوالات کے جواب میں، ہم کوئی خاص متعین اعمال جن پر 'سنت' ہونے کی نص بھی ہو اور اس وجہ سے اس کو 'منہج' سے موسوم کر دیا جاسکے کہ جس میں اب قیامت تک کوئی تقدیم ہو سکتی ہے نہ تاخیر، توجیہ ہو سکتی ہے نہ تبدیل، سرے سے نہیں دیتے۔ کیونکہ ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ جو چیز متعین طور پر ہے اس کا نام ہے دعوت، جس میں ایک معاشرے کی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے شاید بہت دیر تک 'حکومت' میں آنے کا سوال ہی فی الحال بے جا ہو کجا یہ کہ ہم اس کا 'منہج' بھی بیان کرتے پھریں اور اس پر معترضین کے جوابات دیتے اور اس کی جزئیات میں بحثیں کرتے رہیں!

پس پہلی اور بنیادی بات تو یہی ہے: دعوت ایسی ایک مستقل چیز اور سیاسۃ شرعیۃ سے متعلقہ ایک 'ماپ لے کر' دینے والی (tailor-made) چیز۔ دونوں الگ الگ ہیں۔ ان کو خلط نہ کرنا چاہئے۔

آپ اپنے دوست کے ساتھ ہمارے یہ دو مضمون شیئر کرسکتے ہیں۔[1] دونوں اسی موضوع سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن اس کا ویسا جواب جو غالباً آپ کے دوست چاہتے ہیں، ہمارے ہاں سے ان کو نہیں ملے گا۔ وہ انہیں کسی ایسی ہی جگہ سے ملے گا جہاں 'انقلاب' کے مدرسہ سے التزام ہو۔ ہم ان اشیاء کو تدبیری امور میں گنتے ہیں جن کی بابت پیشگی زائچے نہیں بنائے جاتے۔ ہر چیز کے آپشنز اس کے وقت پر دیکھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی بات کے لیے مجبوری اور اضطرار کی نوعیت بھی موقع پر دیکھی جاتی ہے، پہلے سے طے نہیں ہوتی۔

---

1 "اسلامی تحریکی عمل میں چند جذری ترمیمات، سفارشات"۔ "کلاسیکل منہج اور انقلابی منہج کا فرق"۔ دونوں مضمون حالیہ شمارہ میں شامل اشاعت ہیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ پر کڑی تنقید

ایک منکر کو ہٹانے میں اس سے بڑے منکر کی راہ ہموار کرنا؟

تنقیحات

حامد کمال الدین

ایک نہایت خوب دینی شناخت رکھنے والی طلبہ تنظیم چارسدہ یونیورسٹی کے اندوہناک واقعہ پر اپنا افسوس اور سوگ ظاہر کرنے میں مغربی طرز پر موم بتیاں وغیرہ ایسی تقریبات منعقد کر بیٹھی... تو کچھ نیک حضرات کی جانب سے سوشل میڈیا پہ اس پر ضرورت سے زیادہ کڑی تنقید ہوئی۔ یہ نوٹ کرتے ہوئے، یہ تحریر سامنے لائی گئی:

بھائی اگر تو 20 اسلامی تنظیمیں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دین بیزار ماحول میں آپ کی اسلامی ضرورت پوری کرنے کو موجود ہیں... تو چلیں ایک تنظیم کو فارغ کر دیتے ہیں؛ اور اس کی موم بتیوں والی تصویر نشر کر کے اور اس پر تُند و تُرش کامنٹ لگا لگا کر نوجوانوں کو اس سے بددِل کر دیتے ہیں؛ کہ 'اور بازار سے لے آئیں گے گر ٹوٹ گیا'!

.کیا جاتا ہے؛ ایک تنظیم ہی تو ہے؛ اگر دلوں سے نکلی، اور اچھے لوگ اس سے دُور ہوئے، تو بھی کیا ہے؛ اور تنظیمیں بڑی ہیں اس خلا کو پُر کرنے کے لیے؛ نوجوانوں کے لیے ہم کوئی مزید بحران تھوڑی پیدا کر رہے ہیں ایسا کر کے! تعلیمی اداروں کی دنیا میں مسلمانوں کا کوئی کام رکنے والا تھوڑی ہے صرف ایک عدد تنظیم کو کھو کر!

نوجوانوں کا تو، ایسا کر کے، ہم ایک مسئلہ ہی حل کر رہے ہیں! کیا خیال ہے؟

لیکن بھائی جب ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے... تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ 'غیرتِ دینی' وغیرہ ایسے نیک جذبہ کے تحت آپ نوجوانوں کے لیے فی الحال کیسے کیسے بحران پیدا کر رہے ہیں؟

ایک تنظیم جیسی بھی ہے، اور بلاشبہ ایسی بہت سی باتیں اس کی قابلِ مؤاخذہ ہی ہیں، لیکن جو نوجوان ہماری یہ باتیں سن کر اس سے بددِل ہوں گے، کیا ہم نے یہ بھی سوچا: ان کو دینے کے لیے فی الحال ہمارے پاس ہے کیا؟ (ویسے کیا ضروری ہے کہ یہ سوچا جائے!)

کیا اس میں کوئی شرعی مانع تھا کہ جس قدر ہمارے بس میں تھا ہم اپنے ان بھائیوں اور ان کے ذمہ داران کو پرائیویٹ طور پر ہی ایک شرعی خلاف ورزی پر متنبہ کرتے۔ اور اگر ایک بات ہمارے بس سے باہر تھی... یعنی ہمیں ڈر تھا کہ عوام میں نشر کیے بغیر وہ ہماری بات پر مُتَوجِہ ہی ہو کر نہ دیتے (رہا یہ آپ کی بات مانی جائے، تو وہ تو اِس طریقے سے بھی شاید ہونے والا نہیں) تو اس صورت میں ہمارے پاس شریعت کا ایک معلوم اصول ہے: "لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا"۔ ایک آدمی بس اتنی ہی چیز کا مکلف ہے جو اس کے بس میں ہے۔

بھائی ان دو باتوں میں لائن کھینچ رکھنا ضروری ہے:

1. ایک ہے ایک برائی کے ذمہ دار کسی شخص یا اشخاص کو اس پر متنبہ کرنا اور ممانعت کرنا۔
2. اور دوسرا ہے کچھ اچھے لوگوں، یا عام سادہ لوح مسلمانوں کی کسی بڑی تعداد کو، اس سے دُور بھی کر ڈالنا۔

یہ دو الگ الگ باتیں ہیں، برادرم۔ پہلی چیز اگر آپ کے بس میں نہیں یا پہلی چیز کی حد تک رہنا آپ کے خیال میں مؤثر نہیں... تو بھی دوسری چیز تک چلے جانے کے لیے الگ سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ شرعی قواعد کی رُو سے آیا اندریں حالات یہ جائز ٹھہرتی ہے یا نہیں؟ غرض پہلی چیز دوسری کو ہر حال میں مستلزم نہیں۔ دوسری چیز کسی

حالت میں جائز ہو گی تو کسی حالت میں ناجائز ہی رہے گی؛ جیسا کہ ہماری اِس وقت کی صورتحال میں ہے۔

بھائی امر بالمعروف و نھی عن المنکر کوئی دل کی بھڑاس نکالنے کا نام نہیں؛ ایک خالص بصیرت کا عمل ہے؛ اور خاص اہل علم کی راہنمائی میں انجام دینے کی چیز۔ اس کے لیے جذبۂ نیکی جس قدر درکار ہے اسی قدر صبر و برداشت اور مآل کا اندازہ رکھنا بھی آدمی پر لازم ہے۔

علمائے منہج ہمیں بتابتا کر رہ گئے کہ نھی عن المنکر کی شروط میں سے ایک باقاعدہ شرط یہ ہے کہ آپ بغور دیکھیں: ایک منکر کو ہٹاتے ہٹاتے آپ اس سے بھی بڑے کسی منکر کی راہ تو کہیں ہموار نہیں کر رہے؟ لیکن ہم ہیں کہ کسی بڑی اور وسیع تر تصویر کو دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

ہمارا دیکھنا ہے، فقہ اور بصیرت کی غیر موجودگی میں 'جذبۂ نیکی' بھی آخر ایک بحران ہی بن جاتا ہے۔

یعنی ایک بحران یہ کہ: کچھ کمزور نفوس جاہلیت کی چکاچوند کے زیر اثر اسلام کی خلاف ورزی کر لینے کی جانب مائل ہوں (موم بتیوں وغیرہ ایسا واقعہ؛ جو بلاشبہ اسلام کی خلاف ورزی ہے)۔ پھر دوسرا بحران یہ کہ: کچھ نیک نفوس اس پر ردعمل لانے میں دین کا باقی ماندہ نقصان کر دیں۔ یوں یہ دونوں طبقے برابر کشتی کو بھنور میں دھکیلتے چلے جائیں!

*****

شاید آپ کا خیال ہو کہ میں ایک بات کی سنگینی بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں۔ بخدا پچھلے چند سالوں میں میں نے اتنے زیادہ نوجوانوں کو اسلامی جمعیت طلبہ کو خیر باد کہتے دیکھا ہے کہ آدمی چکرا کر رہ جائے۔ اور نوجوان بھی عام سے نہیں۔ نہایت دیندار اور پابندِ شریعت۔ یہاں پائے جانے والے کچھ کم نظر فتووں نے دراصل انہیں باور کرایا تھا کہ فلاں اور فلاں شرعی خلاف ورزیوں کے باعث ایک تنظیم کو چھوڑ جانا ہی غیرتِ شرعی کا

تقاضا ہے۔ شاید بہت کم لوگوں نے سوچنے کی زحمت کی ہو کہ اتنا اچھا نوجوان اتنی بڑی تعداد میں آخر کیا ہوا۔ (اور یہ دیکھنا تو ضروری بھی کیا ہے!)۔ ان میں کی ایک تعداد انتہاپسند تنظیموں کے ہتھے چڑھی۔ اور ایک بڑی تعداد سرے سے معطل اور ناکارہ۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر نقصان۔ بخدا صالح نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد اگر صبر کا دامن تھامے رکھتی اور اپنے اسی فورم سے تعلیمی اداروں میں سرگرم رہتی تو آج یہ تعلیمی ادارے اسلامی آوازوں سے یوں سائیں سائیں نہ کرتے اور یہاں الحاد اس قدر نہ دندنا رہا ہوتا۔

ابھی حال ہی میں متعدد طلبہ مجھ سے سوال کرنے آئے ہیں کہ فلاں اور فلاں شرعی خلاف ورزی کے باعث میں وہ تنظیم چھوڑ دوں یا نہیں؟ ان کا کہنا تھا 'ایسی ایسی' چیزیں دیکھ لینے کے بعد اس میں باقی رہنے کی کیا تُک ہے۔ اور ایسے ہر نوجوان کو میرا سوال تھا: اس تنظیم کو چھوڑ دینے کے بعد آپ اپنے دینی فرائض کی انجام دہی کے معاملہ میں کیا انتظام اپنے پاس رکھتے ہیں؟ ہر کسی کا جواب تھا: کچھ نہیں! کسی نے اضافہ کیا: 'ذاتی اصلاح' کروں گا۔

میں ایسے تمام نوجوانوں سے عرض کروں گا: بھائی اِس 'ذاتی اصلاح' والے تصور نے ہی ہمارے "اجتماعی معاملے" کو آج اس نوبت کو پہنچا دیا۔ "اجتماعی فرائض" بجائے خود اور مستقل بالذات طور پر شریعت کا تقاضا ہیں؛ 'ذاتی اصلاح' کو ان کے 'متبادل' کے طور پر لانا یا دیکھنا ہی درست نہیں۔ ہاں یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ "اجتماعی فرائض" کی عدم انجام دہی یہ نوبت لاتی ہے کہ 'ذاتی اصلاح' بھی آخر دم توڑ جاتی ہے۔ "اجتماعیت" میں صبر کرنا، جس قدر ہو سکے انکار علی المنکر کرنا، ورنہ اپنا فرض ادا کرنے پر تو بہرحال توجہ رکھنا، البتہ اجتماعیت کو کسی صورت کمزور نہ ہونے دینا... دینداری کو معاشرے میں لازماً کچھ بڑی بڑی اکائیوں کی صورت میں سامنے لانا اور 'فرد' میں کبھی محصور نہ ہونے دینا... یہ فریضہ کسی حال میں نہ چھوٹنے پائے۔

*****

پھر اس مسئلہ کی ایک اور جہت بھی ہے...

بھائی اب تو یہ نوبت آئی ہوئی ہے؛ اور قومی فضا اسلامی ایجنڈے سے خالی یوں سائیں سائیں کر رہی ہے... کہ ہم تو آج اس حق میں نہیں کہ تحریکِ انصاف یا مسلم لیگ وغیرہ کو داخلی طور پر لبرلز کی گود میں پڑنے دیا جائے۔ ہم تو ان پارٹیوں میں موجود اسلامی عنصر کو آج یہ تلقین کرتے ہیں کہ اپنی کسی کمزوری یا پسپائی سے وہاں لبرلز کے ہاتھ مضبوط نہ ہونے دیں؛ اور صبر اور دانائی سے کام لیتے ہوئے اسلامی ایجنڈا کے لیے وہاں جس قدر کچھ لیا جا سکتا ہو لینے کی کوشش کریں؛ کیونکہ باہر کوئی اسلامی پارٹی اس وقت صورتحال پر اثرانداز ہونے کی پوزیشن میں سرے سے نہیں ہے؛ اور جبکہ لبرلز کی پوری کوشش بھی ہے کہ وہ ان پارٹیوں پر اثرانداز ہونے کے ذریعے ملک پر اثرانداز ہو کر اپنے سب خواب پورے کریں۔

تو بھائی اگر ہم تحریکِ انصاف اور مسلم لیگ کو اندریں صورت لبرلز کی آغوش میں جانے دینے کے روادار نہیں، تو کیا ایک اسلامی جمعیت کو موم بتیوں کے حوالے ہونے دیں گے؟ https://goo.gl/ZWtW0z

*****

ہماری اس تحریر پر آنے والا ایک سوال:

شیخ کیا منکر کی نشاندہی نہیں کی جانی چاہیے۔ غلطی کا احساس دلانا اگر مقصد ہو تو بھی درست نہیں؟

چونکہ تنظیمات کا معیار بھی یہ بن چکا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، اس لئے بانگ دھل تنقید کی جگہ انفرادی تنبیہ کو خاطر میں ہی نہیں لایا جاتا۔

رہنمائی درکار ہے۔

(لنک: https://goo.gl/bv2Mn4)

جس کا ہماری جانب سے یہ جواب دیا گیا:

'منکر کی نشاندہی' یا 'غلطی کا احساس دلانا' کیوں ضروری نہیں بھائی، اگر وہ اس چیز کا باعث نہیں بن رہا جس سے ہماری تحریر میں متنبہ کیا گیا ہے؛ اور اس سے شاید آپ کو بھی اتفاق ہو۔

بات ہو رہی ہے دراصل ایک اپروچ کی۔ بہت سی آوازیں اس وقت اس تنظیم میں موجود ''شریعت سے غیر معمولی تمسک رکھنے والے'' عنصر کو خود تنظیم ہی سے بددِل کر رہی ہیں۔ یہ ''شریعت سے غیر معمولی تمسک رکھنے والا'' عنصر ہی دراصل اس تنظیم کا روحِ رواں رہا ہے، چاہے فیصلہ سازی میں اس کو بہت دخل نہ بھی رہا ہو، لیکن تنظیم کی عمومی فاعلیت میں اس کو بہت زیادہ دخل رہا ہے، جس کے سبب جاہلیت اس کے آگے پسپا ہوتی رہی ہے۔ مگر اس صالح عنصر کے پیچھے ہٹتے چلے جانے سے تعلیمی اداروں میں ہمارا کباڑا ہو کر رہ گیا ہے (تعلیمی اداروں میں ہماری پسپائی کے پیچھے گو اور بہت سے عوامل کارفرما ہیں، مگر وہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں)۔ اب کل سے ہمیں بھی سوال موصول ہو رہے ہیں کہ حضرت 'موم بتیوں' کے بارے میں فرمائیں، یہ عمل کیسا ہے۔ ظاہر ہے ہم اسے ٹھیک کیسے کہہ سکتے ہیں۔ جس کا مطلب ہوا کہ 'پابندِ شریعت' حضرات غور میں پڑ جائیں کہ ایسی تنظیم کے ساتھ رہنا اب کیسا ہے؟! اِس پس منظر میں ہماری یہ تحریر آئی ہے۔

بھائی 'منکر کی نشاندہی' اگر اس تنظیم کے صالح عنصر کو تنظیم سے بددِل نہیں کر رہی تو 'نشاندہی' میں کوئی حرج نہیں۔ بصورتِ دیگر، میں کہوں گا حرج ہی حرج ہے۔ اور ایسی صورت میں 'نشاندہی' کو ذمہ داروں تک محدود رکھنا کہیں زیادہ قرینِ صواب ہو گا اور ''خیر خواہ'' و ''ذمہ دار'' رویّوں کا کہیں بڑھ کر آئینہ دار۔

اللہ اعلم

https://goo.gl/rFmt5T

ایماندار افسر اور ناجائز مقامات کی سیکورٹی، ایک اشکال

مدیرِ ایقاظ

تنقیحات

عرصہ پیشتر، ہماری ٹائم لائن پر جولائی 2015ء کے اداریہ کا ایک اقتباس نشر ہوا تھا:

ایک دیانتدار، فرض شناس، کردار کا کھرا اور اعلیٰ مقاصد پر یقین رکھنے والا پولیس آفیسر اس پورے علاقے میں پائے جانے والے سینکڑوں واعظوں پر بھاری ہے۔ برائی کو ختم کرنے اور خیر کو ممکنہ حد تک معاشرے پر حاوی کرانے میں جو کردار ایسے ایک نڈر، خداخوف، باکردار پولیس افسر کا ہے وہ مبلغوں کے ایک جمِ غفیر کا نہیں ہو سکتا۔ کس کو اِس میں شک ہے؟ مگر ہم سینکڑوں اسلامی تنظیمیں اور لاکھوں مساجد مل کر ایسے کتنے دیانتدار، فرض شناس، کردار کے کھرے اور اعلیٰ مقاصد پر یقین رکھنے والے پولیس آفیسر اِس معاشرے کو دے سکے ہیں؟ کیا یہ بات لمحۂ فکریہ نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ خال خال کہیں ایسا دیانتدار، چمکتے کردار کا مالک پولیس آفیسر دیکھنے کو مل جائے تو خود ہم 'مصلحین' اس کو حیران ہو کر دیکھتے ہیں کہ آخر یہ کیسے ہو گیا... اور بے شمار جگہوں پر ہم خود ایسے فرشتہ صفت افسر کا ذکر کرتے ہیں!!!! ظاہر سی بات ہے پولیس کے محکمے میں ایسا کوئی اکادکا صاف ستھرا دانہ محض اتفاقات کے زمرے میں شمار ہونے والی چیز ہے نہ کہ یہاں پر لانچ کروائے گئے کسی باقاعدہ پروگرام کی پیداوار۔ یہاں سے آپ پر کھلتا ہے کہ صالحین و مبلغین یہاں اپنی تمام تر دیوہیکل سرگرمی کے باوجود معاشرتی محاذوں پر سرگرم ہونے کے لحاظ سے سرے سے غیر موجود اور منظرنامے سے مکمل غائب ہیں۔ ان شعبہ ہائے

حیات کو دیکھیں تو گویا اصلاح کار یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ ہوں گے اپنے حجروں اور چِلّوں اور اپنے تنظیمی پروگراموں میں، جہاں شاید ان کے پاس کان کھجانے کی فرصت نہ ہوگی اور محنت کر کر کے گلے تھکے اور پاؤں سوجھے ہوں گے، مگر معاشرے میں تو یہ کہیں نہیں ہیں۔ دور دور تک نہیں ہیں۔ (ایقاظ کا تازہ اداریہ: فاعلیت کا فقدان کلاسیکل اور انقلابی منہج کا فرق)

اس پر ایک معزز قاری کا اعتراض آیا:

اگر وہ ایمانداری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے ملکی قانون کے مطابق کسی پوجی جانے والی قبر ، کسی فحاشی پھیلاتے سینما گھر یا کسی زنا کے اڈے بازار حسن کی حفاظت کر رہا ہو تو کیا فائدہ ایسی ایمانداری کا ؟ (لنک: https://goo.gl/fe21IX)

اس پر ہم اتنا عرض کریں گے:

اعتراض میں اٹھائے گئے امور کو ہم دو جہت سے دیکھتے ہیں، اور یہ دونوں، اِن امور کو دیکھنے کی درست اور صالح جہتیں ہیں:

پہلی جہت:

ان امور میں محظوراتِ شرعیہ کا اعتبار کرنا۔ یعنی ان امور کے اندر شرعی ممانعتیں ہی دیکھنا۔ تاہم ایسے کسی اندیشے کے تحت اِس تمام راستے سے کنارہ کشی کرلی جانے کی صورت میں یا تو معاشرے کے اندر اسلامی سیکٹر کو درپیش کسی اہم تر فریضہ کا ترک لازم آرہا ہو، یا کسی سنگین تر ضررِ شرعی کا وقوع لازم آرہا ہو۔ یعنی ان چیزوں کو شرعاً ممنوع ہی جاننا، اور ان سے از حد بچنے ہی کی کوشش کرنا، تاہم اس امکان کو سامنے رکھتے ہوئے کہ کسی وقت آدمی کو اِن شرعی قباحتوں کا سامنا ہو سکتا ہے، اگر آدمی سرے سے یہ راستہ ہی نہ چلے تو مسلم فرد یا اسلامی سیکٹر کے کچھ اہم تر اور ناگزیر تر فرائض کا ترک ہو جانا یقینی ہو، یا کچھ سنگین تر شرعی

نقصانات کا مسلم فرد یا اسلامی سیکٹر کے حق میں واقع ہو جانا یقینی ہو (اور حق تو یہ ہے کہ ایک مسلم معاشرے کا مکمل طور پر فاسقوں اور دین دشمنوں کے ہاتھ میں چلا جانا یقینی ہو؛ جس سے دین کے وہ بہت سے جوانب جن پر آج آپ عمل پیرا ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ آپ کے لیے ناممکن ہوتے چلے جائیں گے)... تو اس صورت میں اس شرعی قاعدہ پر چلتے ہوئے کہ [ایک بڑے فرض کے ترک سے بچنے کے لیے چھوٹے فرض کا ترک آدمی کے حق میں گناہ نہ ہو گا۔ نیز ایک سنگین تر گناہ یا ضررِ شرعی سے بچنے کے لیے ایک کمتر گناہ یا ضررِ شرعی کا ارتکاب آدمی کے حق میں گناہ نہ ہو گا] آدمی کا وہ راستہ چلنا اور ایسے شرعی محظورات کے اندیشے سے اس راستہ کو اپنے اوپر حرام نہ کر لینا۔ یہ ہے باب "تعارض الحسنات والسیئات" کا۔ پیش ازیں اپنے ایک مضمون[1] میں ہم ابن تیمیہ کے مجموع الفتاویٰ کی فصل "فی تعارض الحسنات أو السیئات أو هما جمیعاً" کا ایک بڑا حصہ اِس موضوع پر اردو استفادہ کے ساتھ دے چکے ہیں۔ اس کا ایک اقتباس یہاں بھی پیش ہے:

وَمَعْلُومٌ أَنَّهُ مَعَ كُفْرِهِمْ لَا بُدَّ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ عَادَةٌ وَسُنَّةٌ فِي قَبْضِ الْأَمْوَالِ وَصَرْفِهَا عَلَى حَاشِيَةِ الْمَلِكِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ وَجُنْدِهِ وَرَعِيَّتِهِ وَلَا تَكُونُ تِلْكَ جَارِيَةً عَلَى سُنَّةِ الْأَنْبِيَاءِ وَعَدْلِهِمْ وَلَمْ يَكُنْ يُوسُفُ يُمْكِنُهُ أَنْ يَفْعَلَ كُلَّ مَا يُرِيدُ وَهُوَ مَا يَرَاهُ مِنْ دِينِ اللَّهِ فَإِنَّ الْقَوْمَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَكِنْ فَعَلَ الْمُمْكِنَ مِنْ الْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَنَالَ بِالسُّلْطَانِ مِنْ إكْرَامِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ مَا لَمْ يَكُنْ يُمْكِنُ أَنْ يَنَالَهُ بِدُونِ ذَلِكَ وَهَذَا كُلُّهُ دَاخِلٌ فِي قَوْلِهِ: {فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ}. فَإِذَا ازْدَحَمَ وَاجِبَانِ لَا يُمْكِنُ جَمْعُهُمَا فَقُدِّمَ أَوْكَدُهُمَا لَمْ يَكُنْ الْآخَرُ فِي هَذِهِ الْحَالِ وَاجِبًا وَلَمْ يَكُنْ تَارِكُهُ لِأَجْلِ فِعْلِ الْأَوْكَدِ تَارِكَ وَاجِبٍ فِي الْحَقِيقَةِ. وَكَذَلِكَ إذَا اجْتَمَعَ مُحَرَّمَانِ لَا يُمْكِنُ تَرْكُ أَعْظَمِهِمَا إلَّا بِفِعْلِ أَدْنَاهُمَا لَمْ يَكُنْ فِعْلُ الْأَدْنَى فِي هَذِهِ الْحَالِ مُحَرَّمًا فِي الْحَقِيقَةِ وَإِنْ سُمِّيَ ذَلِكَ تَرْكُ وَاجِبٍ وَسُمِّيَ هَذَا فِعْلُ مُحَرَّمٍ

[1] واقعۂ یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر۔ شمارہ جولائی تا ستمبر 2013ء۔

بِاعْتِبَارِ الْإِطْلَاقِ لَمْ يَضُرَّ. وَيُقَالُ فِي مِثْلِ هَذَا تَرْكُ الْوَاجِبِ لِعُذْرٍ وَفِعْلُ الْمُحَرَّمِ لِلْمَصْلَحَةِ الرَّاجِحَةِ أَوْ لِلضَّرُورَةِ؛ أَوْ لِدَفْعِ مَا هُوَ أحرم-[2]

پھر علاوہ اُن (اہل مصر) کے کفار ہونے کے، یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ لازماً اُن (اہل مصر) کا کوئی معمول اور کوئی دستور ہو مالیات کی وصولی کے معاملے میں بھی اور مالیات کے مصارف کے معاملہ میں بھی جو کہ بادشاہ کے درباریوں پر بھی خرچ کیے جاتے ہوں گے اور اس کے اہل خانہ پر بھی اور اُس کے لاؤ لشکر پر بھی اور اس کی رعایا پر بھی، اور (اہل مصر کے) یہ اخراجات اُس دستور پر رائج نہ ہوں گے جو کہ انبیاء کی سنت اور ان کے عدل کی شان ہے۔ جبکہ یوسف علیہ السلام کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تمام امور انجام دے لیں جو وہ چاہتے ہیں اور جنہیں وہ دینِ خداوندی کا حصہ جانتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اُن لوگوں نے ابھی یوسف علیہ السلام کی دعوت پر لبیک ہی نہیں کہہ رکھا ہوا تھا۔ لیکن جتنا بس میں تھا اتنا عدل اور احسان یوسف علیہ السلام نے ضرور کیا۔ نیز اس اقتدار سے کام لے کر اپنے خاندان کے اہل ایمان کو اعزاز واکرام دینے میں کامیاب رہے جو کہ اس کے بغیر وہ نہ دے سکتے تھے۔ یہ سب اللہ رب العزت کے اس قول میں داخل ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ”اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے بس میں ہے“۔ پس جب دو فرض آپس میں ٹکرائیں اور دونوں میں جمع ممکن نہ ہو اور ایسی صورت میں دونوں میں سے اہم فرض کو مقدم کر دیا جائے تو وہ دوسرا فرض (جو چھوٹ گیا) اُس صورت میں فرض ہی نہ رہے گا، اور اس کا تارک جو کہ اُس سے اہم تر فرض کو ادا کرنے کے باعث اس کا تارک ہوا بلحاظِ حقیقت تارکِ فرض نہ ہو گا۔ اسی طرح؛ جب دو گناہ کے کام اکٹھے

[2] مجموع فتاوى ابن تيمية جلد 20 ص 56-57 فصل: ”فى تعارض الحسنات أو السيئات أو هما جميعاً،، دیکھئے ابن تیمیہ کی اس عبارت کا ویب لنک:

http://shamela.ws/browse.php/book-7289#page-9880

ہو جائیں اور ان میں سے زیادہ بڑے گناہ سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو سوائے اس کے کہ ان دونوں میں سے چھوٹے گناہ کو اختیار کر لیا جائے، تو ایسی صورت میں چھوٹا گناہ بلحاظِ حقیقت گناہ نہ ہو گا۔ ایسی صورت میں وہ جو ترکِ واجب ہوا تھا اُسے ایک عمومی معنٰی میں ترکِ واجب کہہ بھی لیا جائے، یا یہ جو ارتکابِ حرام ہوا ہے اُسے ایک عمومی معنٰی میں ارتکابِ حرام کہہ بھی لیا جائے، تو مضائقہ نہیں۔ ایسی صورت میں جو (صحیح تر) لفظ بولا جائے گا وہ ہے: ترکِ واجب بہ سببِ عذر، یا ارتکابِ حرام بہ سبب مصلحتِ راجحہ یا ضرورۃ۔ یا یہ کہ ایک حرام کو اختیار کرنا اس لیے کہ اس سے بڑے حرام کو دفع کرنا ہے۔

دوسری جہت:

تاہم اعتراض میں مذکورہ افعال یا ان میں سے بعض کو دیکھنے کی ایک دوسری جہت بھی ہے، اور وہ ہے انسانی جانوں کی حرمت، خواہ وہ بعض شرک یا فسق اور بدعت کے کاموں میں ہی ملوث کیوں نہ ہوں۔

اب مثال کے طور پر عیسائیت کو ہم ایک باطل مذہب ہی کہیں گے۔ اس کے راستے کو شرک اور ہلاکت ہی گردانیں گے۔ لوگوں کو اس سے تائب ہو جانے کی دعوت اور تلقین بھی شد و مد سے کریں گے۔ تاہم دارالاسلام میں لوگوں کو عیسائی رہنے اور اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کا اختیار بہر حال دیں گے، جن میں ان کا گرجے رکھنا اور گرجوں میں جانا آنا بھی شامل ہے۔ نہ صرف اس کفر پر رہنے اور عمل پیرا ہونے کا ان کو اختیار دیں گے بلکہ دارالاسلام میں ان کی حفاظت اور سیکورٹی کو اپنا ذمہ بھی جانیں گے۔ اب مسلمانوں کی پولیس کی کوئی گارڈ ایک گرجے کی سیکورٹی پر متعین ہے تو اس کو دیکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ دیکھو یہ ظالم رب العزت کے ساتھ شرک ایسی ایک سرگرمی کے پہرے اور

راکھی پر کھڑا ہے! لیکن اسی عمل کو دیکھنے کا ایک انداز یہ ہے کہ ان لوگوں کو شرک کا بیان کر کے دے دینا اور اس پر خدا کے عذاب سے خبر دار کر دینا ہمارا فرض ہے (فرضِ کفایہ نہ کہ فرضِ عین) البتہ ان کو جبراً اس سے روک دینے کا نہ صرف ہم کو اختیار نہیں بلکہ ان کی جان و مال کی حرمت ہماری شریعت سے ثابت ہے اور وہ ان کو عین اس وقت بھی حاصل ہے جس وقت وہ اپنی کسی شرکیہ سرگرمی میں مصروف ہوں، جس پر ان کا حساب کرنا خدا کا کام ہے نہ کہ ہمارا۔ لہٰذا مسلم سوسائٹی کو ان کی جان و مال کی حفاظت کو بہرحال یقینی بنا رکھنا ہے۔ اِس بات کا اُس بات سے کوئی تعارض نہیں۔

اسی طریقے سے، دارالاسلام میں برائی یا فسق و فجور کے بعض اڈے ہیں۔ فرض کریں خود آپ ہی کو آج حکومت مل جاتی ہے۔ کیا فسق و فجور کی ان سب سرگرمیوں کو آپ فی الفور ختم کر دیں گے؟ ہو سکتا ہے آپ ان میں سے بعض برائیوں پر فی الفور ہاتھ ڈال دیں البتہ بعض کو ختم کرنے کے لیے کچھ وقت لیں۔ تو کیا جس دوران آپ حاکم ہوتے ہوئے ایک برائی کا خاتمہ نہیں کر پائے، اس برائی میں ملوث لوگوں کی جان و مال کی حرمت کو موقوف جانیں گے؟ یا ان کی جان و مال کی سیکورٹی آپ کی ذمہ داری ہو گی؟ ظاہر ہے ان کو جان و مال کی سیکورٹی فراہم کرنا بدستور ریاست / مسلم معاشرے کی ذمہ داری ہو گی۔ یہ سب کچھ انسانی جان و مال کی حرمت کے باب سے۔ اندازہ کر لیجئے اُس وقت بھی جب آپ معاشرے میں کامل اختیارات کے مالک ہوں! غرض مسلم سوسائٹی پر بعض اشیاء اپنی جگہ فرض ہیں اور وہ لوگوں کے فسق و فجور کے باوجود موقوف نہیں ہو جاتیں۔ ان امور کو دیکھنے کا یہ بھی ایک درست اعتبار ہے۔

جہاں تک پوجی جانے والی قبروں کا تعلق ہے، تو مسلم معاشرے میں حاکم ہوتے ہوئے بشرطِ استطاعت آپ کو ان سرگرمیوں کو ختم کرانا ہو گا۔ تاہم اس میں بھی اگر کسی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے، یا اس کے لیے پوری استطاعت پانے کا انتظار ہے، تو اُس

دوران انسانی جان و مال کی حرمت بہر حال موقوف نہیں کر دی جائے گی، اور لوگوں کو ان کی جان و مال کا تحفظ دے رکھنا پھر بھی آپ کی ذمہ داری رہے گی۔ اقتدار رکھتے ہوئے بھی!!! تو اقتدار کے بغیر کیوں نہیں؟

غرض یہ تحفظ سوسائٹی کی بنیادی ذمہ داریوں میں آتا ہے، باوجود اس کے کہ اُن کی وہ سرگرمیاں نہایت قبیح اور ان میں سے بعض تو (بشرطِ استطاعت) آہنی ہاتھ سے ختم کر دی جانے کے قابل ہیں۔ المختصر؛ یہ چیز بطورِ جنس مسلم سوسائٹی کے معلوم فرائض میں آتی ہے۔ اور اس کو دیکھنے کی یہ جہت اِس وقت بھی متعلقہ relevant ہے۔

*****

اس سے پہلے ہم اپنے کسی مضمون [3] میں یہ بات کر چکے ہیں کہ نوجوانوں کو صرف "عقیدہ" کی پختگی دے دینا کافی نہیں ہے جب تک ان کو "فقہ" کی وسعت کا بھی اندازہ نہ کروا دیا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ضروری ہیں، ورنہ معاملہ کسی ایک جانب کو بہت بری طرح لڑھک سکتا ہے۔ اور اس وقت عملاً ایسا ہی ہے۔ جبکہ "چلنے" کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے اس کا نام "توازن" ہے۔

بیٹھ رہنے والوں کو اس کی کمی کا زیادہ اندازہ نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی ضرورت "چلنے" کے دوران پڑتی ہے۔ جبکہ حادثات کرنے والوں کو اس کا اندازہ ہو نہیں سکتا کیونکہ ان کی افتادِ طبع اس کی متحمل نہیں۔

البتہ "منزل" پر پہنچنا اس سنگم کو رکھے بغیر ممکن نہیں۔

"عقیدہ" اور "فقہ" کا جوڑ یہاں ایک کمال تحریک برپا کر سکتا ہے، اللہ کے حکم اور توفیق سے۔

---

[3] "درمیانی مرحلہ کے بعض احکام" ایقاظ اپریل تا جون 2013ء۔

امام شافعیؒ کا ایک قول
درست سیاق میں رکھنے کی ضرورت

تنقیحات

حامد کمال الدین

امام شافعیؒ سے منسوب ایک مشہور مقولہ: قولي صواب يحتمل الخطأ وخلافه خطأ يحتمل الصواب "میرا قول درست ہے اس احتمال کے ساتھ کہ یہ نادرست ہو۔ اس کے مخالف قول نادرست ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ درست ہو"۔

حال ہی میں جدت پسندوں کی جانب سے امام شافعیؒ سے منسوب اس مقولے کا خاصا غلط استعمال ہوا ہے۔ کوئی بھی چیز بس ان کے ہاتھ لگنی چاہئے!

بھائی امام شافعیؒ یہ بات کسی مطلق سیاق میں نہیں کہہ رہے۔ امام شافعیؒ حالیہ یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے والی 'رواداری' کے منہج پر نہیں تھے۔ اگر ہر بات میں امام شافعی ایسی ہی 'رواداری' پر ہوتے، جو کہ دراصل ایک فکری آوارگی پر ایمان رکھنے کا نام ہے، تو یہ دوسرا ایک قول بھی تو امام شافعی ہی کا ہے: حُكْمِي فِي أَصْحَابِ الْكَلَامِ أَنْ يُضْرَبُوا بِالْجَرِيدِ وَيُحْمَلُوا عَلَى الإِبِلِ وَيُطَافُ بِهِمْ فِي الْعَشَائِرِ وَالْقَبَائِلِ يُقَالُ هَذَا جَزَاءُ مَنْ تَرَكَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَأَخَذَ فِي الْكَلَامِ (قولِ شافعیؒ کا ویب لنک:http://goo.gl/rvRNx7)

"اصحابِ کلام کی بابت میرا فتویٰ یہ ہے کہ کھجور کی چھڑیوں سے ان کی پٹائی کی جائے اور پھر اونٹوں پر بٹھا کر ان کو قریہ قریہ پھرایا جائے کہ یہ ہے بدلہ ایسے شخص کا جو کتاب اور سنت کو چھوڑ کر کلام (فلسفہ) کی طرف رخ کرے"

*****

اس سلسلہ میں ہم اپنے ایک پرانے مضمون سے ایک اقتباس شیئر کریں گے:

منہجِ اہلسنت کی رو سے آدمی جو شریعت سے سمجھتا ہے:

أ. اس کا ایک حصہ ایسا ہو سکتا ہے جس کا موافقِ شریعت ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ مثلاً صحابہ و قرونِ سلف کا اجماع، ائمہ اہلسنت کے اتفاقات وغیرہ۔ پس اس 'فہم' کا اتباع واجب ہے اور اس کا خلاف گمراہی اور شقاق۔

ب. انسانی فہم کا ایک حصہ ایسا ہے جس کا موافقِ شریعت ہونا آدمی کے نزدیک ظنِ راجح ہو۔ اس کا اتباع کرنا اس شخص پر جو دیانت اور خدا خوفی کے ساتھ اس کا قائل ہے، چاہے وہ ذاتی فہم و استخراج و تحقیق کا نتیجہ ہو یا کسی صاحب علم پر اعتماد کا، واجب ہے۔ مگر جو کوئی دیانت اور خدا خوفی کے ساتھ اس کے برعکس موقف کا قائل ہے، چاہے وہ ذاتی فہم و استخراج و تحقیق کا نتیجہ ہو یا کسی صاحب علم پر اعتماد کا، وہ آدمی کے نزدیک قابل عذر ہونا چاہیے۔ فہمِ دین کے اس حصہ میں علمی مباحثہ، صحت مند تبادلۂ آراء اور نقطہ ہائے نظر، کا متواضع انداز میں ایضاح و استیضاح اور باہمی تصویب کی کوشش مستحسن ہے البتہ 'مخالفت' اور 'شقاق' حد درجہ مذموم۔ اخوت کا برقرار رہنا یہاں ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ امام شافعیؒ کا بیان کردہ مشہور قاعدہ: قولی صواب یحتمل الخطأ وخلافه خطأ یحتمل الصواب جس پر سب اہلسنت کا عمل ہے دراصل انسانی فہم یا فکر کی اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ پہلی یا تیسری قسم کے ساتھ۔

ج. انسانی فہم کا ایک حصہ ایسا ہے جس کا خلافِ شریعت ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ مثلاً باطل فرقوں اور نظریوں کے وہ استدلالات جو اجماعِ سلف اور اتفاق اہلسنت سے صریح متصادم ہیں۔ انسانی فہم کے اس حصہ کا، چاہے اس پر شریعت کے کتنے ہی حوالے دیے گئے ہوں، بطلان اور خلاف کرنا آدمی پر واجب ہے۔

("عقیدہ سے فکر اور ثقافت تک"۔ جنوری 2006)

ہمارے حُدی خواں حالی، اقبال اور نسیم حجازی ہی تو ہیں!

تنقیحات

مدیر ایقاظ

نسیم حجازی مرحوم پر سوشل میڈیا کے بڑے بڑے اچھے اسلام پسند لکھاریوں کے لگائے ہوئے نشتر دیکھ کر لکھی گئی ایک تحریر:

بھائی نسیم حجازی نے اگر کوئی غلط بیانیاں کر دی ہیں تو ضرور ان کی نشان دہی ہونی چاہیے، اور یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ وہ کس درجہ کی 'غلط بیانیاں' ہیں؛ کیونکہ چھوٹا موٹا سہو تو ہر کسی سے ہو جاتا ہے۔ مجھ سے، آپ سے، ہر کسی سے ہو جاتا ہو گا۔ بہر حال **اگر کوئی سنگین غلط بیانیاں ہوئی ہیں تو ہم ضرور انہیں جاننے میں دلچسپی رکھیں گے**۔ اس وجہ سے کہ ہم وہ امت ہیں جسے "كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ"[1] کا حکم دے رکھا گیا ہے اور اللہ کا شکر ہے ہماری علمی روایت مقدور بھر اس خدائی حکم پر پورا اترتی رہی ہے۔ اس امت نے کبھی باطل پر اصرار نہیں کیا، ان شاء اللہ آج بھی نہیں کرے گی۔ جو چیز علم کی روشنی میں ہم پر واضح کر دی جائے گی ہم اسے ضرور تسلیم کریں گے خواہ وہ ہمارے خلاف کیوں نہ پڑتی ہو، یہ بطورِ امت ہمارا طرۂ امتیاز ہے، الحمد للہ۔

---

[1] (النساء: 135) "عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودی مولا کے لئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ دار عزیزوں کے"۔

البتہ ہم وہ امتِ عدل ہیں جو ایک غلطی کو بھی اُس غلطی تک ہی رکھتی ہے۔ یعنی اگر کچھ غلطیاں کسی شخص کے کلام میں ثابت بھی ہو جائیں تو ہم اُن چند غلطیوں کو برطرف رکھتے ہوئے اس کے باقی کلام سے، اگر وہ مفید ہو، بھرپور فائدہ لیتے ہیں۔ اور اس پر بدستور اس کے شکرگزار رہتے ہیں (مَن لمَ یشکُر النَّاسَ لمَ یشکُرِ اللہَ)۔ الا یہ کہ کسی شخص کا کلام ہو ہی جھوٹ کا پلندہ۔ ہاں اس سے لوگوں کو خبردار بھی کیا جاتا ہے اور ایسے شخص کو کذّاب بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ البتہ کسی کلام میں اِکادُکا غیر محقَق باتوں کا آجانا اس کو ڈِس کریڈٹ نہیں کرتا، ورنہ قرآن کے علاوہ شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جس کی بابت ایک منفی رویہ پیدا کرا دینا ہم پر واجب نہ ہو جاتا ہو۔

پھر... لکل مقامٍ مقال

میں ہرگز یہ نہیں کہہ رہا کہ اگر کسی کو تاریخ پر ماسٹرس یا پی ایچ ڈی کا تھیسس لکھنا ہو تو وہ اس میں حالی و اقبال کی شاعری یا نسیم حجازی کی نثر کا اسلوب لائے! کیونکہ اُس کا اپنا ایک محل ہے اور **اِس کا اپنا**۔ یہ تھیسس نگار ضرور مسلم مؤرخین کے ساتھ ساتھ نصرانی یا یہودی یا ہندو مؤرخین وغیرہ کو بھی پڑھے، تقابل کرے، وقائع میں جس قدر غوطہ زنی کر سکتا ہو کرے، اور اپنی تحقیق کے دیانتدارنہ نتائج پیش کرے، خواہ وہ ہمارے حق میں پڑتے ہوں یا ہمارے خلاف۔ گو غلطی کا **امکان** آپ کے ان 'دیانتدارانہ' نتائج میں بھی پائے جانے کا امکان ہے، خصوصاً اگر آپ کسی یہودی یا نصرانی سپروائزر کے نیچے تحقیق کر رہے ہوں، یا حتیٰ کہ اگر کسی 'کالے انگریز' سے زیادہ نمبر لینے کے چکر میں ہوں، یا ویسے ہی ایک ہزیمت خوردہ شخصیت رکھتے ہوں جو کہ اِس وقت بہت ہیں؛ کہ ذہنوں پر دورِ مغلوبیت کے کچھ اپنے ہی پرنٹ ہوتے ہیں اور وہ روزمرہ گرد کی طرح دماغوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو کھرچنا کوئی آسان کام نہیں۔ ('آج کے' پڑھے لکھے طبقے کے ہاں مقبول ہونے کی طلب اغلب طور پر ایک احساسِ کمتری ہے)۔ پس بہت امکان یہ ہے کہ اپنے مؤرخین پر اگر ہمارے کسی

ماڈرن محقق نے آج کوئی استدراک فرمایا ہے تو وہ بھی من و عن لیا جانے کے قابل نہ ہو، بلکہ ضروری ہو کہ راسخ العلم لوگوں پر اسے پیش کرنے کے بعد ہی عوامی کھپت public consumption کے لیے اسے نکالا جائے۔ کیونکہ دورِ غلامی میں عوام کو کنفیوز کرنے اور پیچھے سے چلے آتے ایک ڈسکورس سے انہیں ہٹانے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے۔ اور ہمارا مسلم معاشرہ کسی 'ارتقائی' کھلواڑ کی جگہ نہیں ہے۔

لیکن چلیں، اتنی ہماری کون سنے گا کہ وہ اپنی کسی ناقص تحقیق کے نتائج، راسخ العلم لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے عوام میں لا دھرنے سے احتراز کرے اور یوں مسلمانوں کو خراب کرنے کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے۔ ہم کہتے ہیں، **کم از کم کوئی تحقیق پیش تو ہو** کہ نسیم حجازی نے ان ان مقامات پر تاریخ کو مسخ کیا ہے۔ جس کی روشنی میں اب ہم لوگوں کو متنبہ کریں کہ بھئی دیکھو فلاں اور فلاں مقامات پر نسیم حجازی سے غلطیاں ہوئی ہیں لہٰذا ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے نسیم حجازی کی چیزیں پڑھیں اور ان سے استفادہ کریں۔ اصولاً اس میں ہرگز ہمیں کوئی مانع نہیں۔ مگر آپ ان غلطیوں کی نشاندہی فرمائیں تو سہی!

الا یہ کہ آپ کو اُس پورے ڈسکورس سے شکایت ہو جو تاریخ پڑھنے کے معاملہ میں نسیم حجازی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ **جس میں نسیم حجازی بہرحال اکیلا نہیں**۔ اقبال کا 'وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا' دیکھ لیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ عین اقبال کی دکھائی ہوئی وہ شعری تصویر ہی نسیم حجازی کے ہاں ایک نثری رنگ اختیار کر گئی ہوئی ہے... جہاں تک ڈسکورس کا تعلق ہے۔

اور اقبال کا یہ ڈسکورس تو، مسلم نونہالوں کو تاریخ پڑھانے کے معاملہ میں، آپ کو ابن کثیر اور ذہبی کے ہاں بھی مل جائے گا۔ آپ خود بتائیں یہ ڈسکورس ایک مومن کے یہاں کیوں نہ پایا جائے؟ وہ جنگیں جو بتوں کی پوجا کرنے والوں اور خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں کے مابین لڑی گئیں، اور جن کے نتیجے میں (فاتحین کے اخلاص و عدم اخلاص سے قطع

نظر) روئے زمین پر بت خانے مٹتے، دیویوں کی پوجا ختم ہوتی اور کفر کے اندھیرے چھٹتے چلے گئے، اور شہروں کے شہر "اللہ اکبر" کی صداؤں سے گونجنے لگے، بستیوں میں ہر چند ساعت بعد لوگ باوضو ہو کر صفیں بنا بنا خدائے واحد کو سجدے کرنے لگے اور ان شہروں میں لوگوں کی صبحیں سورج چڑھنے سے نہیں بلکہ قرآن پڑھنے سے ہونے لگیں اور مسائل حیات میں لوگوں کا مرجع نبی آخر الزمان ﷺ کی ذات گرامی ٹھہری... وہ جنگیں (فاتحین کے اخلاص و عدم اخلاص سے قطع نظر) جن کے اپنے مضمرات روئے زمین پر اس اعلیٰ نوعیت کے رہے ان جنگوں کے احوال پڑھنے میں آدمی کا 'جانبدار' ہو جانا، ان کے واقعات کو پڑھتے ہوئے آدمی کے دل کی دھڑکن تیز ہو جانا، خود بھی ذہن کی دنیا میں ان لشکروں کے ساتھ جا کھڑا ہونا اور ایک ایک قدم ان کے ساتھ چلنا... یہ تو ہمارے ہاں "ایمان" جانا گیا ہے بھائی... جہاں تک ڈسکورس کا تعلق ہے!

اور اگر کہیں پر اس امت کو پسپائی ہوئی... اور کہیں اندلس کے ایک ایک ٹیلے پر کھڑا کر کے نسیم حجازی ہمیں رلاتا چلا گیا... تو اذانوں کی اس پسپائی اور مسجدوں کی اِس ویرانی پر رونا اور رُلانا بھی ایمان ہی ہے... جہاں تک ڈسکورس کا تعلق ہے۔

اور جہاں تک "محل" کا تعلق ہے تو اقبال اور حجازی ظاہر ہے کسی ایم فل کا تھیسس نہیں لکھ رہے تھے۔ یہ اپنے نونہال کو وہ 'گردوں' دکھا رہے تھے جس سے ٹوٹ کر یہ تارا مستشرق کے کسی جوہڑ میں جا گرا ہے۔

*****

بغور دیکھئے تو اس وقت دشمن کا سب سے بڑا حملہ ہمارے دماغوں پر ہے۔ اور دماغوں پر حملے کی سب سے بڑی صورت تشکیک ہے۔ مختلف طبقے مختلف سطحوں پر ہمارے ہاں تشکیک پیدا کر رہے ہیں۔ کسی کی 'تشکیکی' سعی اس وقت نبوتِ محمد ﷺ پر ہے۔ کسی کی خدا کے وجود پر۔ کسی کی قرآن پر۔ کسی کی سنت پر۔ کسی کی حدیث اور اصولِ حدیث پر۔ کسی کی

صحابہؓ پر۔ کسی کی فقہ پر۔ کسی کی فقہاء پر۔ کسی کی عربی لغت پر۔ کسی کی اسلامی تاریخ اور اسلامی فتوحات اور توسیعِ اسلام پر۔ کسی کی دورِ حاضر کے ہمارے ان علمی رجال اور ان تحریکوں پر جو اسلام کا احیاء کرنے اور کسی نہ کسی میدان میں عالم اسلام سے باطل کو پسپا کرنے کے لیے کھڑی ہوتی رہیں۔

"تشکیک" سے بڑھ کر ان کے پاس اِس امتِ حق کو خراب کرنے کے حوالہ سے کچھ ہے بھی نہیں۔ کیونکہ باقی تو کسی چیز کے لیے ثبوت دینا پڑتے ہیں، جو کہ آسان کام نہیں۔ پس وہ ہمارے نوجون کو صرف کونفیوز کر سکتے ہیں۔

پس "تشکیک" ہمارے خلاف برتا جانے والا اس وقت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ملحد بھی یہی ہتھیار اٹھا کر ہمارے نوجوان پر حملہ آور ہیں۔ اور بد قسمتی سے کچھ دیندار اصحاب بھی، **نادانستہ** اسی کورَس میں اپنا سُر شامل کر رہے ہیں۔

بڑی محنت فی الوقت اس پر ہو رہی ہے کہ کسی طریقے سے وہ ہمیں اپنا وہ پیراڈائم بیچ لیں جس کی روشنی میں ہم اپنی ہر چیز 'نظرِ ثانی'[2] کے قابل جاننے لگیں۔

---

[2] اور وہ جو آپ کی مجوزہ 'نظرِ ثانی' ہے... وہ کیا معصوم ہو گی؟ وہ بھی تو کسی 'نظرِ ثانی' کی ضرورتمند ہو گی۔ وھٰکذا دوالیك! آخر کہیں تو یہ سلسلہ تھمے گا؟ تو پھر اس میں کیا حرج ہے کہ اِس امتِ حق کے ہاں جو چیزیں علمی یا سماجی یا تاریخی طور پر حق جانی چلی آتی ہیں ان سب کی سب کو فی اصلہٖ تو 'نظرِ ثانی' کا مستحق نہ سمجھا جائے (جس کا مطلب ہو گا: اصل یہ ہے کہ ان کو اون own ہی کیا جائے) تا آنکہ ان میں سے کسی اِکادُکا چیز کا غلط ہونا خود اِسی کے معتمد اصولوں کی روشنی میں ثابت نہ ہو جائے، اور تب جس شخص پر وہ غلطی ثابت ہو جائے وہ اس سے رجوع کر لے۔ جس کا مطلب ہے، اس صورت میں بھی مجموعی طور پر امت کے ہاں چلی آنے والی چیزوں کو اون own ہی کیا جائے گا۔ ہاں غلطیوں کی نشاندہی سے آپ کو کسی نے نہیں روکا۔ تاریخ کی یہ خدمت آپ فرمانا چاہیں تو ضرور فرمائیں، اس پر ہم بھی آپ کے ممنون ہوں گے۔ گو ہے یہ ایک مشکل کام۔

میرے دیندار بارِیش بھائیو! ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں بسنے والی اشیاء کو تھوک میں مشکوک مت ٹھہرایئے۔ ہاں کسی چیدہ چیدہ مقام پر کوئی علمی غلطی ہمارے کسی شاعر یا ہمارے کسی نثر نگار سے ہوئی ہے تو سو بار اس کی نشاندہی کیجیے۔ ہم اسے قبول بھی کریں گے اور اس صورت میں یہ بھی تسلیم کریں گے کہ آپ تصحیح کر رہے ہیں نہ کہ تشکیک۔

تصحیح کرنے لگے تو آپ کو پتہ چل جائے گا یہ کتنا محنت طلب کام ہے۔ نیز خود پر استدراک کا ڈر ہو گا۔ اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ 'تقابلی' تحقیق کے اندر آپ کتنے پانی میں ہیں۔ البتہ تشکیک کے لیے صرف زبان یا قلم چلنا چاہئے۔ بھائی کوئی ٹھوس معلومات تو دیں، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

ہیومن ازم اپنی برہنہ صورت میں

احوال و تعلیقات

ابن علی

کہتا ہے، میں سٹوڈنٹس کو اخلاق سکھاتا ہوں، امانت کی بہت تاکید کرتا ہوں، مگر اس سب پر محمد ﷺ کا نام لیے بغیر، کیونکہ اس سے آپ کی بات میں مذہبی رنگ آجاتا ہے!

یہ ہو رہا ہے ایک مسلم معاشرے میں!

ہیومن ازم، ایک باقاعدہ دین۔

خدا غارت کرے انبیاء کے دشمنوں کو؛ یہ ڈھیروں کی تعداد میں خود ہمارے گھروں میں گھس آئے۔ مقصد صرف ایک ہے ان کا: انبیاء کو انسانوں کی زندگی سے باہر کر دینا۔ ”اخلاق“ کے پیغمبر یہ خود ہوں تو ٹھیک ہے، محمد ﷺ ہوں تو 'پروفیشنلزم' پر آنچ آتی ہے!

ہمارے جدت پسند بھائیوں سے بھی کوئی کہہ دے، براہ کرم آنکھیں کھولیں۔ یہ محمد ﷺ کو 'سیاست' سے نہیں ”اخلاق“ سے بھی باہر کرنا چاہتا ہے۔ 'ہیومن ازم' کا پیکیج اصل میں ہے بھی یہی۔ ہر چیز اپنے اپنے وقت پر کھلتی جائے گی۔ آیئے مل کر اس برہنہ کفر کو اپنے گھر سے نکالیں اور ”حق“ و ”خیر“ کی نسبت محمد ﷺ سے جوڑیں۔

”ختم نبوت“ پر نجانے کس کس جہت سے حملہ ہو چکا۔

ہماری اس تحریر کا فیس بک لنک:

https://www.facebook.com/MudeerEeqaz/posts/1019052104825147

'مستورات' ایک سماجی جبر.. سوشیالوجسٹ کی وحی

احوال و تعلیقات

مدیر ایقاظ

حیادار رویے، حیادار ملبوسات... سماج کا جبر! خواہ 'بعد ازاں' عورت اپنی مرضی سے ہی وہ کام کیوں نہ کرنے لگی ہو! ہے وہ اپنی حقیقت میں جبر؛ خواہ اس حجاب وغیرہ پر عمل عورت کے ہاں اب رضاکارانہ کیوں نہ ہونے لگا ہو؛ یا حتیٰ کہ عورت وہ کام کتنا ہی بہ اصرار کیوں نہ کرنے لگی ہو... مگر ہم سوشیالوجسٹ آپ کو بتاتے ہیں دراصل یہ ایک سماجی جبر کا نتیجہ ہے!

لبرلزم اور ماڈرن انتھروپالوجی کا ایک اہم مقدمہ۔

البتہ اس کا اطلاق 'حجاب' اور 'جسم ڈھانپنے' کے تصور پر ہو گا۔ اس کا اطلاق "حیاء" اور "اخلاق" نامی اشیاء پر ہو گا۔

ظاہر ہے اس کا اطلاق ہزاروں تماش بین مردوں کے سامنے ایک جوان لڑکی کے 'کیٹ واک' کرنے پر نہیں ہو گا۔ ہزاروں بے رحم دیدے پھاڑ پھاڑ دیکھنے والے بھنبھناتے نفوس کے آگے ایک اشتہا انگیز تھال کی طرح لڑکی کا 'پیش' ہونا اور بیک وقت ہزاروں لُچوں کے لیے تفریح و تماشا کا ایک 'آبجیکٹ' بن کر پہاڑ سے بھاری قدم اٹھاتے ہوئے پورا ریمپ گزر کر دکھانا اور وہ بھی اٹھلا اٹھلا کر، یہ تو عورت میں 'طبعی طور پر پائی جانے' والی ایک چیز ہے... اس کو بھی ایک خاص قسم کے 'سماج' کے جبر کے کھاتے میں ڈالنا، یہ تو آپ کی نری غلط فہمی ہے۔ بلکہ آپ کی سوچ کا اس طرف کو چلے جانا بذاتِ خود 'سماج کا جبر' معلوم ہوتا ہے، جس سے اب آپ کو آزاد کرانا ضروری ہے!

یعنی 'فطرت' کا تصور یہاں بھی ختم نہیں ہوا۔ صرف اِس خانے میں فٹ ہونے والی

"چیز" بدلی گئی ہے۔

چیزیں یہاں بھی ابھی تک دو ہیں: ایک فطرت۔ اور ایک سماج کا جبر۔

ضروری نہیں ہر چیز جو یہاں آپ کو نظر آتی ہے 'سماج کا جبر' ہو؛ کوئی کوئی چیز 'فطرتاً' بھی انسان میں ہوتی ہے! ضروری نہیں ہر چیز 'فطرتاً' ہو؛ کوئی کوئی چیز سماج کا جبر بھی ہوتی ہے!

'فطرت' تو ہوتی ہے آپ سے آپ۔ اس کی تو نہ کوئی تفسیر ممکن ہے نہ اس کے معاملے میں 'سماج کا جبر' فرض کرنے کی کوئی ضرورت؛ وہ انسان کے اپنے وجود کا حصہ باور ہوتی ہے۔

اور 'سماج کا جبر' وہ چیز جو باہر سے آپ پر مسلط کی گئی ہوتی ہے؛ اس کو فطرت نہیں کہا جا سکتا۔

البتہ سارا مسئلہ اس بات کا تعین کرنے میں ہے کہ کیا چیز انسان میں 'طبعی طور پر' ہے اور کیا چیز باہر 'سماج کا اثر'... یہ 'تعین' کرنے کے لیے آپ کا کوئی عقیدہ ہونا ضروری ہے؛ خواہ انبیاء پر ایمان اور خواہ انبیاء کے ساتھ کفر؛ دونوں ہی عقیدہ ہیں؛ مگر پہلی چیز کو 'عقیدہ' کہہ کر بائسڈنیس biasedness قرار دے دیا جائے گا اور دوسری چیز کو کسی بھی 'عقیدے' dogma سے بالاتر ہونا!...

سارا مسئلہ اِس کرسی پر جج بن کر بیٹھنے میں ہے۔ انبیاء کو اِس کرسی پر بیٹھنے کا حق نہیں ہے۔ انبیاء کے معاندین کو ہے!

یعنی اس بات کا تعین کرنے کے لیے کہ کونسی چیز 'انسان میں خود بخود' ہے اور کونسی چیز 'باہر سے مسلط' ہوئی ہے... یہ تعین کرنے کے لیے یہاں جو جج بیٹھا ہو گا اس کی بابت یہ فرض کرنا ضروری ہے، اور اس کو خود بھی یہ دعویٰ کرنا ہو گا، کہ اس پر تو کسی قسم کے 'سماج کا جبر' نہیں اور کوئی انتھروپالوجی اس کے خیالات کو جنم دینے یا اس کے احساسات و جذبات پر اثر انداز ہونے والی نہیں ہوئی! وہ تو بس اُدھر پیدا ہوا اور اِدھر فیصلے کی کرسی پر آ بیٹھا! وہ تو

کسی قسم کے 'سماجی رویے social behavior ' اور کسی قسم کی اھواء inclination کا پروردہ یا کسی سماجی نزاع سے متاثر ہی نہیں ہے۔ وہ تو خالص سٹیل کا بنا ہوا ہے اور کسی بھی قسم کے نظریاتی اور سماجی عوامل کو پاس پھٹکنے نہ دینے کے باعث معروضیت objectivity کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ اور کیونکہ وہ کسی نزاع کا حصہ نہیں؛ نہ کسی سے بغض نہ کسی سے پرخاش نہ کسی فکر کے خلاف رد عمل اور نہ کسی فکر سے متاثر: بس غیر جانبدارِ محض! لہٰذا کیونکہ اب یہ تو فرشتوں کی طرح سوچ سکتا ہے لہذا آبجیکٹی ویٹی objectivity کی ٹھیکیداری بس اِسی کو زیب دیتی ہے!

پھر یہ ایک given حقیقت ہے؛ اور آپ کو اس کا یہ دعویٰ لازماً تسلیم ہی کرنا ہو گا: آخر وہ اس وقت سوشیالوجی کا پروفیسر یا انتھروپالوجی کا ایک مصنف ہے اور باہر اس کی 'گرل فرینڈ' اس کا انتظار کر رہی ہے اور اُس کا شام کا نائٹ کلب لیٹ ہو رہا ہے! 'بیوی' انتظار کر رہی ہوتی یا 'نماز' لیٹ ہو رہی ہوتی تو چلیے آپ اس کو بائسڈ biased کہہ بھی لیتے! سوشیالوجی کے اِس مصنف اور انتھروپالوجی کے اِس مدرّس کی 'غیر جانبداری' یا اس کے 'کسی بھی نظریے یا رویے سے متاثر نہ ہونے' یا 'کسی بھی سماجی نزاع کا حصہ نہ ہونے' پر آپ کے دل میں اگر شک بھی گزر گیا تو آپ ایک تنگ نظر اور متعصب آدمی ہیں جو چیزوں کو ایک خاص رنگ میں دیکھنے کا عادی ہے!

چنانچہ اصل مسئلہ اِس جج پر 'ایمان بالغیب' لانا ہے۔ باقی باتیں تو وہی ہیں: ایک چیز انسان کی فطرت ہے جیسے لچرپن اور ہزاروں تماش بینوں کے سامنے خوشبوؤں کے بھبکے اڑاتی ایک بیس بائیس سالہ لڑکی کا اپنے جسم کو تھال میں رکھ پیش کرتے ہوئے کیٹ واک کرنا۔ اور ایک چیز ہے سماج کا جبر جیسے حجاب، شرم اور حیاء کا تصور!

چیزیں اب بھی دو ہی ہیں۔

بس اتنا ہے کہ انبیاء نے ان کو اس طرح بتایا تھا کہ حیاء انسان کی فطرت ہے اور لچرپن

اس پر شیاطین کا مسلط کردہ۔

انبیاء کے منکرین نے صرف اس کو الٹ دیا ہے اور ان کا کہنا ہے: لچر پن انسان کی فطرت ہے اور حیاء و اخلاق اس پر کچھ پاکیزگی پسند عناصر کا مسلط کردہ۔

پس خانے اب بھی دو ہی رہے۔ مسئلہ ان دونوں کو 'لوکیٹ locate' کرنے کا ہے کہ کونسی بات کس خانے میں رکھیں۔ جس بات کو آپ 'فطرت' کہہ دیں اس کے حق میں آپ بار بار بولیں گے بھی۔ البتہ اس بار بار بولنے اور ہر ہر سطح پر اس کی سرپرستی کرنے کو آپ 'سماجی جبر' بھی نہیں گے!!! اور خود اپنے اِس رویے کو آپ 'دھونس' بھی نہیں کہیں گے؛ بلکہ یہ 'حق پرستی' ہے! اب چونکہ یہ بات اصولاً آپ کو بھی تسلیم ہے؛ لہٰذا اِن حوالوں سے ہم انبیاء کو ماننے والے بھی اصولاً 'جبر' کے الزام سے بری ہوئے۔ اصل بات صرف ایک رہ گئی اور وہ یہ کہ اِس جج کے منصب پر کون بیٹھا ہے؟ جو اِس منصب پر جا بیٹھا وہ ''حقیقت'' کا تعین کرنے کا مجاز ٹھہرا اور اس کی یہ حیثیت given ہے!

یہ ہے اِس ماڈرن سوشیالوجسٹ کے مقدمہ کی مختصر حقیقت؛ جس کو 'چونکہ، چنانچہ، مگر اور اگرچہ' کے کچھ غیر معمولی تاؤ دے کر ایک 'علمی حقیقت' ٹھہرا دیا گیا ہے۔

میں آپ سے ایک عرض کروں... یہ سوشیالوجسٹ یہاں ایک اتنے بڑے منصب کا دعویدار ہے اور 'حقیقت' کا ایک ایسا منہ پھٹ ٹھیکیدار ہے کہ وہ پرانے مذاہب جن کو یہ محض دھکا اور خرافات کہتا ہے، اِس کے مقابلے پر ایک بہت چھوٹی دھونس ہوگی۔ سب سے بڑا لٹھ مار انسانی تاریخ میں یہ ہے؛ محض اِس لیے کہ اِس کے ہاتھ میں آج یونیورسٹیاں اور تعلیم کا ڈائس ہے!

اور بلاشبہ یہ ایک قوی دلیل ہے! بلکہ اصل دلیل ہی یہ ہے۔ اِس 'دلیل' سے انبیاء کو انسانی زندگی سے بے دخل کرنا کچھ ایسا نیا بھی نہیں ہے:

وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي

مِن تَحۡتِيٓۚ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ أَمۡ أَنَا۠ خَيۡرٌ مِّنۡ هَٰذَا ٱلَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ فَلَوۡلَآ أُلۡقِيَ عَلَيۡهِ أَسۡوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوۡ جَآءَ مَعَهُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ مُقۡتَرِنِينَ فَٱسۡتَخَفَّ قَوۡمَهُۥ فَأَطَاعُوهُۚ إِنَّهُمۡ كَانُواْ قَوۡمًا فَٰسِقِينَ (الزخرف:51-54)

فرعون لگا اپنی قوم میں پکارنے: اے میری قوم! مصر کی فرماں روائی مطلق کیا مجھ کو سزاوار نہیں؛ آخر یہ نہریں میرے ہی نیچے تو بہتی ہیں۔ تو کیا تم دیکھ نہیں سکتے؟ کیا (اس منصب کے لیے) میں بہتر ہوں یا بھلا یہ شخص جو ذلیل ہے اور بات صاف کرتا معلوم نہیں ہوتا؟ (بھلا یہ کچھ ہوتا تو) اس پر کیوں نہ (آسمان سے) سونے کے کنگن آ گرتے یا اس کے ساتھ فرشتے ہی آکر (دکھاتے) جو اس کے پاس رہتے۔ تب فرعون نے اپنی قوم کو کم عقل کر لیا تو وہ اس کے کہے پر چل پڑے۔ بیشک وہ تھے ہی بدکار لوگ۔

پس یہ ہے اصل منطق۔ سٹیٹس کو۔ خصوصاً فکری intellectual status quo۔ مختصراً... ’جس کی لاٹھی اس کی بھینس‘ کی بجائے فی الحال آپ یوں کہہ لیجیے: جس کی یونیورسٹیاں اس کی دانش... university is might!

*****

یہاں جو مضمون بیان کرنا مطلوب تھا ہمارا وہ مقدمہ تو مکمل ہوا۔

البتہ یہاں سے آپ کو ہمارا ایک اور مقدمہ بھی بآسانی سمجھ آسکتا ہے اور وہ ہے: **اس بات کی فرضیت کہ دینِ آسمانی کے پاس معاشرے کو اپنے علمی اقتدار کے زیر نگیں رکھنے کا انتظام ہو**۔ ورنہ یہ کسی کے علمی اقتدار کے زیر نگیں ہوگا۔ اسی بات کا ایک سادہ ترجمہ: اسلام کے پاس خود اپنی دولت (ریاست) ہونے کی فرضیت؛ جہاں ایک عام آدمی پر کوئی بیرونی مصدرِ دانش مسلط نہ ہو اور ”حقیقتوں کے تعین“ میں واحد حوالہ آسمانی وحی ہو۔ (کسی نہ کسی مصدرِ دانش اور تصورِ اقدار کو تو لازماً مسلط impose ہونا ہے؛ ورنہ اس کو ’معاشرہ‘ کہیں

گے ہی نہیں؛ معاشرہ ظاہر ہے محض کسی 'انتظامی' بندوبست ہونے کا نام نہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ تفہیمِ دین کے نام پر المورد کے جاری کردہ 'قوانین' میں سے کسی بھی قانون سے یہ ایک بڑا قانون ہے: **دینِ آسمانی کے معاشرہ پر حاکم ہونے کی فرضیت اور آدمی کو محض انفرادی طور پر کافر ہونے کی اجازت**۔ معاشرے پر حاوی 'دانش' prevailing epistemology کی صورت میں دراصل آپ معاشرے کو ایمان پڑھا رہے ہوتے ہیں یا معاشرہ آپ کو الحاد پڑھا رہا ہوتا ہے؛ تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ بالکل نہیں ہے۔ اسلام کے پاس دولت (ریاست) ہونے کی فرضیت کی یہ ایک ایسی واضح برہان ہے کہ نصف النہار کا آفتاب اس کے مقابلے پر کم ہو گا۔ قرآنی آیت حتیٰ لا تکونَ فتنۃٌ میں ''فتنہ'' کی تفسیر اگر آپ ''جبر'' بھی لینا چاہیں، جس پر مدرسۂ وحید الدین خان کا پورا ڈسکورس کھڑا ہے، تو بھی اِس ''جبر'' کو محض کسی ڈنڈے اور لاٹھی کے اندر دیکھنا البتہ تعلیم و ابلاغ کے ایک دیوہیکل انتظام کی صورت میں اِس ''جبر'' کو نہ دیکھ پانا کوتاہ نظری کی حد ہے۔

''خلافت''، خواہ اس کی عملی صورت جو بھی ہو (اور یہ تو بالکل ہی ضروری نہیں کہ وہ حزب التحریر والی ہو! بنیادی طور پر ہماری مراد ''خلافت'' یا ''دولت'' وغیرہ ایسے الفاظ سے ہوتی ہے معاشرے پر دینِ آسمانی کا اقتدار؛ خواہ اس کی انتظامی صورت جو بھی ہو)... اِس ''خلافت'' کے ریشنال rationale میں یہ بات 'حدود و تعزیرات یا اسلام کے معاشی احکام وغیرہ کو لاگو کرنے کی ضرورت' والی دلیل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور آج اِس ریشنال کو نمایاں کرنا حد سے بڑھ کر ضروری؛ کہ ایک چیز کے بدترین عواقب (خود سماجیات ہی میں شیاطین کا ایک بھرپور فکری تصرف؛ بلکہ ایک باقاعدہ ''مرجع reference'' کی حیثیت اختیار کر لینا) آپ اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

حق یہ ہے کہ اسلام کے پاس ایک دولت ہونے کی فرضیت ہزارہا جہت سے ثابت ہوتی ہے؛ اور یہ بات ضروریاتِ دین میں آتی ہے۔ اِس کا انکار ایک مکابرہ ہے اور اُسی معرفی جبر

epistemological coercion کا نتیجہ جو کوئی صدی بھر کی 'اینلائٹنمنٹ' enlightenment سے آپ کے ذہنوں پر عمل پزیر ہوا ہے؛ اور جس کے نتیجے میں ایک دوسری سطح پر آپ کا نوجوان اب اس بات کو given ماننے پر آمادہ ہو چلا ہے کہ حیاء اور اخلاق وغیرہ اِس 'ہیومن بیئنگ' human being پر محض باہر سے مسلط ہو جانے والی چیزیں رہی ہیں یعنی سماجی جبر... !

اِس آخری پوائنٹ سے متعلقہ کچھ مباحث ہمارے ان مضامین میں واضح کیے گئے ہیں:

- "جماعۃ" کا "نظم" پر مقدم ہونا http://eeqaz.co/201503_jamat_imarat/
- انتظامی جبر اور تشکیلی جبر کا فرق http://eeqaz.co/201503_fard_maljaomawa/
- ریاست ایک جبر یا دھونس؟ http://eeqaz.co/201503_riyasat_jabar/
- علیکم بالجماعۃ http://eeqaz.co/201503_alaikumbljamat/

عدتِ شرعی 'ڈی این اے' کے سنک میں!
لا حولَ ولا قوۃَ إلا باللہ

فرقے

حامد کمال الدین

یہ قربِ قیامت مجتہدین (متعلقین المورد وغیرہ)
فقہاء کے طریقے پر احکامِ شرعی کی ''حکمت'' اور ''علت'' کے مابین فرق کر لیتے تو ایسے شگوفے نہ چھوڑتے۔

*****

اس علاماتِ قیامت 'اجتہاد' کی رُو سے حمل کا ایک ٹیسٹ ہی اب عدتِ شرعی سے کفایت کر دے گا، یوں عورت چند ہفتوں میں کئی آدمیوں سے شادی کر سکتی ہے! بلکہ زیادہ سوفسٹی کیٹڈ sophisticated ٹیسٹ کی سہولت موجود ہو (اور یقیناً ہے) تو ایک ایک دن کے وقفے سے، یا اس سے بھی کم وقفوں سے، کئی کئی آدمیوں کی زوجیت میں جانا عورت کے لیے شرعاً حلال ہو جائے گا، صرف سماجی طور پر 'کچھ دیر کے لیے' اس کو معیوب کہا جا سکے گا!

اور حق تو یہ ہے کہ یہ 'حمل ٹیسٹ' عقدِ ثانی سے پہلے ضروری ہی کیا ہے! ایک راستہ آخر تک کھل گیا ہے، آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کیسے...

اٹھانے والوں نے نہایت خوب سوال اٹھایا: استبرائے رحم میں بھی معاملہ محصور کس نے کر دیا ہے اور کس دلیل سے؟ عدت ایسے منصوص حکم کی اگر 'توجیہ' ہو سکتی ہے تو استبرائے رحم ایسے استنباطی مسئلے کی 'توجیہ' کیوں نہیں ہو سکتی؟ استبرائے رحم کس لیے؟ تاکہ نطفے خلط نہ ہوں اور اس کے نتیجے میں اَنساب مشتبہ نہ ہوں۔ بھائی یہ مسئلہ تو 'ڈی این اے ٹیسٹ' نے بڑی آسانی سے حل کر دیا ہے، نطفے اب خلط ہو کر دکھا ہی نہیں سکتے، آپ

کیوں اس پر **دورانِ حمل نیا نکاح حرام** کر رہے ہیں؟ لہٰذا اگر وہ حاملہ ہے بھی تو بھلے سے دوسرے مرد سے شادی کرے، 'ڈی این اے' بتادے گا یہ پہلے مرد کا بچہ ہے یا دوسرے کا یا تیسرے کا یا چوتھے کا یا بیسویں کا؟ اب تو آپ اُس پر دورانِ عدت ہی کیا دورانِ حمل بھی عقدِ ثانی یا ثالث یا رابع کو حرام کرنے کی کوئی "دلیل" نہیں رکھتے! حفظِ انساب اب 'ڈی این اے' کرے گا، معاملہ ختم! لہٰذا عدت ایسا ایک معلوم حکمِ شرعی آپ نے ساقط کر دیا تو حمل ٹیسٹ ایسا ایک خودساختہ 'فریضہ' شرعی' بھی کیوں ساقط نہیں ہو سکتا؟ اس کو بھی عدت کی طرح سکِپ skip کر دیجئے: یہ عورت بغیر کسی بھی حمل ٹیسٹ کے انتظار میں وقت ضائع کیے، آگے پیچھے کئی کئی مردوں سے 'شادی' کر سکتی ہے۔ 'ڈی این اے ٹیسٹ' کسی بھی وقت یہ بتادے گا کہ بچہ کس کا ہے، حمل ظاہر ہونے سے پہلے حمل ٹیسٹ کراتے پھرنا خوامخواہ کی کوفت hassle ہے۔[1] حفظِ انساب اس پر موقوف بہر حال نہیں ہے!

پس اِس منطق نے تو ایک کمال راستہ کھول دیا۔ عورت چند ساعتوں میں مرد بدل سکتی ہے۔ 'ہندو مرد سے شادی' کی طرح اس کو بھی آپ سماجی طور پر ہی 'نامناسب' کہہ سکیں گے (وہ بھی کب تک؟!) شرعاً اس کو حرام کہنے کی بنیاد البتہ آپ نے ختم کر ڈالی۔

*****

دیکھئے حضرات۔ اہل سنت گروہوں (کلاسیکل اسلام کے ماننے والوں) کے لیے، ان کے مسالک کے تمام تر فرق کے علی الرغم، واللہ جتنی وسعت آپ ہمارے ہاں پائیں گے وہ شاید یہاں بہت کم لوگوں کے ہاں آپ کو نظر آئے۔ البتہ دین کو سیکولر لیبارٹری بنانے

---

[1] بلکہ 'ڈی این اے' ٹیسٹ بھی ہر کیس میں لازم نہیں ہے، اس منطق کی رُو سے۔ مثلاً عورت نے 'سائنٹیفک قرائن' کی رُو سے کوئی سو فیصد یقینی مانعِ حمل تدبیر کر رکھی تھی، یا مثلاً بیضہ دانی ہی نہیں تھی، یا نکلوا رکھی گئی تھی، جو کہ اس وقت ایک کثیر خلقت کا عمل ہے، تو یہ سب پابندیاں اس کے حق میں تکلفات سمجھی جائیں گی۔ اور یہ راہیں آپ کے اندازے سے بڑھ کر کشادہ رہیں گی!

والوں کے لیے ہمارے پاس یہ وسعت مفقود ہے۔ زیرو ٹالرینس zero tolerance ان شاءاللہ۔ یہ ہم پر سنت (کلاسیکل) اسلام کا حق ہے اور اس پر سب طعنے سننا ہمارے لیے باعثِ شرف۔ یہ 'شدت' بھی ہمارے نزدیک اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ وہ "وسعت"۔

"الذی تولّٰی کِبرَہ" اپنی ذہانت کے سبب، یا ایک راستے میں لوگوں کے ابتدائے عشق کا پاس کرتے ہوئے، ہو سکتا ہے کھینچ تان کی کسی 'دلیل' سے اس بات کو **حرام** رکھے کہ عورت دورانِ حمل کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔ یا آگے پیچھے کئی کئی مردوں سے شادی کرلے اور '**حمل ہونے کی صورت میں**' ڈی این اے سے پتہ چلالے کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ یا یہ اس بات پر 'خاموشی' اختیار کرے کہ ہندو مرد سے مسلم عورت کا نکاح **حرام** ہونے کی کوئی **دلیل** شریعت میں باقی نہیں رہ گئی! لیکن ایک نہایت بھیانک راستہ اس شخص نے یقیناً کھول دیا ہے۔ اور وہ بالکل چوپٹ ہو چکا ہے۔ آج نہیں تو کل یہ راستہ "سرے تک" چلا جائے گا۔ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا ، وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ۔ کلچرل گلوبلائزیشن کا عفریت باہر جبڑے کھولے کھڑا ہے؛ اور اسے سب کچھ ہضم ہوتا ہے! آج آپ اِن کے ساتھ 'رواداری' اور 'بصد احترام محض رائے کا اختلاف' کیجیے، کیونکہ ہر قسم کی ضلالت کے مقابلے پر یہی وقت کا دستور ہے (استشراق کی دی ہوئی یونیورسٹیوں کا منہج)۔ کل اس سے اگلا قدم اٹھانے والے 'محققین' کے ساتھ اسی 'رواداری' کا ثبوت دیجیے گا جو **ان اشیاء کو مکمل طور پر "حفظِ انساب" میں محصور ٹھہراتے ہوئے** 'ڈی این اے' کے ذریعے ایک سے ایک بڑھ کر کمالات کریں گے اور آپ 'بصد احترام' دیکھتے رہ جائیں گے۔ دین کا جیسا مرضی ستیاناس ہوتا رہے، بس 'رواداری' ہاتھ سے نہ جائے؛ اس سے بڑا کفر دین کے ساتھ کھلواڑ کے اِس دور میں بہرحال نہیں ہے! (سوشل میڈیا پر دی گئی ہماری ایک تحریر۔ لنک: https://goo.gl/kdr5t8)

ایک نہایت خوب تحریر

”رائٹ ونگ کے نوجوان لکھاریوں کو گیارہ مشورے“

فرقے

بشکریہ عامر ہاشم خاکوانی

ایک نہایت خوب تحریر۔ جزاک اللہ عامر ہاشم خاکوانی۔

اس پر ہمارا ایک مختصر سا اضافہ:

معاصر ”سیکولر نیریٹو“ کو زیر بحث لانے کے لیے سوشل میڈیا یا دیگر فورمز پر دو اپروچ ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری:

ایک: اسلامی سیکٹر کی داخلی کھپت کے لیے لکھی جانے والی تحریریں۔ یہاں سیکولرزم کا حکم کھل کر بیان کرنا ہی ضروری ہے۔ اگر یہ دینِ محمد ﷺ پر کھلا حملہ ہے، اور مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کے دین کو چھڑوانے کی ایک برہنہ کوشش، تو پھر جو ردِ عمل ایک مسلمان کا اپنے دین پر حملہ آور انسان کے مقابلے پر ہونا چاہئے وہ اس ردِ عمل سے کم نہ ہو گا جو ایک عزت دار انسان کا اپنی آبرو پر حملہ آور انسان کے مقابلے پر ہو سکتا ہے۔ معاملہ کو دیکھنے کی یہ بھی ایک جہت ہے اور اپنی جگہ برحق۔ اس کو ذرا دیر کے لیے ہم نام دے لیتے ہیں: اہلِ دین کے ہاں ’داخلی کھپت‘ کے لیے تیار کیا جانے والا تحریری یا تقریری مواد۔ ظاہر ہے اس کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا: فریقِ مخالف کے ساتھ مکالمہ یا اس موضوع پر یہاں کے غیر جانبدار undecided طبقہ کو اپنا کیس پیش کرنے کے لیے لکھا جانے والا مواد۔

یعنی ایک طرح سے 'بیرونی کھپت' کے لیے لکھا یا بولا جانے والا مواد۔ یہ بھی اب ایک بے انتہا اہم جہت ہے، اور بعض پہلوؤں سے اول الذکر سے بھی زیادہ اہم۔ برادرم عامر ہاشم خاکوانی کے گیارہ مشوروں کا تمام تر تعلق میرے نزدیک اس دوسری ضرورت سے ہے۔ اور اِس دائرہ میں ان کی تحریر کا ایک ایک حرف میری نظر میں لائق توجہ ہے۔

البتہ ان دونوں دائروں کا فرق نظر انداز کر دینا بھی نقصان دہ ہو گا۔ بلکہ شدید نقصان دہ۔ یہ ایسے ہی ہو گا جیسے

- ایک صحتمند آدمی کو بھی ہر وقت آپ پرہیزی غذا کا ہی پابند رکھیں!
- یا ایک مکمل صحت نہ رکھنے والے شخص کے لیے بھی مرغن اشیاء روا کر دیں!

اول الذکر دائرہ کے کچھ اپنے لہجے ہوں گے۔ جبکہ ثانی الذکر دائرہ کے لیے عامر خاکوانی صاحب کے تجویز کردہ لہجے ہی ناگزیر رہیں گے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے بھارت کی معلوم و ناقابل انکار زیادتیوں کی بابت ایک لہجہ وہ ہے جو "پاکستانی میڈیا" یا پاکستانی نصابوں" کے اندر پاکستانی قوم کو خطاب کرتے ہوئے اختیار کیا جائے گا۔ یہاں لوگوں کو 'فلسفی' بنانا قوم کو کھو دینے کے مترادف ہو گا (اور صرف فارغ ذہنوں کے وارے کا ہو گا)۔ یہاں (داخلی سطح پر) رائے کی دلجمعی اور یکسوئی ہی درکار رہے گی۔ (یہاں اگر کوئی غلطی یا زیادتی ہے تو وہ قوم کے سیانوں کے سامنے رکھی جائے گی۔ البتہ قومی سطح پر ایک یکسوئی پیدا کرا رکھنا ہر ترجیح سے بڑی ترجیح رہے گی، داخلی سطح پر)

البتہ بھارت کی زیادتیوں کو ثابت کرنے پر ایک لہجہ وہ ہو گا جو آپ کو 'عالمی برادری' کے سامنے اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہاں؛ ظاہر ہے وہ لہجے جو قوم کو

یک آواز کرنے کے لیے داخلی طور پر اختیار کیے گئے تھے یکسر غیر متعلقہ و غیر مفید ہو جائیں گے؛ بلکہ الٹا اثر رکھنے والے counter-productive۔

فلکِلّ مقامٍ مقالٌ، وَلِکلِّ حادثٍ حدیثٌ۔

پوری تحریر اس لنک سے پڑھئے: (رائیٹ ونگ کے نوجوان لکھاریوں کو گیارہ مشورے http://goo.gl/8YUGr6)۔ ذیل میں اس کے چیدہ اقتباس دیے جاتے ہیں:

اسلامسٹ بمقابلہ سیکولرازم کا معرکہ ٹی ٹوئنٹی میچ ہرگز نہیں، اسے ون ڈے بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ کرکٹ کی اصطلاح میں ٹیسٹ میچ ہے۔ طویل دورانیے کا کھیل۔ جس میں دو تین باتیں اہم ہیں۔

اے: اس میچ نے جلدی ختم نہیں ہو جانا۔ لمبا معرکہ ہو گا۔ یہ قسطوں میں لڑی جانے والی جنگ ہے، بار بار غنیم کے لشکر امنڈ امنڈ کر آئیں گے۔ ہر بار تلوار سونت کر لڑنا پڑے گا۔ انداز بدلتے رہیں گے، سپاہیوں کے چہرے تبدیل ہوں گے، مگر اہداف وہی ہیں۔ جانے پہچانے، دیکھے بھالے۔ اس محاذ کا رخ کرنے والے سوچ سمجھ کر میدان میں اتریں۔ نظریاتی جدوجہد بعض اوقات مختلف فیز میں لڑی جاتی ہے۔ ہم سے پہلوں نے اپنے انداز میں یہ معرکہ لڑا۔ اب ہمارے زمانے میں اور ہم سے بعد میں یہی مسائل، مکالمے اور مجادلے چلتے رہیں گے۔

بی: ٹیسٹ میچ میں جلد بازی اور عجلت کے بجائے کھلاڑی کی محنت، تکنیک اور مہارت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ فکری مکالمے میں بھی یہ چیزیں اتنی ہی اہم ہیں۔ اچھی طرح تیاری کر کے، سوچ سمجھ کر قدم بڑھانا چاہیے۔

سی: بہتر ہو گا کہ لکھنے والے اپنے اپنے کام کا تعین کر لیں۔ جیسے کرکٹ ٹیم میں کسی کا کام باؤلنگ، کوئی بلے باز اور ایک وکٹ کیپر ہوتا ہے۔ ہر ایک کی سپیشلیٹی ہوتی ہے۔ بیانیہ کی

جنگ میں مل جل کر بھی کام ہو سکتا ہے۔ جسے تحقیق میں دلچسپی ہے، وہ حوالہ جات پر محنت کرے اور اس اعتبار سے مواد سامنے لے آئے، کسی کو سوالات اٹھانے میں مہارت ہے، وہ اس طرف کا رخ کرے، کسی کا ہنر مرصع نثر لکھنا ہے تو وہ اس پر ہی فوکس کرے، مغربی لٹریچر سے رسائی رکھنے والوں کو اس اینگل کو کور کرنا چاہیے۔

*****

سیکولر فکر کے بیشتر علمبرداروں کو آپ دلیل سے قائل نہیں کر سکتے۔ یاد رہے کہ قائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اگلا قائل ہونے پر آمادہ ہو۔ جس نے طے کر رکھا ہو کہ مابعد الطبعیات کچھ نہیں اور صرف مادہ ہی سب کچھ ہے، اسے آپ مذہب کی اہمیت پر کیسے قائل کر سکتے ہیں؟ جو روز آخرت پر ہی یقین نہ رکھتا ہو، سرے سے خدا یا اس کے پیغمبر کے وجود ہی پر اسے شک ہو، اسے کس طرح الہامی دانش کا پیروکار بنایا جا سکتا ہے؟ میرا یہ مقصد نہیں کہ سیکولر سوچ رکھنے والے تمام ایسے ہوتے ہیں۔ ہر گز نہیں۔ بہت سے لوگوں کا یہ ایشو نہیں۔ وہ کسی بھی دوسرے مذہبی شخص کی طرح کی سوچ رکھتے ہیں، ان میں سے بعض ردعمل میں سیکولر ہوئے، کچھ کو مذہبی جماعتوں یا بعض تنگ نظر مولوی صاحبان کی شدت اور بے تدبیری اس جانب لے آئی، ایسے بھی بہت ہیں جو داعش، القاعدہ اور ٹی ٹی پی جیسی تنظیموں کی متشددانہ پالیسیوں، لوگوں کو ذبح کرنے اور سروں سے فٹ بال کھیلنے جیسی ویڈیوز دیکھ کر مذہب کا نام لینے والے ہر ایک گروہ سے متنفر ہو گئے۔ سیکولر سوچ رکھنے والوں میں یہ تمام شیڈز موجود ہیں، مگر سیکولرازم کی خالص علمی بنیادیں الحاد اور مذہب بیزاری پر استوار ہیں، اس لئے ان سے زیادہ دیر بچا نہیں جا سکتا۔

سیکولروں کی ہارڈ کور کو متاثر یا قائل نہ کر سکنے کے امکان کے باوجود یہ مکالمہ جاری رکھنا ہو گا، اسلامی بیانیہ پوری صراحت اور گہرائی کے ساتھ تشکیل دینا ہو گا۔ ہدف وہ لوگ ہیں جو ابھی درمیاں میں ہیں، سوئنگ ووٹر کی طرح سوئنگ پیروکار بھی ہوتے ہیں۔ جو لوگ ابھی

کسی جانب نہیں گئے، وہ لوگ جو کسی وجہ سے سیکولر ہو گئے، مگر وہ مذہب کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں، انہیں چند کامن پوائنٹس پر قریب کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ بھی جو مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، رائٹسٹ ہیں، مگر انہیں دوسروں سے بات کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت ہے۔ ان کی یہ کمی، ضرورت رائٹسٹ لکھاریوں کو پوری کرنا ہے۔

*****

اسی طرح جاوید غامدی صاحب کا یہ تصور کہ ریاست سیکولر ہو، حکومت البتہ مسلمان ہو گی، یہ بھی آخری تجزیے میں سیکولرسٹوں کو سپورٹ کرتا ہے۔ جناب غامدی اور ان کے ذہین تلامذہ کی فکر ایک خاص سٹیج پر جا کر سیکولر فکر کے ساتھ ہی جا کر کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ غامدی صاحب کے بیانیہ پر کبھی سیکولر تنقید نہیں کریں گے، انہیں سوٹ جو کرتا ہے۔ غامدی صاحب پر ہمیشہ اسلامسٹوں کی طرف سے تنقید، اور جوابِ بیانیہ دیا جاتا ہے۔

*****

(نہایت قابلِ توجہ، ایک پوری گائڈلائن):

"دانستہ طور پر رائیٹسٹوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ جماعت اسلامی اور جے یو آئی کے مابین ماضی میں مسائل رہے، تو ان نکات کو بار بار اٹھایا جائے گا۔ جماعت اسلامی والوں کو الجھانے کے لئے تقسیم کے وقت مولانا مودودی کی آرا کا مسئلہ چھیڑا جائے گا، کبھی جماعت کی مسلم لیگی مخالفت پر سوال ہو گا، کبھی کسی اور ایشو کو چھیڑ دیا جائے گا۔ اس کا صاف جواب دینا چاہیے کہ یہ سب ماضی کے ایشوز ہیں۔ بنیادی نقطہ یہی ہے کہ کیا پاکستان اسلامی ریاست ہو یا سیکولر؟ اسلامی نظام آنا چاہیے یا سیکولر نظام؟ ہماری اخلاقی نظام کی بنیاد مذہب پر ہونی چاہیے یا پھر اس اخلاقیات کی تشکیل ہر ایک خود کرتا پھرے۔ ان بنیادی سوالات پر بحث مرکوز رکھنی چاہیے، نان ایشوز میں الجھنے کا کوئی فائدہ

نہیں، اپنی توانائیاں ادھر صرف نہ کی جائیں۔ ہر حلقہ فکر کی طرح رائیٹ ونگ میں فالٹ لائنز موجود ہیں، انہیں ایکسپوز کرنے سے گریز کریں۔ آپس میں لڑنے کے بجائے اصل مدعے کی طرف توجہ رکھیں۔ اس کی زیادہ اہمیت ہے۔ اجر بھی اسی کا ملنا ہے۔ یہ اپنی مسلکی، جماعتی شناخت سے اٹھ کر دین اسلام کے لئے فکری جدوجہد کرنے کا وقت ہے"۔

*****

نہایت احترام کے ساتھ ابوالکلام آزاد کو بھارتی سیکولرسٹوں کے لئے چھوڑ دیجئے۔

*****

پاکستانی تناظر میں علامہ شبیر احمد عثمانی کا ماڈل ہی قابل قبول ہو گا۔ حضرت علامہ حسین احمد مدنی کے تمام تر احترام کے باوجود ان کا ماڈل بھارتی ماڈل ہے، ایک ایسے معاشرے کا جہاں کثیر المذاہب لوگ رہتے ہوں، جہاں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں۔ سیکولرازم کا مطالبہ وہیں ہو سکتا ہے۔

*****

مایوس ہونے یا ہمت ہار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسلامسٹوں کی جدوجہد اور نوعیت کی ہے۔ پاکستان میں اللہ کے فضل سے اسلامسٹوں نے بہت اہم آئینی جنگیں جیتی ہوئی ہیں۔ دستور پاکستان سے قرار داد مقاصد یا ملک سے اسلامی لفظ ہٹانا، یا پھر توہین رسالت قانون میں ترمیم وغیرہ، یہ سب سیکولرسٹوں کا ایجنڈا ہے، مایوسی اور فرسٹریشن ہر بار انہی کے حصے میں آتی ہے۔ ریاست کو سیکولر بنانے کا خواب وہی دیکھ رہے ہیں، اس کی فکر بھی انہیں ہی ہونی چاہیے۔ رائیٹ ونگ نے تو جو کچھ حاصل کرنا تھا بڑی حد تک کر لیا، اب فوکس آئین پر عملدرآمد کرنے اور اسلامی معاشرے کے قیام پر کرنا چاہیے۔ دعوت، تعلیم، تربیت کا جو کام انفرادی، گروہی یا جماعتوں کی حد تک ہو سکتا ہے، وہ کیا جائے، حکومت میں آ کر ریاستی وسائل کی مدد سے کچھ کرنے کے مواقع جب ملیں تو ایسا کیا جائے، نہ مل سکیں تو کم از کم پریشر گروپس کا کردار ادا کرتے رہنا ہو گا۔

جدید فتنۂ انکارِ حدیث.. خدشات، اسباب اور تدارک

فرقے

علي عمران
استاذ مدرسہ نصرت العلوم لکی مروت

فتنۂ انکارِ حدیث جو آج کے اس دور میں گویا کہ سر چڑھ کر بول رہا اور ہر خاص وعام کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے .. گو امت میں یہ نئی چیز بالکل نہیں...اور ہم علمی توارث میں جگہ جگہ اس کا ظہور دیکھتے ہیں.. مگر جس شدت کیساتھ یہ گذشتہ صدی سے امت میں در آیا ہے، اور جس طرح اس نے امت کے مسلمات کو گڑبڑانا شروع کیا ہے....یہ البتہ ایک ایسی شے ہے کہ جو نئی بھی ہے اور پریشان کن بھی.. سلف کے زمانے میں انکارِ حدیث ہوا..کچھ اس وقت کے عوام میں دینی حمیت، کچھ عصرِ نبوی کی قربت —— کہ خیر القرون کا قرب حقیقتاً فتن سے بچنے کا ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے.. مسلم ریاست کا مذہب کے معاملے میں تنبیہی اور نہی عن المنکر کو اپنی ذمہ داری سمجھنے کا رویہ....اور سب سے بڑھ کر علمائے متقدمین کے علمی مجاہدات کا نور اور ان کا علمی رسوخ و تصلب....یہ وہ فیکٹرز ہیں کہ جنھوں نے اس فتنے کو دبائے ہی رکھا.. کہیں پر سر اٹھایا بھی، تو ہر رخ اور ہر لائن سے اتنا زور پڑا کہ ریت میں دوبارہ سر چھپانا ہی مجبوری ٹھہری .. مگر یہ زمانہ جبکہ ریاست کا سایہ اسلام کے سر سے اٹھ چکا ہے اور بہت سے وہ مسائل .....اور بہت سی وہ بلائیں کہ جنکا راستہ محض اور محض ریاست کی قوت نے روکے رکھا تھا..... آزاد ہو گئیں.. آزاد ہی نہیں بلکہ درپے آزار ہو گئیں...کچھ فتنے تو ایسے ابھرے، گویا انکی تمتماہٹ اور شان وشوکت دیکھ کر لگتا ہے کہ اسلام کی بنیادیں ہی ان سے ہل جائیں گی .. ایسے عوامی فتنے......کہ جنھوں نے گونگوں کو زبان دی...اندھوں، بہروں کو جگا دیا.. انھی میں سے ایک فتنہ.... جدید انکارِ حدیث ہے .. انکارِ حدیث کا فتنہ اصل میں حدیث کو حجت نہ ماننے کا فتنہ ہے. یعنی حدیث کو مصدرِ فہم دین

نہ ماننا اور دین کے احکام لینے کے لئے حدیث کو ذریعہ نہ بنانا ہے .. منکرینِ حدیث کو ہم دو کیٹگریز میں تقسیم کریں گے .. ایک وہ جو صاف اور صریح الفاظ میں حدیث کی اس حیثیت کا انکار کرتے ہیں... جیسے عبداللہ چکڑالوی، غلام احمد پرویز... وغیرہ .. جبکہ دوسری قسم کے اندر وہ لوگ آتے ہیں، جو صریح الفاظ میں انکار تو نہیں کرتے.. کہیں پر اسے دعوت الی القرآن کے الفاظ کا لبادہ اور سہارا ملا ہے، تو کہیں پر یہ ننگ دھڑنگ الحاد کی گود میں بیٹھ کر اپنا تعفن حدیث و سنت کے صافی چشموں میں انڈیل رہے ہیں.. چونکہ چنانچہ، اگر، مگر اور تاویلاتِ باطلہ سے کام لیتے ہیں.. اس کے لئے چودہ صدیوں سے آنے والی اصول علم حدیث اور اصول فقہ کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے اپنی من مانی کرتے ہیں.. ہر میدان میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں، جو خواہش کے مطابق ہوتا ہے، اس کو لیتے ہیں، جو مخالف ہو، اسے بے تکلف پھینک دیتے ہیں .. یا تو محض عقل کے پجاری ہیں، پھر سلف کے اصول و ضوابط کو چھوڑ کر اپنے نئے اصول و ضوابط وضع کر لئے ہیں. تاویل کا لبادہ اوڑھ کر اپنے مکر کو چھپا رہے ہیں.. اور امت میں حدیث کی حیثیت کو گرد آلود کر رہے ہیں.. چاہے علمی اعتبار سے ان کو منکرین حدیث کا نام دینے میں اشکال ہو، مگر واقعاتی دنیا میں یہ پہلے گروہ سے بڑھ کر نقصان دہ ہیں۔ کیونکہ جب ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ خبردار کیا جاتا ہے، تو یہ فوراً سے پیشتر کہ اٹھتے ہیں کہ جی ہم تو حدیث کو مانتے ہیں.. دیکھیں ہم نے فلاں فلاں جگہ پر اپنی کتاب میں اتنی احادیث ذکر کی ہیں... جن احادیث کا تعلق اخلاق اور انسانی ذمہ داریوں سے ہے، وہاں پر یہ حدیث کو تائید کے طور پر عام طور پر لاتے ہیں.. کیونکہ یہ ان کے مطلب کی چیز ہے۔

یہی جماعت اس وقت ہمارا موضوعِ گفتگو ہے۔ اس قسم کے سربراہ جناب سر سید احمد خان صاحب تھے.. ان کے بعد حافظ اسلم جیراج پوری، تمنا عمادی، نیاز فتح پوری آتے ہیں... زمانۂ جدید میں علامہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ اس "مقدس" مشن کو بااصرار

جاری رکھے ہوئے ہیں .. ہمارا موضوع خاص کر اسی گروہ کے گرد گھومتا ہے.. یہاں پر ہم ان خدشات و اسباب پر بات کریں گے، جو اس فتنے سے متعلق ہیں اور تدارک کی تدابیر پر بات کریں گے .. ہندوستان کے ماحول میں ہمیں سب سے پہلے جناب سر سید احمد خان اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں.. اگر چند الفاظ میں سر سید کی انکارِ حدیث کی وجوہات بیان کی جائیں، تو عقل کا غلط استعمال، اصل حدیث و فقہ سے پوری طرح عدم واقفیت، مصالح قوم کا غلبہ، استشراق سے بے جا متأثر ہونا اور سائنسی تجزیہء کار کا عام ہونا... یہ چیزیں ہر صاحب نظر کو سر سید کے اندر پہلی نظر میں ہی نظر آجاتی ہیں. پھر فکری اور ملکی جمیعت ٹوٹی اور مسالک کا وجود ہوا، تو یہی فتنہ اسلم جیراج پوری، تمنا عمادی وغیرہ کی شکلوں میں پھوٹا .. ان کی اس فکر کے پیچھے دعوت الی القران کے علاوہ احادیث کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک.. جیسا کہ ڈیڑھ، دو صدیوں کے بعد احادیث کا مدون ہونا، راویان میں تشیع کا غلبہ... جیسی باتیں بنیاد بنیں .. تیسرا مرحلہ ہمارا موجودہ مرحلہ ہے۔ جس کے اندر ہمارے ممدوح جناب جاوید احمد غامدی صاحب سر فہرست نظر آتے ہیں.. یہاں پر احادیث کا خلافِ قرآن ہونا، خلافِ عقل عامہ ہونا.. اور سب سے بڑھکر خود غامدی صاحب کے خود ساختہ اصولوں کے خلاف ہونا ہے۔ یہ ہمارا موجودہ مسئلہ ہے اور سر پر کھڑا دستک دے رہا ہے.. کیونکہ فکر غامدی میں ہر عصری خواہش کو پورا کرنے کا تمام مواد موجود ہے۔ خواہش سے سب سے زیادہ ٹکرانے والی چیز سنت ہے اور محترم غامدی صاحب کی سب سے زیادہ تیشہ زنی سنت کو ہی صفِ سنت سے نکالنے پر ہے.. یہاں تک کہ اب ایک مسلمان اور کافر کے درمیان تمیز اتنی مشکل ہوگئی ہے کہ الامان والحفیظ .. جبکہ نہ لباس مسئلہ رہے.. نہ صورت شکل مسئلہ رہے.. نہ معاملات میں کسی حرام بلکہ اشد الحرام سود سے بچنا کوئی مسئلہ رہے.. جب دین میں ریاست اپنی اصل شکل میں کسی کو خلاف شرع کام کرنے پر نہ ٹوک سکے... بلکہ جب مسلمان بننے کے لئے ایمان بالرسالت ہی غیر ضروری ٹھہرے... مطلب

آپ یہودی، عیسائی رہ کر بھی (ایک خاص ماحول کے اندر) حقدارِ جنت بنتے ہیں ...تو پھر کہاں رہا اسلام.. کہاں رہی شوکتِ اسلام .. یہ وہ خدشات ہیں، جو خدشات نہیں.. واقعہ کی دنیا میں سورج کی طرح واضح روپ دھارے دِکھ رہے ہیں .. سوال یہ نہیں کہ المورد والے مخلص نہیں.. ان کے اخلاص پر شک کی کوئی ضرورت نہیں.. ان کے رجوع الی القرآن کی دعوت بہت عمدہ.. دین کو قابلِ فہم اور معقولی بنانے کی کوشش... کوئی شک نہیں کہ یہ ان کے مقاصد ہوسکتے ہیں.. قرآن کو ہی دین کی بنیاد بنانے اور فہمِ دین کا مصدر بنانے کا نعرہ بھی بہت خوبصورت ہے .. افسوس کی بات مگر یہ ہے کہ ان حضرات کی کوششوں سے جیسا دین کا حلیہ بگڑا.. اور حدیث کی تشریعی حیثیت متاثر ہونے سے دین کی بنیادیں جیسی کمزور پڑ رہی، اور وہ ایک دین کی جو چاردیواری چودہ صدیوں سے بن گئی تھی کہ جس کو دور سے ہی دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ یہ اسلام ہے۔ اس کی اپنی ایک پہچان، ایک خاص ٹرمنالوجی اور ایک خاص آئیڈیالوجی ہے.... ان حضرات کی کوششوں سے یہ سارا کچھ ریت کے گھروندوں کی طرح منہدم ہوتا اور ہاتھ سے پھسلتا ہوا محسوس ہورہا ... نفسانیت اور خواہش ..جو براہ راست سنت سے ٹکراتے ہیں.. سنت کو درمیان سے ہٹا کر اسلام کی ایک ایسی من چاہی شکل بنادی گئی ہے اور بنائی جارہی ہے کہ جہاں آپ کچھ بھی کرکے، کچھ بھی بول کر، کچھ بھی بنکر مسلمان ہی رہتے ہیں.. وہ سیکولرازم اور لبرل ازم ... جنکی جڑوں میں خدابیزاری اور دین بیزاری ہے.. جنکی جڑوں میں ہیومنزم کا تازہ انسانی خدا... جنکی باہوں میں نیشن سٹیٹس کے برچھے ہیں، یہ ساری اتنی آسانی سے اور اتنی ہوشیاری سے دین میں داخل کی جارہی اور نفوذ کرتی جارہی... کہ اچھے بھلے انسان کو بھی جب بتایا جاتا ہے کہ آپ جانتے بھی ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ اسلام کی ٹھیٹھ تعلیمات کے مطابق تو یہ شرک کی کسی قسم سے ہی تعلق رکھتے ہیں، تو وہ چونک اٹھتا ہے ایکدم... وہ آپ کا منہ نوچنے کے لئے تیار ہوگا کہ نہیں جی... یہ تو عین اسلام ہے ..جب آپ چودہ صدیوں کی ساری اصطلاحات پر پانی پھیر دیں گے اور ادھر

آپ ایک مغلوب، احساسِ کمتری میں مبتلا تہذیب، ایک مری ہوئی قوم کے مالک اور حامل ہوں گے اور آپ کا دین کسی مائع کی مثل ایک ایسی سیال شے ہے، کہ اسے جس برتن میں ڈالا جائے، یہ اس کی شکل ہی، اس کی ہیئت ہی اختیار کر لیتی ہے..... تب غالب تہذیبیں اور غالب اقوام آپ کے وجودِ فکری اور تشخصِ دینی کا وہ جنازہ نکال دیگی، کہ صدیوں نہیں... شاید چند دہائیوں بعد ہی اس تہذیب اور اس قوم کا نشان مٹ جائیگا.. بس شخصی آزادی کے نام پر وہ چند رسوم، جنھیں کوئی روکنے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس نہیں کریگا کہ جی یہ تو ایزی فیل کرنے اور سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے.. اور بس ...... گویا جو شرارِ بولہبی ازل سے، روزِ اول سے خدا پرستوں سے ستیزہ کار رہا ہے اور اپنی انتہائی چاہت، انتہائی کوشش اور جان توڑ محنتوں کے باوجود اس دین کو مٹانے اور بگاڑنے میں ناکام رہا ہے، وہ خواب، جو کبھی اس نے اپنا سارا جاہ و حشم خرچ کر کے بھی پورا ہونے کا نہیں سوچا تھا، وہ گویا کسی پکے پھل کی طرح، خود ہم نے ہی اسکی جھولی میں ڈال دیا ہے.. بلا کچھ کیئے، ہاتھ پاؤں ہلائے، ایک دمڑی بھی خرچ کئے بغیر... بشرطیکہ مان لیا جائے کہ ان "مصلحین" کے پیچھے اس طرح کی کوئی چیز نہیں.. اور واقعاتی شہادتوں کو بھی محض حسنِ ظن کی بنیاد پر جھٹلایا جائے.. یہ گویا ایسی خدمت ہے کہ جو آج خود مسلمانوں کے ہاتھوں انجام دی جا رہی ہے۔ جاہلیت جدیدہ کی ساری شکلیں، جنکا اسلام اول وہلے، پہلے قدم پر انکار ہی اپنے وجود اور حیثیت کی یاددہانی کا راستہ بناتا ہے.. اس کو اپنے ہی اندر سے بیساکھیاں فراہم کی جارہی... اور سمجھا یہ جارہا کہ دین کی خدمت ہو رہی ہے..

یہ دیکھے بغیر کہ ان چیزوں کی، جنکی طرف آپ شدومد سے بلا رہے ہو اور انہیں ہی اسلام کا حقیقی چہرہ بتلا ہے ہو... کی تعمیم سے اسلام کا وہی چہرہ بنے گا، جسے جاہلیتِ جدیدہ کے یہ معمار چاہتے ہیں .. کیا یہ حقیقت نہیں کہ یورپ سے پوری تاریخ میں بھی اسلام کو یہ... اور ایسا نقصان کبھی نہیں پہنچا تھا کہ اسلام ہی پہنچایا نہ جاسکے .. بے شک مسلمانوں کے

ساتھ بہت کچھ ہوا.. بہت کچھ کیا گیا.. مگر اسلام محفوظ ہی رہا .. کیا پتہ تھا کہ اسلام کی یہ درگت خود کو مسلمان کہلوانے والوں کے ہاتھوں بنے گی .. فیا اسفی .. سوال جو ہم قارئین سے کرنا چاہتے ہیں... وہ یہ کہ کیا یہ سب کچھ اتفاقی ہے؟

اس حقیقت سے اغماض بھی غلط ٹھہرے گا کہ ہمارا نوجوان طبقہ اس فتنے کی طرف بڑی تیزی سے متوجہ ہو رہا ہے.. اور اصل حیرت تب ہوتی ہے جب ایسے فاضلین کو دیکھتے ہیں، جنکے ساتھ کسی ٹھیٹھ روایتی ادارے کی سند بھی ملحق ہوتی ہے... مگر وہ باغ المورد سے خوشہ چین ہوتے ہیں .. سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات ہیں، جنکی بنیادوں پر یہ فتنہ برپا ہوا اور بڑھتا چلا جا رہا .. مجھے کہنے دیں کہ اس کے ذمہ دار خود ہمارے روایت پسند طبقے ہیں .. ہندوپاک کی فضا میں روایت پسند طبقوں سے مراد قرآن وحدیث سے براستہ فقہاء تمسک کرنے والے دیوبندی وبریلوی مسالک اور قرآن وحدیث سے براہ راست تمسک کرنے والے یعنی اہل حدیث وسلفی مسلک .. ہم ہر دو طبقوں کو اس جرم میں شریک سمجھتے ہیں۔ طبقہء فقہاء کے اندر جمودی تقلید نے جس طرح ذہنوں کو باندھا تھا، گو ریاست کی جبر نے کسی حد تک لوگوں کی زبانیں بند رکھی تھی... مگر جب ایک طرف ریاست کا جبر ہٹا.. دوسری طرف آزادی ملی.. تیسری طرف مطالعہء حدیث کی یہ آواز لگی کہ فقہاء اور شخصیات کو چھوڑ کر براہ راست مصادر شریعت سے دین لو.. تب ہمارے مدارس کے فضلاء، جن کو مؤطا امام محمد اور طحاوی صرف دکھانے واسطے دی جاتی ہے.. جبکہ دوسری طرف وہ تمام کتب جو احناف کی مسائل کے خلاف احادیث سے بھری ہوئی ہیں، ان کو پڑھائی جاتی ہیں... پھر جب ہر بات پر وہ دیکھتے ہیں کہ جی بخاری یہ کہہ رہا، مسلم یہ کہہ رہا.. ابن ماجہ یہ کہہ رہا.. اور احناف کا مسلک اس کے بالمقابل یہ ہے، تو چونکہ امام صاحب کی استناد کا علم تو ہے نہیں... اب اگر عقیدت مند ہے، تب تو یہ یقین کرلے گا کہ امام صاحب کے پاس اس سے بہتر دلیل ہوگی.. اور کسی مسئلہ کا حدیث کی ان کتابوں میں نہ ہونا اس بات کی دلیل

نہیں کہ وہ دوسری کتب میں بھی مذکور نہ ہو..... یہ سمجھ کر چپ رہیگا .. لیکن اگر بچہ ذہین ہے.. ذہن پر اطاعت سے زیادہ شرارت سوار ہے.. عقل کے راستے اس الجھن سے نکلنا چاہتا ہے.. آپ کی درسی تقریر سے مطمئن نہیں ہو رہا، تو اب اس کے لئے آپ نے کیا کیا ہے؟ آپ نے ابن حجر کی ایک کتاب اصل حدیث پر بھگاتے بھگاتے نکال دی ہے.. آپ نے اصول فقہ کی صدیوں پرانی کتاب، ادق زبان کی حامل، صدیوں پرانے طریقے سے پڑھائی..نہ تطبیق دی..نہ ان پر احکام کی تفریع کرائی.. کہ آپ کا بچہ صرف ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا ہے ..اب جب کوئی انشاء پرداز، کوئی ادیب قلم کار، منکرِ حدیث)مذکورہ بالا تشریح کے مطابق)لکھتا ہے، تشکیک کے تار و پود کو الفاظ کا لبادہ پہناتا ہے..شک کے برہنہ وجود پر تاویل کی دسیسہ کاری کرتا ہے..اس کی زبان بھی عام فہم..اس کا طرز بھی دلنشین، اس کا انداز بھی جدید..وہ باڈی لینگویج سے باخبر، الفاظ کی بُنت کا ماہر...تو آپ کا یہ نوخیز طالب علم..یہ مدرسہ سے تازہ فارغ التحصیل، اس کی مادی زندگی کی رنگینیوں کو دیکھتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ یہ حضرت علامہ بھی کہلاتے ہیں..زندگی میں کوئی قید بھی نہیں..ہٹو بچو کا شور بھی ہر طرف سے اٹھتا ہے۔ قدامت پرستی کا طعنہ بھی نہیں لگ رہا ..خود ملک عزیز کے اندر اسلام پسندوں اور دیندار طبقے کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت......یہ ساری چیزین اسے اٹھا کر، اس تجدد پسند کی گود میں ڈال دیتی ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ آپ نے نہ اسے اصول فقہ پر تطبیق دی، نہ اصول حدیث کی تحقیق کرائی..نہ احناف کے اصولِ اخذ حدیث، ترکِ حدیث سکھائے..تو جب وہ ہر جگہ پر، ہر حدیث کے مباحثے کے دوران یہ الفاظ سنتا ہے کہ یہ مذہب فلاں کا ہے..یہ مذہب فلاں کا ہے..اس کے مقابلے میں احناف کا کہنا یہ ہے، تو یہ نوخیز بچہ دل ہی دل میں یہی سمجھتا ہے کہ گویا احناف حدیث کے منکر ہیں۔ تو اصول پر گرفت نہ ہونے کے باعث وہ اٹھ کر جاتا ہے اہل حدیث کے پاس.. کہ جی یہ تو عامل بالحدیث ہیں.. لیکن جب یہاں آکر وہ دیکھتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے بلا تکلف حدیث

پڑھو.. اب جب کتابوں کے اندر اس کا مطالعہ بڑھتا ہے، تو اس کو نظر آتا ہے کہ یہاں پر تو بہت زیادہ احادیث ایسی ہیں کہ جنکا رد خود اہل حدیث کے عمل سے ہو رہا ہے .. تو وہ ایکدم سے جھنجھلا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ جب ان "چکنے چکنے "منکرین کو دیکھتا ہے، ان کی مادی کروفر کو دیکھتا ہے، ان کے لباس، حلئے کو دیکھتا ہے، تو بے اختیار لپک کر جاتا ہے اور ان کے گلے لگ جاتا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ احناف کے مدارس میں کتب اخلاق وتربیت کا آخر میں پڑھانا بلکہ بھگانا... طلبہ کو مادیت کے مقابلے میں ان کی زندگی کے بہترین آٹھ دس سال گذارنے کے بعد بے سہارا، ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لئے چھوڑ جانا ..اسی طرح اہل حدیث اور سلفی حضرات میں عوامی سطح پر عامۂ فقہاء پر رد، قلبی واردات سے فرار اور امور قلبیہ کی طرف سے عدم اعتناء ایسی چیزیں ہیں، جو ہمارے بچوں کو ہم سے چھین رہی ہیں.. انکار حدیث، جس کی جلو میں اور جس کے آگے پیچھے مادیت ہی مادیت چھپی ہوئی ہے، الحاد ہی الحاد اور زندقہ ہی زندقہ .. مین پوری بصیرت سے سمجھتا ہوں کہ اگر تو ہم نے اپنے طلباء کو اصول حدیث، فقہ، اور اصول تفسیر کی تیسیر کرائی .. ان کی اخلاقی، روحانی تربیت کی، ان کے سامنے احناف کے اخذ حدیث اور ترک حدیث کی عملی تطبیقات بیان کیں، پھر ان کے معاش کی بھی فکر کی.. تو ان شاء اللہ میدان ہمارے ہاتھ رہیگا .. یہ ہوا، تو بہت عمدہ.. ورنہ تو کھلی آنکھوں سے الحاد وزندقہ آپ کے انہی روایت پسند طبقات سے نکلتا دیکھائی دے رہا ہے .. سو اے صاحبان.. یہ دہائی ہے دردِ دل کی .. خدا کرے سمجھے کوئی..

قیامت کی نشانیاں:

علمائے سلف کو چھوڑ کر بونوں سے علم لیا جانا

فرقے

حامد کمال الدین

جیسا کہ اِن احادیث و آثار کے سیاق سے ظاہر ہے، یہاں علم لینے سے مراد کسی سے 'پڑھ لینا' نہیں بلکہ "دین کا فہم لینا" ہے۔
'جدت پسند' سے ہماری مراد وہ تمام افکار ہیں جو اِس دورِ استشراق میں دین کا فہم، بلکہ فہمِ دین کے اصول ہی، علمائے سلف کی بجائے اپنی اقوال سے لیتے اور اسی کو مستند جانتے ہیں۔

عن أبی أمیة اللخمی (الجمحی)، أن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: "**إن من أشراط الساعة ثلاثة، إحداهن: أن يُلتمَس العلمُ عند الأصاغر**"۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، الحدیث رقم: ۱۷۵۳۶، الزہد والرقائق لابن المبارک رقم: ۶۱۔ قال الألبانی صحیح۔ انظر السلسلة الصحیحة ج ۲ رقم الحدیث ۶۹۵)

ابو امیہ جمحی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **قیامت کی نشانیوں میں سے تین ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ: علم بونوں کے ہاں ڈھونڈا جائے گا۔**[1]

---

[1] ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ اِس حدیث کے تحت، قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ اور عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال لاتے ہیں:

وذکر أبو عبید فی تأویل هذا الخبر عن ابن المبارک أنه کان یذهب بالأصاغر إلیٰ أهل البدع ولا یذهب إلی السِّنِّ۔ قال أبو عبید: وهذا وجه۔ قال أبو عبید: والذی آریٰ أنا فی الأصاغر أن یؤخذ العلم عمن کان بعد أصحاب رسول اللہ

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه، قال: "**لا يزال الناس بخير ما أتاهم العلم من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قال، ومن أكابرهم، فإذا جاءهم العلم من قِبَلِ أصاغرہم فذلک حين هلكوا**"۔ (المعجم الکبیر للطبرانی الأثر رقم: ۸۵۱۱، کتاب الزہد والرقائق لابن المبارک، الأثر رقم: ۸۰۲، جامع بیان العلم ۱: ۶۱۷)

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا[2]:

"لوگ خیر خیریت سے رہیں گے جب تک علم اُن کو اصحابِ رسول اللہؐ سے پہنچتا رہے گا، اور ان کے بڑوں سے پہنچتا رہے گا۔ ہاں پھر جب ان کو علم اُن کے بونوں کے پاس سے آنے لگے گا تو یہ وہ وقت ہو گا جب وہ ہلاک ہوں گے"۔

كان عمرُ يقول: إنَّ أصدق القيلِ قيلُ الله۔ ألا وإن أحسن الهدىِ هدىُ محمدٍ صلى الله عليه وسلم قال۔ وشر الأمور محدثاتها، وكل محدثة ضلالة۔ ألا وإن الناس بخيرٍ ما أخذوا العلم عن أكابرهم، ولم يقم الصغير على الكبير، فإذا قام الصغير على الكبير فقد"۔ (شرح

ﷺ، فذاک أخذ العلم عن الأصاغر۔ (جامع بیان العلم۔ ج۱ص ۶۱۲۔ الأثر قم: ۱۰۵۲)

ابو عبید نے اس حدیث کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ابن المبارک اس طرف گئے ہیں کہ اس میں "اصاغر" سے مراد ہیں اہل بدعات، اور یہ کہ اس کا تعلق کسی کی عمر سے سے نہیں۔ ابو عبید کہتے ہیں: یہ اس کا ایک مطلب ہے۔ ابو عبید نے کہا: اور جو میری رائے ہے وہ یہ کہ اصاغر سے مراد ہے دین کا علم و فہم اُن لوگوں سے لیا جائے گا جو اصحابِ رسول اللہؐ کے بعد ہیں۔ تو یہ ہوا اصاغر (بونوں) سے علم لینا۔

[2] اس اثر میں ابن مسعود اور اس سے اگلے اثر میں عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے۔ تاہم محدثین کے ہاں اصول یہ ہے کہ وہ بات جو ایک صحابی مستقبل کی پیشین گوئی کے سیاق میں بیان کرے وہ مرفوع کا درجہ رکھتی ہے، کیونکہ غیب کی بابت صحابی رسول اللہ ﷺ سے سنے بغیر کوئی بات نہیں کرتا۔

أصول الاعتقاد للالكائی ۱: ۸۴، الأثر رقم ۸۸۔ وذكر جزءاً منه فی جامع بيان العلم ۱: ۶۱۵ الأثر رقم: ۱۰۵۴)

عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

سب سے اچھا کلام اللہ کا قول ہے۔ سب سے اچھا نمونہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہے۔ سب سے بری چیز وہ ہے جو دین کے اندر نئی نکال لی گئی ہو، اور ہر نئی نکال لی گئی بات گمراہی ہے۔ خبردار! لوگ خیر سے رہیں گے جب تک کہ وہ علم اپنے بڑوں سے ہی لیں، اور جب تک یوں نہ ہونے لگے کہ چھوٹا، بڑے کے اوپر بڑا بنے۔ ہاں جب چھوٹا، بڑے پر بڑا بننے لگا، تو تب وہ وقت ہو گا کہ..

اس معنیٰ کے کئی دیگر آثار نقل کرنے کے بعد... آخر میں جا کر ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ ایک تقریر دیتے ہیں، گو اس میں بھی ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کچھ آثارِ سلف کی جانب ہی اشارہ کرتے ہیں:

وقال آخرون: **معنیٰ حديث ابن عمر وابن مسعود فی ذلک أن العلم إذا لم يكن عن الصحابة كما جاء فی حديث ابن مسعود، ولا كان له أصل فی القرآن والسنة والإجماع، فهو علم يهلك به صاحبه، ولا يكون حامله إماما ولا أمينا ولا مرضيا كما قال ابن مسعود، وإلىٰ هذا نزع أبو** عبيد رحمه الله۔ (جامع بيان العلم۔ ج ۱ ص۶۱۸۔ الأثر رقم: ۱۰۵۶)

دیگر بزرگانِ سلف رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے کہ:

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ و ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مفہوم اس سلسلہ میں یہ ہے کہ علم اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلتا ہوا نہ آیا ہو، جیسا کہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں ہے، اور نہ اس کا کوئی اصل قرآن میں ہو اور نہ سنت میں اور نہ اجماع میں تو وہ ایک ایسا علم ہو گا جو آدمی کو برباد کروادے۔ ایسے علم کا حامل نہ امام ہو گا، نہ امانت کا محل، اور نہ قابل اطمینان، جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اور اسی معنیٰ کی جانب امام ابو

عبید (قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ) کا میلان ہے۔

*****

خیر القرون کے تمام ائمۂ علم کو دیکھیں (جن میں ائمۂ اربعہ بھی آتے ہیں)... تو ان کے یہاں آپ کو یہ بات ایک دستور کی طرح نظر آئے گی کہ۔ فہمِ دین و تفسیرِ نصوص کے معاملہ میں۔ "صحابہ کے اقوال کی اتباع لازم ہے"۔[3] دورِ اول کے ائمۂ علم کا یہ دستور جاننے کے لیے آپ ہماری کتاب کی مذکورہ فصل سے رجوع فرما سکتے ہیں۔

یعنی یہ محض کسی ایک آدھ امام کی رائے نہیں، بو حنیفہؒ و شافعیؒ سمیت سب کا دستور ہے۔ اس دستور کو 'چیلنج' کرنے والے تو پیدا ہی بہت بعد میں جا کر ہوئے۔ جو علم کی اساس ہی اور فہم کے مبادی ہی اپنی 'اقوال' سے جاری کر کے امت کو دینے لگے۔

وہ دور (خیر القرون) جس سے ___ صحابہؓ کے علمی اتباع کو لازم ٹھہرانے کے حوالے سے ___ ایسے ڈھیروں آثار اور نقولات ملتے ہیں.. یہاں تک کہ اُس دور کا کوئی بھی امام، علمائے صحابہؓ کے علمی مقررات سے ہٹ کر اور اقوالِ صحابہؓ سے نکل کر اپنی مصنوعات سامنے لانے کا روادار ہی نظر نہیں آتا، (اور اگر کسی نے یہ بدعتی کام کیا تو وہ خوارج و روافض و معتزلہ وغیرہ ہوئے، جن کو خیر القرون کے اُس معاشرے سے صبح شام سننے کو کچھ ملتا تو وہ ضلالت اور بربادی کی وعیدیں ہوتیں)..

نہایت ضروری ہے کہ اُس دور کی اُن اشیاء کا جو اُس کے یہاں مسلمات کی حیثیت کر گئی تھیں صحیح صحیح مول لگایا جائے۔ ایک نہایت عظیم بات کو محض ایک جملے میں اڑا دینے کا اسلوب تباہ کن ہے۔

---

3 خیال رہے یہاں بات 'قولِ صحابی' کی نہیں ہو رہی، جو کہ خود ائمۂ سنت کے مابین مختلف فیہ ہے۔ بلکہ بات یہاں بطورِ جنس 'اقوالِ صحابہ' کی ہو رہی ہے جس کا اتباع تمام ائمۂ سنت کے ہاں ضروری ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: کتاب کی فصل "صحابہؓ کا اتباع اہلسنت کے سب مذاہب کے نزدیک واجب ہے"۔

ویسے ہم صحابہ کی عزت بڑی کرتے ہیں۔ بو حنیفہ و شافعی کا بھی احترام بہت ہے۔ مگر مقرراتِ سلف کی اتباع کو واجب ٹھہرانے والے آثارِ شافعیؒ کو ہم ایک جانب لڑھکا دیں گے، آثارِ بو حنیفہؒ کو کسی دوسری جانب، آثارِ مالکؒ کی کسی اور طرح توجیہ کر لیں گے اور احمدؒ و اوزاعیؒ و بخاریؒ وغیرہ کے آثار سے کسی اور طرح جان چھڑا لی جائے گی اور زیادہ ہی ہوا تو فہمِ صحابہؓ کی اِس غیر معمولی تعظیم کی بابت اِن ائمۂ علم کے لیے کوئی 'عذر' تلاش کیا جائے گا کہ صاحب وہ تو کوئی دور ہی ایسا تھا کہ سب لوگ ایک سی ہی 'غلطی' کرتے چلے آئے ہیں اور اُن پر تو اقوالِ ابو بکرؓ و عمرؓ و ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ وغیرہ کی دھاک ہی کچھ غیر ضروری طور پر بیٹھی رہی ہے... بس ہم آئے ہیں تو اَب کہیں جا کر بو حنیفہؒ و شافعیؒ کے اُن نسل در نسل چلے آنے والے (تعظیمِ صحابہؓ پر مبنی) دستوروں کی اصلاح ہونے لگی ہے!

ردِ تقلید کے مومنٹم سے زور پکڑنے والا یہ آزادی پسند رویہ جو کئی ایک عوامل کے تحت اب تیزی کے ساتھ مقبولیت پانے لگا ہے... شدید حد تک باعث تشویش ہے۔

کچھ اور نہیں تو اِس ایک ہی بات کو مد نظر رکھ لیا جائے کہ: آپ کا یہ دور جس میں کھڑے ہو کر آپ کو ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ، بخاریؒ وغیرہ کے یہ متفقہ مقررات 'غلط' نظر آتے ہیں، آپ کا یہ دور جس میں کھڑے ہو کر آثارِ صحابہ کی اتباع کا لزوم آپ کو فرسودہ نظر آتا ہے... جہالت اور علمی بونا پن کا دور ہے (ابھی اس کے ساتھ ہم اھواء اور بغی اور بیرونی اثرات __ خصوصاً استشراقی اثرات جو کہ ہوا میں پھیلے ہوئے وبائی خصائص کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور آپ سے آپ نفس میں اترتے ہیں __ کا ذکر نہیں کر رہے)۔ اور یہ کہ جس دور کے علمی مقررات آج جا کر آپ کو 'غلط' اور 'فرسودہ' نظر آنے لگے ہیں وہ علم اور ہدایت کا تابناک ترین دور ہے!

(اِس موضوع کو تفصیل میں پڑھنے کے لیے ہماری کتاب ''فہمِ دین کا مصدر'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے)۔

مرزائیت کا دوسرا رخ

حامد کمال الدین

فرقے

جتنا بڑا زندیق وہ شخص ہے جو محمد ﷺ کے بعد کسی کو نبی مانے... اتنا ہی بڑا زندیق وہ شخص ہے جو دنیا کے کسی آدمی کے لیے **محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر (جبکہ وہ نبی ﷺ کی بابت جان چکا ہو) "نجات" کا امکان** تسلیم کرے۔

جتنا بڑا ملحد وہ اتنا ہی بڑا **ملحد اور منکرِ نبوتِ محمدؐیہ**۔ اگرچہ محمد ﷺ پر ایمان کا دعویٰ وہ بھی کرتا ہے اور یہ بھی۔ محمد ﷺ کی شریعت پر چلنے کا دعویٰ اُس کو بھی ہے اور اِس کو بھی۔

خاتم المرسلین محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو جانے کے بعد... کرۂ ارض پر بسنے والے کسی ابن آدم کے لیے جو شخص مہاتما بدھ، زردشت یا گورونانک تو کیا... موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان کو کافی قرار دے، یعنی **محمد ﷺ پر "ایمان لائے" اور "آپ ﷺ کی اتباع اختیار کیے" بغیر اس کے لیے نجات کا امکان تسلیم کرے**... تو اس کے کفر اور الحاد میں کوئی شک نہیں۔ اصولِ اسلام میں اِس معاملہ پر کوئی اِبہام نہیں۔

تمام اہل زمین پر **محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان فرض** ہونا اور **محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر ان کو نجات کی کوئی صورت میسر نہ** ہونا... یہ اسلام کے محکمات میں سے ایک ہے۔

محکمات... جن کی طرف مشتبہ و موجبِ اشکال امور کو لوٹایا جاتا ہے۔

محکمات... جن کی روشنی میں مشتبہ امور کو سمجھا اور ان کی دلالت و حدود کا تعین کیا جاتا ہے۔

محکمات... جو اِشکال کے مقامات پر حَکَم اور فیصل ہوتے ہیں۔

محکمات... جن سے تعارض کی صورت میں ایک مشتبہ فہم کو رد کر دیا جاتا ہے، نہ کہ مشتبہ فہم سے ٹکرانے کی بنیاد پر ان **محکمات** کو رد کر دیا جاتا ہے۔

"محمد ﷺ کی رسالت تا قیامت... تمام بنی آدم کے لیے"... پر ایمان کو **"نجات"**

کی بنیاد تسلیم کرنا اور **اس کے بغیر آدمی پر دوزخ کا واجب ہونا**... اسلام کے محکمات میں سے ہے۔ "گلوبلائزیشن" کی حالیہ ضرورتوں کے پیش نظر آج اسلام کی ان بنیادوں کو ہلایا جانے لگا ہے۔ علماء نے "مرزائیت کے اِس دوسرے رخ" کا نوٹس نہ لیا تو آپ کی نئی نسل کے حق میں یہ قادیانیت سے بڑھ کر ایک فتنہ ثابت ہو سکتا ہے۔

براہِ کرم... علماء تک ہماری یہ درخواست پہنچائی جائے کہ "رسالتِ محمدی کی عالَمیت و ابدیت" پر عنقریب جو بڑے پیمانے پر گرد ڈالی جانے والی ہے اس کا پیشگی ادراک کریں، اور اِس مسئلہ کو، نیز اِس مسئلہ کے منکر کو زندیق اور ملحد ٹھہرانے کو، وقت کی گونج بنا دیں۔

گلوبلائزیشن کی یہ آندھی ہمارے بہت سے کواڑ توڑ دینے والی ہے۔ آپ کے پڑھے لکھے دماغ اِس عفریت کے منہ میں جانے کو ہیں۔

ہمارا نظریاتی محاذ اِس وقت کا سب سے بڑا محاذ ہے۔

*****

قربِ قیامت کی نئی نئی دعوتوں کی بابت نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

"يَكُونُ دُعَاةٌ عَلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ, مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا", قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ, صِفْهُمْ لَنَا, قَالَ: "هُمْ قَوْمٌ مِنْ جِلْدَتِنَا, يَتَكَلَّمُونَ بِأَلْسِنَتِنَا"

"جہنم کے دروازوں پر کھڑے داعی ہوں گے، جو ان کی مانے وہ اسے جہنم میں پہنچائیں گے۔ میں (حذیفہ بن الیمانؓ) نے عرض کی: ہمیں ان کی نشانی بیان فرمادیجئے۔ فرمایا: وہ ہمارے ہی رنگ نسل کے لوگ ہوں گے، ہماری ہی زبانیں بولتے ہوں گے" (بخاری)

پس خبر دار رہیے... ہر وہ نئی دعوت، جس پر اہل اسلام اِس سے پہلے نہ پائے گئے ہوں، جہنم کی دعوت ہے۔

(اِس موضوع کو تفصیل میں پڑھنے کے لیے ہماری کتاب "فہمِ دین کا مصدر" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے)۔

اقْتِضَاءُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ مُخَالَفَةَ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ

پیچھے بیان ہو آیا، رسول اللہ ﷺ نے امت کو تنبیہ فرمائی تھی کہ دیکھنا مغضوب علیھم اور ضالین امتوں کی ایک ایک بات تمہارے یہاں بھی اختیار ہونے لگے گی۔

مختصراً، میں چند ایسے تشویشناک امور کی نشاندہی کروں گا جو اہل کتاب کی پہچان رہے ہیں مگر وہ امتِ اسلام کے کئی ایک طبقوں کے اندر بھی سرایت کر آئے۔

ابن تیمیہؒ

حصہ چہارم

مسلمانوں میں در آنے والے

اہل کتاب کے بعض خصائل

فصل24

علم اور ہدایت ایسی نعمت پر دوسروں سے حسد

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءُالصِّرَاطِالمُستَقِیم

اہل کتاب کی اس مخصوص خصلت کی بابت قرآنِ مجید کا بیان یوں آیا:

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ (البقرۃ:109)

بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں یہ تمہیں تمہارے ایمان سے پھیر کر کافر کر دیں، اپنے نفسوں کے حسد کے باعث۔

عین اِسی خصلت کے اندر خود ہماری امت کے بعض مدعیانِ علم گرفتار ہو جاتے ہیں۔یعنی اللہ نے کسی کو ایک علمِ نافع یا ایک عملِ صالح سے نواز رکھا ہے تو بجائے اس پر خوش ہونے کے، یہ اس سے حسد کرنے لگیں گے۔ خدا کے در سے اگر کسی کو خیر ملی ہے تو اس پر جل بھن جانا دراصل مغضوب علیھم کا وتیرہ ہے۔ انعام یافتگان (أنعمت علیھم) کا یہ شیوہ نہیں۔ہاں دل اتنا بڑا رکھنے پر 'لگتی ہے محنت زیادہ'۔

(کتاب کا صفحہ 471تا490)

فصل 25

علم کا بخل اور حق کا کتمان

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءُالصِّرَاطِالمُستَقِيم

اہل کتاب کا وصف قرآن میں بیان ہوا:

الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ

(النساء:37)

جو آپ بخل کریں اور اوروں سے بخل کے لیے کہیں، اور اللہ نے اپنے فضل سے انہیں جو عطا کیا اسے چھپا چھپا رکھیں۔

یعنی بخل جو مال کا ہوتا ہے۔ یا پھر علم کے اندر ہوتا ہے۔ کسی کو اس کی ہوا نہ لگنے دینا۔ مغضوب علیہم کی خصلت بیان ہوئی: علم کو چھپانا: کہیں تھڑدلی کے باعث تو کہیں اس لیے کہ حق سے خاموش رہ کر کچھ دنیا کمائی جا سکے۔ اور کبھی اس وجہ سے کہ مخالف کو اپنے خلاف دلیل ہاتھ نہ آنے دی جائے۔

اسی سے ملتا جلتا معاملہ ہماری امت کے بعض مدعیانِ علم کا ہوا۔ یہ بھی علم کو چھپاتے ہیں۔ اور وہی تھڑدلی کہ کہیں کوئی دوسرا شخص بھی ان جیسا مرتبہ اور مقام حاصل نہ کر لے۔ یا اس لیے کہ اس حق سے خاموش رہ کر دنیا کا کوئی مفاد یا منصب ان کے ہاتھ آیا رہے۔ اور کبھی اس لیے کہ اگر یہ لوگ ایک حق بول دیں تو مخالف کا حق پر ہونا لوگوں پر واضح ہو جائے گا۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل26

شخصیت پرستی میں انکارِ حق

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءُالصِّرَاطِالمُستَقِیم

یہود کا وصف بیان ہوا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ (البقرۃ:91)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں ہم تو اسی کو مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اسے نہیں مانتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اور تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے۔

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا (البقرۃ:89)

حالانکہ اس سے پہلے وہ (اِس نبیؐ اور شریعت کے حوالہ سے) کافروں پر فتح پانے کی دعائیں کیا کرتے تھے۔

غرض یہود کی یہ خصلت بیان ہوئی کہ: ایک ایسا نبی جو ان کی اپنی جماعت اور قبیلے سے نہیں یہ اس کے پیروکار ہونے کے نہیں۔ بضد ہیں کہ خدا کی نازل کی ہوئی بھی کسی ایسی ہی بات پر ایمان لائیں گے جو خود اِن کے ہاں پائی جائے۔ یعنی حق بھی قبول ہو گا تو وہ اپنے ہی دھڑے کے لوگوں سے۔ اپنے دھڑے سے باہر ہے تو وہ لاکھ حق ہوا کرے، اور خواہ وہ حق ان کے اپنے ہی اعتقاد کا لازمہ ہو، قبول نہیں!

یہی بات رفتہ رفتہ ہمارے بہت سے مدعیانِ علم و دین اور صاحبانِ فقہ و تصوف کے ہاں پائی جانے لگی۔ یہاں؛ دین کی وہی بات مانی جائے گی جس پر اپنے گروہ کی چھاپ ہو۔ حق

اپنے گروہ سے باہر ہو تو ان کو بالکل متاثر نہیں کرتا! حالانکہ دینِ اسلام حق کی مطلق اتباع کا حکم دیتا ہے؛ روایت کا معاملہ ہو تو بھی اور درایت و معنیٰ کا معاملہ ہو تو بھی۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کی قید نہیں، سوائے رسول اللہ ﷺ کے جو ہمارے اور خدا کے مابین واحد مستند واسطہ ہیں۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل27

وحیِ خداوندی میں تحریف

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءالصِّرَاطِالمُستَقِيم

یہود کی ایک خصلت بتائی:

مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ (النساء:46)

یہودیوں میں بعض ایسے ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (آل عمران:89)

اور ان میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل (ملاوٹ) کرتے ہیں کہ تم سمجھو یہ بھی کتاب میں ہے اور وہ کتاب میں نہیں، اور وہ کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے اور وہ اللہ کے پاس سے نہیں، اور اللہ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں۔

تحریف (یعنی کلام کو اس کے اصل پر نہ رہنے دینا)۔ یہ یہود کے ہاں وحی کے الفاظ کے ساتھ بھی ہوتا رہا اور معانی کے ساتھ بھی۔

ہماری امت میں بھی بہت سے گروہ تحریفِ معنوی میں ملوث رہے۔ احادیث کے معالمہ میں تو یہ تحریفِ لفظی تک چلے جاتے رہے۔ یعنی احادیث کو منکر روایات سے بیان کرنا۔ بلکہ تنزیلِ خداوندی میں بھی تحریفِ لفظی کی کچھ کوشش ہوئی، جیسا کہ صفتِ کلام کی نفی میں زور لگانے والے بعض طبقوں نے چال چلی کہ سورۃ النساء کی اِس آیت میں یہ لفظ اللهُ کو پیش کی بجائے زبر کے ساتھ پڑھیں وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا (ترجمہ "اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا") تاکہ کلام کرنے والا (فاعل) اللہ نہ رہے، موسیٰؑ ہو جائیں۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل28

مخلوق ہستیوں کو خالق کے ساتھ جا ملانا

ہماری نئی تالیف

اقتضاء الصراط المستقیم

ضالین (نصاریٰ) کی بابت فرمایا:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے۔

اِدھر ہماری امت میں بھی انبیاء و صالحین کی بابت ایسا ایسا غلو کرنے والے ہوئے کہ ان نیک ہستیوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ بشری صفات کی بجائے انہیں خدائی صفات دے ڈالیں۔ ایسے لوگ صوفیہ اور عباد تگزار طبقوں میں بہت ہوئے۔ بعضوں نے نصاریٰ سے بدتر قول کہا۔ یہاں تک عقیدہ رکھا کہ فلاں نیک ہستی میں خدا اتر آیا (حلول کا عقیدہ) اور فلاں نیک ہستی خدا سے یکجا ہوئی (اتحاد کا عقیدہ)۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل29

پیشوا شخصیات کی اطاعت میں غلو

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءُالصِّرَاطِ المُستَقِیم

یعنی اگر کچھ لوگوں کی تعظیم کرنا یا ان کے کسی علمی مرتبے یا سیاسی منصب کے حوالے سے ان کی اطاعت اور پیروی کرنا بنتا ہے... تو یہاں اس حد تک چلا جانا کہ وہ شخصیات آدمی کے لیے مطلق پیشوا ہو جائیں۔ یعنی شریعت سے بالاتر وہ کسی حرام کو اس پر حلال کر دیں یا حلال کو حرام، تو بھی وہ انہی کی مانتا جائے۔

یہود و نصاریٰ کے ہاں یہ باقاعدہ ہوتا رہا۔ ان دونوں گروہوں کی بابت فرمایا:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ (التوبۃ:31)

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔

اس آیت کی تفسیر نبی ﷺ نے یہ فرمائی کہ وہ ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تو اس میں یہ ان کی اطاعت کرتے۔ [1]

---

1 یہاں ایک خلط مبحث کی نشان دہی ضروری ہے۔ بعض حضرات اس آیت کا اطلاق وہاں بھی فرما رہے ہوتے ہیں جہاں ایک عامی کو فقہی مسائل میں ائمۂ سنت مانند ابو حنیفہ و مالک و شافعی و احمد رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیق پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔ عامی کے ان ائمہ میں سے کسی ایک پر تحقیقی سہارا کرنے کو یہ خدا کے بندے 'شرک' اور 'ائمہ کو اَرباباً من دون اللہ' بنالینا قرار دیتے ہیں... جبکہ ان ائمہ کی تحقیق کے مقابلے پر (ایسے تمام فقہی مسائل میں) اپنی تحقیق کرنے چل دینا 'توحید'!!

نہایت واضح ہو، اس آیت کا اطلاق وہاں ہو گا جہاں ایک چیز کا خلافِ شریعت ہونا مسلم معاشرے میں معلوم اور معروف ہو۔ (کسی تحقیق کے شبہے کے تحت ایسا نہ ہو)۔ مثلاً نصاریٰ کے

یہاں بھی بہت سے عبادتگزار طبقے فرطِ عقیدت میں اپنے پیشواؤں کو یہ مقام دے دیتے رہے۔ کسی پہنچی ہوئی سرکار کا فرمان ان کے لیے مطلق واجبِ اطاعت ہوتا ہے، بغیر یہ دیکھے کہ شرعِ خداوندی سے کوئی بالاتر سند اس ہستی کو اس مسئلہ میں حاصل ہے یا نہیں، اگرچہ اس سے کوئی حرام حلال کیوں نہ ہو جاتا ہو یا کوئی حلال حرام کیوں نہ ٹھہر جاتا ہو۔

(یورپ کی تھیوکریسی یہی تھی جس کی جانب سورۃ التوبۃ کی مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہوا۔ بعد ازاں چرچ اور سٹیٹ میں تفریق کر کے معاملاتِ دنیا سے متعلق عین یہ (تحلیل و تحریم) کا اختیار چرچ کی بجائے سٹیٹ کا تسلیم کر لیا گیا اور اسے ڈیموکریسی کا نام دیا گیا)۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

ہاں یہ معلوم تھا کہ شریعتِ موسوی و عیسوی میں خنزیر کا گوشت حرام ہے، لیکن اپنے پوپوں اور پادریوں کے کہنے پر وہ اسے اپنے اوپر حلال ٹھہرانے لگے۔ یا ختنہ ایسی معلوم شےء کو ساقط کر دینا۔ وغیرہ۔ صرف ایسی دیدہ دلیر deliberate تحریم اور تحلیل کو کہیں گے شرک۔ آج کے مسلم معاشرے میں مثلاً اگر کسی سیاسی مجتہد کے سود کو حلال ٹھہرانے پر آپ سود کو حلال ٹھہرانے لگیں۔ یا کوئی 'پہنچی ہوئی' سرکار مثال کے طور پر پنجوقتہ نمازوں سے اپنے مریدین کو چھوٹ دے ڈالے یا عام مباحات (اسلام کے معروف جائز امور) میں سے کوئی چیز ان پر حرام ٹھہرا دے (جیسا کہ صوفیہ کے بعض بہکے ہوئے طبقوں میں ہوتا ہے) اور اس میں اُس ہستی کی اتباع ہونے لگے۔ کیونکہ سود یا شراب وغیرہ کی حرمت یا نماز اور روزہ وغیرہ کی فرضیت یا عام جائز امور کی اِباحت ضروریاتِ دین (معلوم من الدين بالضرورة) میں سے ہے۔

رہ گیا تحقیقی مسائل میں ائمہ فقہ و سنت میں سے کسی ایک پر انحصار کرنا، تو یہ بالکل اور چیز ہے، اور درست ہے، بلکہ عامی کے حق میں واجب۔ اس بات کو شرک سے جوڑنا سراسر جہالت ہے۔ اسے شرک کہنے والے شخص کا عذر اگر جہالت نہ ہو، تو سب سے بڑھ کر حق بنتا ہے کہ خود اسی کو 'دینِ خداوندی میں تحلیل و تحریم کرنے والا' ٹھہرایا جائے اور اس کی پیروی میں لوگوں کو مشرک ٹھہرانے والوں کو اپنے اِس مفتی کو 'ارباباً من دون اللہ' ماننے والے۔

فصل30

رہبانیت

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءالصِّرَاطِالمُستَقِیم

یعنی دینداری کا ایک ایسا تصور کہ دنیاداری میں پڑنا اور کازارِ حیات میں شریک ہونا آدمی کے حق میں معیوب اور خاص 'مذہبی' اعمال تک محدود رہنا لائق ستائش ٹھہرے۔

نصاریٰ کے متعلق بتایا:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ (الحدید:27)

رہبانیت (ترک دنیا) تو ان لوگوں نے ازخود ایجاد کرلی تھی ہم نے ان پر اسے واجب نہ کیا تھا سوائے اللہ کی رضاجوئی کے۔

جبکہ اِدھر بھی کئی ایک طبقے مسلمانوں میں سے اس بدعتی رجحان کا شکار ہوئے۔ یہ بھی ترک دنیا کو نیکی اور تلاشِ خداوندی کا ذریعہ جاننے لگے۔ (ہنگامہ ٔہائے زندگی، مسائلِ عمران اور سرگرمیِ معیشت وسیاست کو ہاتھ ڈالنے سے ازراہِ 'دینداری' گریز کرنے لگے)۔

"رہبانیت" کا کچھ ذکر شدت پسندی اور دلوں پر وحی کی دھاک کم ہو جانے کے باب میں آگے چل کر بھی آرہا ہے۔

(کتاب کا صفحہ 471تا490)

فصل 31

قبروں پر عبادت گاہیں اور تعمیرات

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءُ الصِّرَاطِ المُستَقِيم

قرآن مجید میں فرمایا:

قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰٓ أَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِم مَّسۡجِدًا (الکھف:21)

جو لوگ اُن کے معاملے پر غالب آئے، بولے "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنا کر رہیں گے"۔

نیز نبی ﷺ کی حدیث ہے:

عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ، ذَكَرَتْ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَنِيسَةً رَأَتْهَا بِأَرْضِ الحَبَشَةِ يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ، فَذَكَرَتْ لَهُ مَا رَأَتْ فِيهَا مِنَ الصُّوَرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: **«أُولَئِكَ قَوْمٌ إِذَا مَاتَ فِيهِمُ العَبْدُ الصَّالِحُ، أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولَئِكَ شِرَارُ الخَلْقِ عِنْدَ اللَّهِ»**

(صحيح البخارى)

روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے ارضِ حبشہ میں کسی (سینٹ) میری نامی چرچ کا ذکر کیا، جہاں انہیں (بڑی بڑی) مورتیں دیکھنے کو ملیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان میں کوئی صالح بندہ وفات پا جاتا تو یہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ تعمیر کر دیتے اور اس میں وہ مورتیں لگا دیتے۔ یہ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔

جبکہ اِدھر یہ حال کہ نبی ﷺ کی اتنی شدید تنبیہ کے باوجود قبروں پر عبادت گاہوں

کی پوری ایک دنیا آباد ہے۔ قبروں پر تعمیر یہ مزارات اپنی رونق اور ٹھاٹ باٹ میں بڑی بڑی مساجد کا مقابلہ کرنے اور ان سے بڑھ کر رَش لینے لگے۔

جس طرح بیت اللہ جانے کی آپ باقاعدہ منتیں مانتے اور وہاں پہنچ کر خدا کے گھر کے چکر لگاتے ہیں، یہاں یہ معاملہ بعض مردہ ہستیوں کے مزارات کے ساتھ ہونے لگا۔ دُور دُور سے سفر کر کے 'حاضری' دے کر آنا! جس طرح خدا کے گھر میں اعتکاف کر کے آتے ہیں، یہاں مزارات کی باقاعدہ مجاورت ہونے لگی۔ بیت اللہ میں سارا سال عمرہ و طواف چلنے کے ساتھ ساتھ، سال کے ایک خاص وقت پر جس طرح ایک مخصوص اکٹھ (حج) ہوتا ہے، 'سالانہ عرس' کی صورت میں یہاں بھی اس کی ایک رِیس ہوئی۔

یہ سب امور نبی ﷺ کے وقت اِس امت میں نہیں تھے۔ یہاں تک کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا تمام تر دورِ سعادت اِس امت کی تاریخ میں یوں گزرا کہ کسی بڑی سے بڑی نیک ہستی کی قبر پر مزار ایسی شےء نام کو نہ پائی جاتی تھی؛ حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بڑے اولیاء امت میں کون ہو سکتے ہیں؟ بڑے سے بڑے ولی کے حصے میں ایک عام سی قبر ہی آتی۔ پورا عالم اسلام ان مشاہد سے یکسر خالی؛ دُور دُور تک ایسے کسی مزار یا درگاہ کا نشان نہ تھا۔ سوائے مساجد کے، مسلمانوں کے ہاں عبادت کے کوئی مراکز تھے ہی نہیں۔ مگر افسوس، جیسا کہ نبی ﷺ پیش گوئی فرما گئے کہ تم بھی گزشتہ امتوں والے کام کرنے لگو گے، دورِ سلف کے مابعد صدیوں میں قبروں پر فلک شگاف تعمیرات کی بھرمار ہوتی چلی گئی۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل 32

صداکاری اور صورت پرستی ہی دین ٹھہرا

ہماری نئی تالیف

اقتضاء الصراط المستقیم

ضالین (نصاریٰ) کے ہاں دین کا ایک بڑا حصہ صداکاری اور صورت پرستی پر مشتمل ہے۔ طرزیں لگانا اور آواز کا رنگ جگانا، نیز حسین صورتوں پر مرنا، اسی کو وہ اصلاحِ قلب کا ایک بڑا ذریعہ اور روحانیت کا اعلیٰ مظہر جانتے ہیں۔ دینداری کا ایک بڑا حصہ چیزوں کو گا گا کر پڑھنے میں ہی پورا کرتے ہیں۔ صبح شام، آوازکاری۔ محفل ہائے سماع۔

اِدھر ہمارے یہاں بھی عین یہی ہونے لگا۔

(یہ ابن تیمیہؒ کے دور کا حال ہے جب ابھی 'لاؤڈ سپیکر' ایجاد نہ ہوا تھا۔ طرز اور آوازکاری میں دین کا ایک بڑا حصہ بھگتا لینا اب مزید رُو بہ ترقی ہے! یہاں تک کہ رات کے آخری پہر، رمضان کے اختتامی عشرے اور لیلۃ القدر کی خاموش ساعتوں میں، جو خدا کے ساتھ سرگوشی کے اعلیٰ ترین لمحات ہوتے ہیں، اِدھر سپیکروں کا آسمان سر پر اٹھا لینا 'عبادت' اور 'طلبِ آخرت'! وجہ یہی کہ شور، ترنم اور چنگھاڑیں خدا کو پانے کا اعلیٰ ذریعہ باور کر لیا گیا۔ صحابہؓ کے ہاں دُور دُور تک ایسی گلوکاری کا تصور نہ تھا)۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل33

اپنے گروہ کے سوا ہر کسی کو ہیچ جاننا

یہود اور نصاریٰ دونوں کا حال یوں بتایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ (البقرۃ:113)

یہود کہتے ہیں کہ نصرانی کچھ نہیں ہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی کچھ نہیں ہیں، حالانکہ یہ سب لوگ (ایک ہی) تورات پڑھتے ہیں۔[1]

---

1 ہمارے کچھ 'روشن خیال' اِس آیت کو بنیاد بنا کر آج اِس بات کو معیوب ٹھہرانے لگے کہ ہم نصاریٰ کو 'خدا کا بیٹا' ماننے ایسا عقیدہ رکھنے پر مستوجبِ ہلاکت یا یہود کو نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان نہ لانے کے باعث ایک گمراہ ٹولہ جانیں! حالانکہ ایسی وعیدیں قرآن میں جابجا درج ہیں اور یہود و نصاریٰ کو سنانے کے لیے ہی بیان ہوئی ہیں۔ اُن کی اِن ضلالتوں کو جو قرآن میں بیان ہوئیں، سامنے لانا غلط کیونکر ہو سکتا ہے؟ سورۃ البقرۃ کی اِس آیت کا مقصود دراصل اہل کتاب کے ہاں پائے جانے والے ایک گروہی زعم اور گھمنڈ کا بیان ہے۔ تفاسیر سے یہی ظاہر ہے۔ ورنہ 'لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ" ایسے عین یہی الفاظ المائدۃ میں قرآن یہود و نصاریٰ کے لیے خود استعمال فرماتا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (المائدۃ:68)

تم فرمادو، اے کتابیو! تم کچھ بھی نہیں ہو جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل

اِدھر ہمارے ہاں بہت سے اہلِ فقہ ایسے ہیں جو صوفیہ اور عباد تنگزار طبقوں کو ہیچ جانیں گے۔ ان کو نرا جاہل سمجھنا اور ان کے راستے میں کسی علم اور ہدایت کا شائبہ تک نہ ماننا۔ دوسری جانب بہت سے صوفیہ اور فقیری و درویشی کی راہ چلنے والے ایسے ہیں جو شریعت اور علم و فقہ پڑھنے پڑھانے والوں کو ہیچ جانیں گے، اور یہ خیال کریں گے کہ ان علوم سے وابستہ لوگ تو نرے خدا سے دُور ہیں۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ کتاب و سنت سے جو چیز اِس فریق کے حق میں جائے وہ بھی اور جو اُس فریق کے حق میں جائے وہ بھی، دونوں قدر کے لائق ہوں اور اس پر دونوں کی کھل کر تعریف ہو۔ پھر کتاب و سنت سے جو چیز اِس فریق کے خلاف پڑے وہ بھی اور جو اُس فریق کے خلاف پڑے وہ بھی، دونوں پر غور و فکر ہو اور اس کی بنیاد پر دونوں کی غلط بات کو غلط مانا جائے اور اس کی صاف مذمت ہو۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا۔ اور بیشک اے نبیؐ! وہ جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اترا اس میں بہتوں کو شرارت اور کفر کی اور ترقی ہو گی۔ تو ایسے کافروں کا تم کچھ غم نہ کھاؤ۔

اِس لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ "تم کچھ بھی نہیں ہو" کا سیاق، جیسا کہ تفسیر طبری اور قرطبی وغیرہ سے واضح ہے، یہود و نصاریٰ کا رسالت محمدی پر ایمان کے مسئلہ میں توریت و انجیل کے لکھے سے اعراض کرنا ہے۔ پس خاص ایسی باتوں کی بنیاد پر جو صاف آسمانی وعیدوں کی زد میں آئیں، اہل کتاب کو "کچھ نہ جاننا" خود قرآنِ مجید ہی کی تعلیم ہے۔ سورۃ البقرۃ کے اس مقام کا اشارہ ایک خاص گروہی نخرہ وزعم کی جانب ہے جس کے تحت یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو 'کچھ نہیں' جانتے تھے: یہاں تک کہ ایک گروہی ضد میں آکر وہ ایک دوسرے کے حق عقیدہ کو جھٹلانے لگتے، جیسا کہ تفاسیر سے ظاہر ہے۔

فصل34

کتاب کے ایک حصے کا دوسرے سے ردّ کرنا

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءالصِّرَاطِالمُستَقِیم

مسند احمد و دیگر میں عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أن نفرا كانوا جلوسا بباب النبي صلى الله عليه وسلم فقال بعضهم: ألم يقل الله كذا وكذا؟ وقال بعضهم: ألم يقل الله كذا وكذا؟ فسمع ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فخرج فكأنما فقئ في وجهه حب الرمان! فقال: " أبهذا أمرتم؟ أو بهذا بعثتم: أن تضربوا كتاب الله بعضه ببعض؟ إنما ضلت الأمم قبلكم في مثل هذا؛ إنكم لستم مما ههنا في شيء، انظروا الذي أمرتم به فاعملوا به، والذي نهيتم عنه فانتهوا عنه

کچھ اصحابؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے در پہ بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ کہہ رہے تھے: بھئی کیا اللہ نے یہ اور یہ نہیں کہا؟ (اس کے جواب میں) کچھ دوسرے کہہ رہے تھے: بھئی کیا اللہ نے یہ اور یہ نہیں کہا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں ان کی بات پڑی۔ آپؐ یوں (غصہ میں) باہر آئے گویا آپؐ کے چہرہ مبارک پر انار کے دانے پھوڑ دیے گئے ہوں، اور فرمایا: کیا تمہیں یہی ہدایت ہوئی ہے؟ یا کہا: کیا تم اسی چیز کے ساتھ بھیجے گئے ہو؟ کہ تم کتاب اللہ کے ایک حصے کو کتاب اللہ کے دوسرے حصے کے ساتھ دے مارو؟ اِسی عمل میں تو پہلی امتیں راہِ راست سے ہٹ جاتی رہیں۔ تمہارے اِس طریقے کو تو (کتاب اللہ کے ساتھ درست معاملہ کرنے) سے کچھ علاقہ نہیں۔ بس یہ دیکھو تمہیں کیا کرنے کا کہا جا رہا ہے اور بس وہی کرو۔ اور جس بات سے روک دیا گیا اس سے رک جاؤ۔

{ دیگر روایات سے واضح ہے، یہ تقدیر کا مسئلہ تھا جس کے ایک ایک (بظاہر متعارض) پہلو پر صحابہؓ کتاب اللہ سے (ایک دوسرے کے مقابلے پر) دلائل پیش کر رہے تھے }۔

اِس مضمون کی کئی ایک احادیث لانے کے بعد ابن تیمیہ کہتے ہیں: اس مضمون کی احادیث حضرات ابو ہریرہ، عمر، عائشہ اور انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں اور یہ ایک نہایت وسیع باب ہے جس کی تفصیل میں جانا یہاں مقصود نہیں۔ یہ احادیث لانے سے یہاں ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ اس بات کی سنگینی واضح ہو جائے کہ یہ امت اس مسئلہ میں پچھلی امتوں کی راہ نہ چلے جبکہ اس پر شدید تنبیہ فرمائی گئی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک واضح کر دیا کہ پہلی امتیں تباہ ہوئیں جب تقدیر کے مسئلہ پر (وارد ایک مضمون کی شرعی نصوص کو دوسرے مضمون کی شرعی نصوص کے ساتھ دے مارنے) پر مبنی بحثیں سامنے آنے لگیں۔ خود اِس امت میں یہاں تک ہوا کہ جیسے مجوس کا عقیدہ رہا ہے کہ نور اور ظلمت کے الگ الگ خدا ہیں، اِسی طرح یہاں افعال العباد خصوصاً شر کا خالق انسان کو قرار دے کر دو خالقوں کا تصور پیش ہونے لگا۔ (غرض ہر موضوع پر دو انتہاؤں میں سے کسی ایک پر چل نکلنے کا عمل بزعمِ خویش 'کتاب اللہ کی راہنمائی میں' انجام پانے لگا! ایک فریق نے ایک قسم کی آیات پکڑ رکھی ہیں اور دوسرے فریق نے دوسری قسم کی؛ اور دونوں قرآن کی مدد سے ایک دوسرے کو مات دینے میں لگے ہیں!)۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں: ان بہت سے لوگوں کا جو بالآخر شرائع کو معطل کر ڈالتے ہیں، ابتداءً یہی طرزِ استدلال رہا ہے۔ جبکہ تمام نصوص کو بیک وقت لے کر چلنا اُن خوش قسمتوں کا شیوہ جو سنت وجماعتِ صحابہؓ کے متبعین رہے۔

ایک دوسرے مقام پر ابن تیمیہ یہ نکتہ اٹھاتے ہیں کہ "کتاب کے ایک حصے کو نظر انداز کر دینا" ہی قرآن کی رُو سے فرقوں کی باہمی لڑائی اور سر پھٹول کا باعث رہا ہے۔ چنانچہ

فرمایا:

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ (المائدۃ:14)

اور جو اپنے آپ کو نصرانی کہتے ہیں ہم نے ان سے بھی عہد و پیمان لیا، انہوں نے بھی جو چیز انہیں یاد کرائی گئی اس کا ایک حصہ فراموش کر دیا۔ تب ہم نے بھی ان کے مابین تا قیامت بغض وعداوت ڈال دی۔

یہاں؛ ابن تیمیہ کہتے ہیں: پورے دین کو لے کر چلنا کبھی تفرقہ کا موجب نہیں ہوتا۔ تفرقہ، دھڑے، ٹولے جب بنیں گے ان کی بنیاد میں یہ ایک ہی بات ہو گی: کتاب اللہ کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے کی قیمت پر اختیار کرنا؛ کوئی کسی حصے کو اختیار کرے گا تو کوئی کسی حصے کو۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل35

اختلاف و تفرقہ

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءالصِّرَاطِالمُستَقِیم

قرآن مجید میں نبی آخر الزمان ﷺ کی امت کو اہل کتاب کے اس مہلک رویے سے یوں متنبہ کیا گیا:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران:105)

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آجانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا، اور اختلاف کیا، انہیں لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔

قرآن مجید میں "اختلاف" دو انداز کا ذکر ہوا ہے:

قرآن میں مذکور اختلاف کی پہلی قسم:

(جس میں اختلاف کرنے والے دونوں ہی فریق مذموم ہوتے ہیں)

یہ قرآن مجید کے اِس مقام پر مذکور ہوا:

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ. إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ (ہود:118-119)

وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے۔ مگر جن پر تمہارے رب نے رحم کیا۔

یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت سے اِس اختلاف سے بچ گئے۔ باقی سب اس اختلاف اور سر پھٹول ہی میں رہیں گے اور ان کا معاملہ کبھی سرے نہ لگے گا۔ یعنی یہ وہ اختلاف ہوا جس میں اختلاف کے سب فریق ہی مذموم ہیں۔ یہ وہ اختلاف نہیں جس میں ایک فریق صحیح اور ایک فریق غلط ہو۔ بلکہ سب کے سب غلط ہوتے ہیں۔

اس (اختلافِ مذموم) کی وجہ:

- کسی وقت فسادِ نیت۔ یعنی نفوس میں پایا جانے والا بغی و حسد۔ ایک دوسرے پر بالاتر ہونے اور دوسرے کو مات دینے کا جذبہ،
- تو کسی وقت ہر دو فریق کا اس معاملے کی حقیقت سے جاہل ہونا جس میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہوتے ہیں،
- یا اُس دلیل سے جاہل ہونا جس کی جانب معاملے کا ایک فریق دوسرے کی راہ نمائی کر سکے۔
- یا ہر دو فریق کا اس بات سے جاہل ہونا کہ (اس مسئلہ میں) دوسرے کے پاس بھی کچھ حق ہے۔

اِس اختلاف کی عملاً دو صورتیں ہیں: (أ) اختلافِ تنوع میں فساد اٹھانا اور (ب) اختلافِ تضاد میں پڑنا۔ ذیل میں ان دونوں کی کچھ تفصیل کی جاتی ہے:

أ۔ اختلافِ تنوع میں فساد اٹھانا:

یعنی

- کسی وقت ہر دو فریق ہی کا قول یا فعل حق ہوتا ہے، مگر وہ پھر بھی جھگڑتے ہیں۔ یہاں ان کا قابل مذمت ہونا 'اختلاف' کر لینے کے باعث نہیں بلکہ "اختلاف میں فساد اٹھانے" کے باعث ہے۔ اِس (اختلافِ تنوع) کی مثال: جیسے قرآن مجید کی متعدد قراءتیں۔ یا اذان کی یا اقامت کی ایک سے زیادہ صورتیں جو نبی ﷺ سے ماثور ہیں۔ یہ سب کی سب شریعت میں وارد ہیں۔ ایسے مسائل میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز دوسری سے افضل ہو، تاہم ایسا نہیں کہ ان میں ایک حق ہو اور دوسرا باطل۔ ان امور میں لڑائی بھڑائی کرنے والے ہر دو فریق غلط ہوں گے۔

- یا ہر دو فریق کے مابین صرف تعبیر کا فرق ہو گا۔ جیسے ایک ہی حقیقت کو مختلف تعریفات definitions سے بیان کرنا؛ جبکہ مضمون کے اعتبار سے بات ایک ہی ہو۔ ان میں لڑائی بھڑائی ہونا ظلم اور جہالت ہے۔
- یا کسی وقت معنٰی میں کچھ فرق ہو بھی تو وہ اس درجہ کا نہیں کہ ایک دوسرے کی نفی ہوتی ہو۔ لیکن اس پر نزاع اس طرح ہو رہا ہوتا ہے گویا ہر دو معنٰی کے مابین ایک صاف نفی اور تصادم ہے۔
- یا کسی وقت یوں ہوتا ہے کہ کسی نے اپنی محنت اور سرگرمی کے لیے نیکی کا کوئی ایک شعبہ اختیار کر لیا تو کسی نے دوسرا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو غلط اور زیادتی کرنے والا باور کرنے لگے؛ اور بس اسی پر نزاع اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ چیز جسے ہم نے اختلافِ تنوع کہا ہے، برائی اس کے ہو جانے میں نہیں۔ بلکہ برائی ہے اس پر فساد اٹھانے اور ایک دوسرے کو غلط یا گمراہ ٹھہرانے میں۔ خوب یاد رکھو: امت میں ہونے والا وہ اکثر اختلاف جو ایک بڑے بغض و عداوت، خونریزی اور ایک دوسرے کا جان مال آبرو مباح کر لینے کا سبب بنا رہا، وہ اختلاف کی یہی قسم ہے۔

ب۔ اختلافِ تضاد میں پڑنا:

اختلافِ تضاد یعنی جہاں ایک قول یا ایک فعل واقعتاً دوسرے کے منافی ہوتا ہے۔ اس کا معاملہ سنگین تر ہے۔ لیکن اکثر جھگڑنے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف کچھ باطل ہے تو کچھ حق بھی ہے۔ تاہم ایک فریق دوسرے کو مطلق غلط ٹھہرانے پر ہی زور لگا رہا ہوتا ہے۔ یوں یہ اُس کا رد کرنے میں کچھ غلط ہوتا ہے؛ اور وہ اِس کا رد کرنے میں کچھ غلط ہوتا ہے۔ اس مصیبت سے بعض اہل سنت طبقے تک چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ (کچھ اہل سنت طبقے بھی کسی کسی وقت اختلاف کی اِس صورت میں جا گرتے ہیں)۔ تقدیر یا صفاتِ خداوندی یا صحابہؓ سے متعلقہ مسائل

میں بسا اوقات یہ مخالف کی غلط بات کا بھی رد کر رہے ہوتے ہیں اور صحیح بات کا بھی۔ فقہ کے مسائل میں بعض فقہاء کے ساتھ بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ مخالف کی غلط بات کے ساتھ ساتھ اس کی ٹھیک بات بھی رد کر گئے۔ رہ گئے اہل بدعت تو ان کا حق کو رد کرنا تو بالکل ہی ظاہر ہے۔

قرآن میں مذکور اختلاف کی دوسری قسم:

(جس میں اختلاف کا ایک فریق قابل ستائش رہتا ہے اور دوسرا قابلِ مذمت)

یہ اس قبیل کا اختلاف ہے جو اہل ایمان و اہل کفر یا اہل سنت و اہل بدعت کے مابین ہوتا ہے۔ اور حق ہے۔ اختلاف کی یہ نوع قرآن میں یوں مذکور ہوئی:

وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ ۚ (البقرۃ:253)

مگر انہوں نے اختلاف کیا، یعنی کچھ ان میں ایمان پر رہے اور کچھ کفر کر گئے۔

اس اختلاف میں البتہ:

) ایک فریق اہل حق ہو گا۔ یہ ہیں:

- انبیاء کے پیروکار، حواریون و اصحاب رضی اللہ عنہم کی راہ پر قائم رہنے والے لوگ۔

) جبکہ دوسرا فریق اہل باطل۔ یہ دو سطحوں پر ہیں:

- امت کے باہر: انبیاء کا دامن تھامنے سے انکاری۔ وقت کے نبی پر ایمان نہ رکھنے والے کافر اور مشرک۔
- اور امت کے اندر: حواریون و اصحاب رضی اللہ عنہم کی راہ سے ہٹ کر راہیں نکالنے والے۔

"اہل اختلاف" یا "اہل فرقہ" کا لفظ اِس سیاق میں اِسی مؤخر الذکر طبقہ پر بولا جاتا ہے (یعنی اہل اسلام کے مقابلے پر بات ہو تو "اہل اختلاف" ہوں گے: کفار و مشرکین۔ اور اہل

سنت و جماعت کے مقابلے پر بات ہو تو "اہل اختلاف" ہوں گے: اہل بدعت)۔ جبکہ اِس اختلاف کا وہ فریق جو (بیرونی سطح پر) انبیاء اور (اندرونی سطح پر) حواریوں واصحابؓ کے راستے پر رہا وہ: "اہل الجماعۃ"۔

خود رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی کہ ایسے بہتّر اہل تفرقہ خود آپؐ کی امت میں پیدا ہو جائیں گے۔ جبکہ اِس تفرقہ سے بچ رہنے والی صرف ایک جماعت؛ اور اس کی نشانی یہ کہ یہ عین اُس راستے پر برقرار رہے گی جس پر دین کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ اور اصحاب رضی اللہ عنہم پائے گئے۔

چنانچہ اس اختلاف کا ایک ہی فریق مذموم ہو گا (اسلام کے مقابلے پر اہل کفر۔ یا پھر سنت کے مقابلے پر اہل بدعت)۔ ان کا اختلاف موجبِ ہلاکت ہو گا۔ جبکہ دوسرا فریق (کفر کے مقابلے پر اہل اسلام۔ یا پھر بدعت کے مقابلے پر اہل سنت) اِس اختلاف کے حوالے سے قابلِ ستائش ہوں گے۔ اِن کا اختلاف موجبِ نجات ہو گا۔

اِس مبحث کے آخر میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

اختلاف کی یہ تمام مذموم صورتیں سورۃ التوبۃ کی اس آیت کے تحت درج ہوں گی: وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا "ویسی ہی بحثوں میں تم (اِس امت کے منافقین) بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ (پچھلے لوگ) پڑے تھے"۔ اس آیت پر پیچھے ہم قدرے تفصیل سے بات کر آئے ہیں۔

واضح رہے، اوپر جو تفصیل ہوئی وہ "دین میں اختلاف" سے متعلق؛ جو کہ اختلاف کی سنگین تر صورت ہے۔ جبکہ نبی ﷺ نے "دنیا میں اختلاف" کی بھی پیش گوئی فرمائی۔ یعنی محض دنیوی محرکات کے تحت اِس امت کے مختلف قوموں، قبیلوں اور جماعتوں کا ایک دوسرے کے شمشیر بکف ہو جانا۔ اِس سے نبی ﷺ نے شدید طور پر متنبہ فرمایا اور اپنے ایک ایک امتی کی جان و مال کی حرمت پر نصوص بیان فرمائیں۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل36

فتنۂ زن وزر؛ جس کے ہاتھوں پہلی امتیں ہلاک ہوئیں

اقتِضَاءُالصِّرَاطِالمُستَقِيم

ہماری نئی تالیف

فی حديث عمرو بن عوف، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: فوالله ما الفقر أخشى عليكم، ولكن أخشى عليكم أن تبسط الدنيا عليكم، كما بسطت على من كان قبلكم، فتنافسوها، كما تنافسوها، فتهلككم كما أهلكتهم. (متفق عليه)

عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث میں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم مجھے تم پر غربت کا ڈر نہیں۔ مجھے ڈر ہے تو یہ کہ تم پر دنیا کے دروازے کھل جائیں جیسے تم سے پہلوں پر کھلے تھے۔ تب تم بھی اس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرو جیسے تم سے پہلے اس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔ تب یہ تمہیں بھی ہلاک کر ڈالے جیسے یہ تم سے پہلوں کو ہلاک کر چکی ہے۔

وفی حديث أبي سعيد، عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه قال: { إن الدنيا حلوة خضرة، وإن الله سبحانه مستخلفكم فيها، فينظر كيف تعملون؟ فاتقوا الدنيا، واتقوا النساء فإن أول فتنة بني إسرائيل كانت في النساء (رواه مسلم)

ابو سعید خدری صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا ایک بڑی مزے کی، لہلہاتی چیز ہے اور اللہ تمہیں اس میں اختیار دے کر چھوڑ رکھنے والا ہے کہ دیکھے تم (اس میں) کیا کرتے ہو۔ پس دنیا سے بچو، اور عورتوں سے بچ کر رہو۔ کیونکہ بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتوں کے معاملہ میں ہی تھا۔

اس مضمون کی کچھ مزید احادیث لانے کے بعد ابن تیمیہ کہتے ہیں: اہل کتاب کی مشابہت اختیار کرنے کے بہت سے کام، خواہ وہ ان کے تہواروں کے معاملہ میں ہو یا دوسرے امور

میں، مسلم معاشروں کے اندر زیادہ عورتوں کی تحریک پر ہی انجام پاتے ہیں۔

ابن تیمیہ کے اِس قول پر، کتاب کے محقق شیخ ناصر العقل حاشیہ لگاتے ہیں:

> مراد یہ کہ عورتیں پرائی ملت کی رِیس اور مشابہت کرنے میں سب سے پہلی اور اس کی سنگینی کا ادراک کرنے میں سب سے آخری مخلوق ثابت ہوتی ہیں۔ فرد اور معاشرے پر اس کے کیسے بھیانک اثرات مرتب ہوں گے؟ اور دین و دنیا میں یہ عمل کیسی تباہ کاریاں لانے والا ہے؟ یہ اندازہ کرنے میں عورتیں (بالعموم) سب سے پیچھے ہوتی ہیں۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں، بد قسمتی سے مغربی فیشنوں اور ماڈلوں کے پیچھے جانے میں ہماری عورتیں سب سے آگے ہیں۔ کافر (مغربی یا ہندو) معاشروں سے در آنے والے طوراطوار اور رسم رواج کو اپنانے میں عورتیں سب سے بڑھ کر محرک ہوتی ہیں؛ جس کے زیرِ اثر یہ (درآمد شدہ طوراطوار) نسل نو کی گھٹی میں بیٹھتی چلے جاتے ہیں۔ معاشرے کے یہ طبقے کافر معاشروں کی کوئی اچھی چیز تو شاید ہی کبھی لیں، بری چیزیں البتہ دھڑا دھڑ لی جارہی ہوتی ہیں۔

(غرض عورتیں، اور ان کے زیر اثر قوم کی الہڑ نسلیں، رہن سہن کے باب میں مغضوب علیہم اور ضالین کی راہ پر آسانی سے جاپڑیں گی۔ جبکہ اہل دانش طبقے فلسفے، افکار اور نظریاتی بدعات و تفرقہ کے باب میں اہل کتاب کے ڈھنگ اختیار کریں گے)۔

اس (فتنۂ زن وزر) کے علاوہ جاہ پرستی اور اقتدار کی دوڑ کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں کہ پہلی امتوں میں اِس چیز نے لوگوں کو آسمانی ہدایت پر چلنے کی روش سے دور کر ڈالا تھا۔ اِس نے اسلامی تاریخ میں بھی جو جو نقصان کیے وہ لائقِ توجہ ہیں۔

اِس (فتنۂ زن وزر و جاہ) کی بابت ابن تیمیہ کہتے ہیں: یہ سب سورۃ التوبہ کی اس آیت کے تحت مندرج ہو سکے گا: فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَاقِهِمْ ”تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے اُن (تم سے پہلوں) نے لوٹے تھے“۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل 37

اہل کتاب کی طرح، دلوں پر کلامِ خداوندی کی ہیبت جاتی رہنا

ہماری نئی تالیف

اقتِضَاءالصِّرَاطِالمُستَقِیم

ابن تیمیہ نکتہ اٹھاتے ہیں: ایک چیز قرآن میں ویسے بھی ذکر کی جاسکتی تھی۔ مگر وہ خاص اِس سیاق میں لاکر فرمائی گئی کہ دیکھنا اہل کتاب کی طرح نہ ہو جانا۔ جس سے ایک تو اہل کتاب کے ساتھ مماثلت ہو جانے سے ڈرنے اور ہوشیار رہنے کا سبق ملا؛ جو کہ اصل ہے۔ دوسرا، اس خاص مسئلہ کا علم ہوا جس نے اہل کتاب کی لٹیا ڈبوئی تھی؛ یعنی دلوں سے وحیِ خداوندی کی ہیبت چلی جانا۔ چنانچہ سورۃ الحدید میں فرمایا:

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (الحدید:16)

> کیا ابھی تک مومنوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ خدا کی یاد کرنے کے وقت اور (قرآن) جو (خدائے) برحق (کی طرف) سے نازل ہوا ہے اس کے سننے کے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں؟ اور یہ اُن لوگوں کی طرف نہ ہو جائیں جن کو (ان سے) پہلے کتابیں دی گئی تھیں: کہ جب ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

یہ چیز جسے قرآن میں "دلوں کی سختی" کہا گیا، اہل کتاب کے حوالے سے (ہمارے لیے بطورِ تنبیہ) کئی مقامات پر ذکر ہوئی:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (البقرة:74)

مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرف سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ

(المائدة:13)

تو ان لوگوں کے عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ یہ اللہ کی باتوں کو ان کے ٹھکانوں سے بدلتے ہیں اور بُھلا بیٹھے بڑا حصہ ان نصیحتوں کا جو انہیں دی گئیں اور تم ہمیشہ ان کی ایک نہ ایک دغا پر مطلع ہوتے رہو گے۔

اِس ”دلوں کی سختی“ کا ایک سبب جو اوپر آیت المائدہ میں بیان ہوا وہ ہے: خدا کی نافرمانیوں کا چلن اختیار کرنا اور خدا کا عہد توڑ دینا۔ یہ یہود کا حال رہا۔ جبکہ نصاریٰ کے ہاں آنے والی ”سختی“ ایک دوسری جہت سے تھی۔ سورۃ الحدید ہی میں آگے چل کر ایک اشارہ ملتا ہے کہ: اس کا ایک اور سبب دین میں ان کا سختی اختیار کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید:27)

اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا، مگر

اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا وہ بھی ادا نہ کیا۔

اِسی نکتہ کی تائید میں، پھر ابن تیمیہ سنن ابی داود کی یہ حدیث لے کر آتے ہیں:

عن سهل بن أبي أمامة، أنه دخل هو وأبوه على أنس بن مالك بالمدينة، في زمان عمر بن عبد العزيز وهو أمير بالمدينة، فإذا هو يصلي صلاة خفيفة، كأنها صلاة المسافر أو قريبا منها، فلما سلم قال: يرحمك الله، أرأيت هذه الصلاة المكتوبة أم شيء تنفلته ؟ قال: إنها للمكتوبة، وإنها لصلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: { لا تشددوا على أنفسكم فيشدد الله عليكم، فإن قوما شددوا على أنفسهم فشدد الله عليهم فتلك بقاياهم في الصوامع والديارات رهبانية ابتدعوها، ما كتبناها عليهم } .

حضرت سہل بن ابی امامہ سے روایت ہے کہ وہ اور ان کے والد حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ہاں حاضر ہوئے، جب آپؓ عمر بن عبد العزیزؒ کے دور میں مدینہ کے گورنر تھے۔ دیکھ کہ آپ رضی اللہ عنہ ہلکی نماز پڑھ رہے ہیں، گویا مسافر کی نماز یا اس سے قریب کی صورت ہو۔ جب سلام پھیرا تو عرض کیا: اللہ آپ پر رحمت فرمائے، کیا یہ فرض نماز ہے یا آپ نے کوئی نفل وغیرہ پڑھے ہیں؟ فرمایا: فرض۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی ایسی ہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے: اپنے آپ پر سختیاں مت کر لینا؛ تب اللہ بھی تم پر سختیاں کر ڈالے گا؛ کیونکہ ایک قوم نے اپنے آپ پر سختیاں کی تھیں تو اب دیکھ لو ان کی باقیات ان خانقاہوں اور دَیروں میں (اور یہ آیت پڑھی): وَرَهۡبَانِيَّةً ابۡتَدَعُوهَا مَا كَتَبۡنَاهَا عَلَيۡهِمۡ ”اور رہبانیت (کی بدعت) جو انہوں نے اپنے پاس سے گھڑ لی ہم نے ان پر فرض نہ کی تھی“۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں: یہ وجہ ہے کہ سورۃ الحدید کے اختتام پر رسولِ آخر الزمان ﷺ کا دامن پکڑنے کی جو خصوصی تلقین ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّـهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّـهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّن فَضْلِ اللَّـهِ ۙ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّـهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّـهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (الحدید:27)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ، اللہ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو، اور تمہارے قصور معاف کر دے گا، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ یہ اس لیے کہ اہل کتاب جان جائیں کہ اللہ کے فضل کی کسی چیز پر ان کا قابو نہیں اور یہ کہ فضل اللہ کے ہاتھ ہے دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

تو یہاں اہل کتاب کے ان ہر دو رویے سے بچنا آگیا۔ اور یہاں رسول آخر الزمان ﷺ کی امت کے حق میں وہ نورِ خداوندی مکمل اور رحمتِ خداوندی دوچند ہو جاتی ہے؛ جس سے اہل کتاب نبی آخر الزمان ﷺ کا دامن نہ تھامنے کے باعث خالی رہتے ہیں۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل 38

کفار سے یارانے۔ نیز امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھنا

ہماری نئی تالیف

اقتضاء الصراط المستقیم

اہل کتاب کی ان دو مذموم خصلتوں سے اِس امت کو یوں متنبہ فرمایا گیا:

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ

(المائدۃ: 78 تا 81)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داوٴدؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا، برا طرز عمل تھا جو اُنہوں نے اختیار کیا۔ آج تم اُن میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلہ میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری اُن کے نفسوں نے اُن کے لیے کی ہے، اللہ اُن پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اُس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی

اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واضح فرمایا کہ بنی اسرائیل لوگوں کا اللہ اور نبی پر ایمان رکھنا نیز نبی پر اترنے والی چیز پر ایمان رکھنا اس بات کو مستلزم تھا کہ وہ کافروں کے ساتھ ولایت نہ رکھتے۔ اب جب انہوں نے کافروں کے ساتھ ولایت (قربت ورفاقت) رکھی تو یہ بات ان کے اللہ، نبی اور کتاب پر ایمان رکھنے کے منافی ہوا۔ خود اہل ایمان کو فرمایا:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ (المجادلۃ:22)

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہل خاندان یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں خبر دار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

چنانچہ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ مومن کبھی کافر سے مودت کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ پس جو کافروں سے تبادلۂ مودت رکھے وہ مومن نہیں رہنے کا۔ کفار سے مشابہت (کفار جیسا بننے اور نظر آنے کے جتن) دراصل اسی مودت کے مظاہر ہیں، جس سے ممانعت ہماری اِس کتاب کا مرکزی مضمون ہے۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

فصل39

حدود قائم کرنے میں، کمزور اور طاقتور کی تفریق

اسی ضمن میں نبی ﷺ کی یہ تنبیہ آتی ہے کہ: ہم پچھلی امتوں کا وہ وتیرہ اختیار نہ کریں جو اُن کے ہاں خدا کی حدیں قائم کرنے میں روا رکھا جاتا۔ یعنی اونچے گھرانوں کے لیے الگ دستور اور نچلے طبقوں کے لیے الگ۔ آپ ﷺ کی تعلیم تھی: سب کے مابین برابری رکھو۔ گو بہت سے سیاسیات و سماجیات کے ماہرین یہ خیال کرتے ہیں کہ سربراہانِ مملکت کو قانون سے چھوٹ حاصل ہونی چاہئے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کر لی تو اسامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اُس کے لیے سفارش کر بیٹھے۔ تب آپ ﷺ نے غضبناک ہو کر فرمایا:

يا أسامة أتشفع في حد من حدود الله ؟ ! إنما هلك بنو إسرائيل أنهم كانوا: إذا سرق فيهم الشريف تركوه، وإذا سرق فيهم الضعيف أقاموا عليه الحد، والذي نفسي بيده لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها

اے اسامہ! کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے اندر سفارش کر رہے ہو؟
بنی اسرائیل اسی لیے تو ہلاک ہوئے تھے کہ جب کوئی اونچا آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے۔

اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کر لیتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔[1]

بنی مخزوم قریش میں چوٹی کے خانوادوں میں سے ایک تھا۔ ان پر یہ بہت گراں تھا کہ اس خاندان کی ایک شریف زادی ہاتھ کٹوا بیٹھے۔ اس پر سفارش آئی تو نبی ﷺ نے امتوں کی بربادی سے متعلق ایک قانون بیان فرما دیا: بنی اسرائیل کی ہلاکت کا ایک باقاعدہ سبب ہی یہ تھا کہ اونچی کلاس کے لوگوں کو یاں مخصوص طور پر سزاؤں سے معافی حاصل رہتی۔ چنانچہ اس مسئلہ کی سنگینی یوں بیان فرمائی کہ یہاں تو آپؐ کی اپنی صاحبزادی بھی (معاذاللہ)

---

1 ہیومن اسٹ الحاد آج اذہان پر جس طرح چھایا ہے، یہاں اس کی کچھ نشان دہی ضروری ہے۔ اوپر کی حدیث، نیز پورے مضمون میں "قانون کی حکمرانی" بھی بے شک بیان ہوئی ہے (بشرطیکہ "قانون" خدا کا نازل کردہ ہو)... مگر آج ایک بڑی تعداد اس حدیث کو محض قانون کی حکمرانی پر چسپاں کرنے لگی ہے اگرچہ وہ قانون خدا کی نازل کردہ کسی بھی بالاتر سند بغیر پاس کیوں نہ ہوا ہو؛ اور اگرچہ وہ قانون کسی وقت خدا کے نازل کردہ سے صاف متصادم کیوں نہ ہو۔ جاہلی صحافت اس حدیث سے ایک خاص 'دستوری سپرٹ' تو خوب ثابت کرتی ہے لیکن پروردگار کے نازل کردہ کو حتمی حیثیت دینے کی سپرٹ جو اِس حدیث کے ایک ایک لفظ سے پھوٹ رہی ہے، اسے صاف گول کر جاتی ہے۔ یہ حضرات بے شک چرچل اور ابراہیم لنکن سے جیسے مرضی اقتباسات دیں، لیکن ان سے ہماری درخواست ہو گی، محمد ﷺ کے آسمانی پیراڈائم سے پھوٹ کر آنے والے کلمات کو اپنے ہیومن اسٹ پیراڈائم میں جڑنے سے احتراز فرمائیں؛ کیونکہ اِس مضمون کا آپ ﷺ کا جو بھی بیان ہے وہ کسی بھی اور بات سے پہلے دراصل اللہ مالک الملک کی تعظیم ہے۔ یہ حدیث جس کا حوالہ یہاں کا ہر چینل دینے بیٹھا ہوتا ہے، اِس کے پہلے جملے پر ہی یہ حضرات کسی وقت غور فرمالیں: يا أسامة أتشفع في حد من حدود الله؟ "اے اسامہ! کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے اندر سفارش کرنے لگے"؟

کوئی ایسا جرم کرلیں تو انہیں کوئی استثناء نہ ملے گا یہ کہ کوئی اور عورت۔

یہی مضمون ہمیں صحیحین کی اس روایت میں ملتا ہے، جو کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

مر على النبي صلى الله عليه وسلم بيهودي، محمَّم مجلود، فدعاهم، فقال: "هكذا تجدون حد الزاني في كتابكم ؟" قالوا: نعم. فدعا رجلا من علمائهم قال: "أنشدك بالله الذي أنزل التوراة على موسى، أهكذا تجدون حد الزاني في كتابكم ؟" قال: لا، ولولا أنك نشدتني بهذا لم أخبرك، نجده: الرجم، ولكنه كثر في أشرافنا، فكنا إذا أخذنا الشريف تركناه، وإذا أخذنا الضعيف أقمنا عليه الحد، فقلنا: تعالوا فلنجتمع على شيء نقيمه على الشريف والوضيع، فجعلنا التحميم والجلد مكان الرجم فقال صلى الله عليه وسلم: "اللهم إني أول من أحيا أمرك، إذ أماتوه". فأمر به فرجم، فأنزل الله تعالى: {يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ} إلى قوله: {إِنْ أُوتِيتُمْ هَذَا فَخُذُوهُ}.

يقول: ائتوا محمدا فإن أمركم بالتحميم والجلد فخذوه، وإن أفتاكم بالرجم فاحذروا، فأنزل الله تعالى: {وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدة: 44). وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدة: 45). وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (المائدة: 43)} في الكفار كلها ".

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک یہودی کو لے کر گزرا گیا، جس کا منہ کالا کر رکھا اور اسے کوڑے مارے گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلب فرمایا اور پوچھا: کیا زانی کی ایسی ہی حد تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ کہنے لگے: جی۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علماء میں سے ایک شخص کو بلایا اور فرمایا: دیکھو میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے توراۃ موسیٰؑ پر اتاری، کیا زانی کی ایسی ہی حد تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ وہ بولا:

نہیں۔ آپ نے مجھے وہ قسم نہ دی ہوتی تو میں آپ کو ہرگز مطلع نہ کرتا۔ پاتے تو ہم رجم (سنگسار کرنا) ہی ہیں۔ مگر یہ (جرم) ہماری اونچی کلاس میں عام ہو گیا تو ایک اونچے آدمی کے گرفتار ہونے پر ہم اسے چھوڑ دیتے اور کوئی کمزور پکڑا جاتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ تب ہم نے کہا: آؤ کسی ایسی شے پر اتفاق کر لیں جسے اونچے اور کمزور دونوں پر نافذ کر سکیں۔ تب ہم نے رجم کی جگہ منہ کالا کرنا اور کوڑے مقرر کر لیے۔ تب نبی ﷺ نے فرمایا: "اے اللہ میں وہ پہلا شخص ہوں جو تیرے دستور کو زندہ کرتا ہے جبکہ وہ اسے موت کی نیند سلا چکے"۔ تب آپ ﷺ نے حکم دیا اور اسے سنگسار کر دیا گیا۔ تب اللہ نے یہ آیات اتاریں: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ سے إِنْ أُوتِيتُمْ هَذَا فَخُذُوهُ تک۔

(إِنْ أُوتِيتُمْ هَذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا "کہتے ہیں یہ حکم تمہیں ملے تو مانو اور یہ نہ ملے تو بچو" کی تفسیر میں) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مراد یہ کہ محمدؐ کے پاس جاؤ۔ اگر وہ بھی منہ کالا کرنے اور کوڑے لگانے کا ہی فرمائیں تو اسے اختیار کر لو۔ اور اگر رجم کا فتویٰ دیں تو بچ نکلو۔ تب اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں: وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدۃ: 44) "جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں بس وہی کافر ہیں"۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدۃ: 45) "جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں بس وہی ظالم ہیں"۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (المائدۃ: 43) "جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں بس وہی فاسق ہیں"۔ یہ سب (آیتیں) کافروں پر ہی ہیں۔

(کتاب کا صفحہ 471 تا 490)

زہد کی بابت ایک غلط فہمی کا ازالہ

حامد کمال الدین

ایمان کا سبق

زہد کسی 'دنیا بیزاری' کا نام نہیں، جیسا کہ بعض کم علموں نے ایک تاثر بنا رکھا ہے...

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ "زہد" ایسے بعض مباحث اس وقت جا کر ہی زیر بحث آنے چاہئیں جب ہم دین اور عبادت کی 'اصل بنیادوں' سے واقف ہو آئے ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے ہاں ہمیں ایسے صحابہؓ بھی نظر آتے ہیں جو بمشکل دو لبادوں میں ملبوس، صفہ پر بیٹھے، کاروبارِ زندگی میں بھی کچھ خاص سرگرم نہیں؛ بلکہ مسجد، علم اور جہاد وغیرہ کی سرگرمیوں تک ہی محدود ہیں اور زیادہ تر ان کی گزر صدقات وغیرہ پر ہی ہوتی ہے۔ جبکہ انہی اصحابِ رسولؐ میں ہم ایسے ایسے اصحابؓ کو بھی دیکھتے ہیں جو کروڑوں اربوں پتی ہیں اور کاروبارِ زندگی میں بھی خوب سرگرم، بلکہ فضیلت میں کئی 'کروڑ پتی' صحابہ کئی 'غیر کاروباری' صحابہ کی نسبت بلند تر درجے پر ہیں، بلکہ عشرہ مبشرہ قریب قریب سبھی کے سبھی ٹھیک ٹھاک کھاتے پیتے تاجر پیشہ لوگ ہیں اور صحابہ کے مابین سب سے افضل... پس "زہد" وغیرہ کی حقیقت اور مفہوم سمجھنے کے لیے صحابہؓ کی وہ مجموعی تصویر ہماری نگاہ سے روپوش نہیں ہو جانی چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے معاشرے کے اندر تشکیل دی تھی اور نہ ہی وہ 'تنوع' نظر انداز ہونا چاہیے جو صحابہؓ کے مابین کمال انداز میں پایا گیا اور جس کو نبی ﷺ نے باقاعدہ برقرار رکھا۔

چنانچہ "زہد" یہ نہیں کہ آدمی حلال اور پاکیزہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام کا درجہ دے لے۔ حلال کمائی کے معاملہ میں بے رغبتی پیدا کر لینا اور کاروبارِ دنیا کے اندر نہایت بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لینا 'زہد' کا ایک نہایت غلط تصور ہے جو بدقسمتی سے یہاں کئی ایک طبقوں کے ہاں بری طرح راسخ ہو گیا ہے۔ حلال کمانا، خدا کے پاکیزہ رزق کی تلاش میں نکلنا اور اس

کے لیے صبح سے شام کر دینی پڑے تو کر دینا، اور اپنی اس کمائی سے والدین، اہل خانہ وغیرہ کے حقوق پورے کرنا، مقدور بھر اس سے صدقہ کرنا، دنیا میں اس مال سے، حسب استطاعت، جہاد اور خدا کے مشن کو تقویت دینا، اور اپنی اس مجموعی روش سے اپنی امت کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا اور اہل اسلام کو ایک بیروزگار اور غیر پیداوار معاشرہ نہ رہنے دینا اور یوں مسلم معاشرے کو ایک باعزت، خودکفیل اور ایک غیر دست نگر معاشرہ بنانے میں مؤثر سے مؤثر تر کردار ادا کرنا... یہ عبادت کی ایک نہایت اعلیٰ و برگزیدہ صورت ہے۔

"زہد"، جیسا کہ سلف سے منقول ہے، یہ ہے کہ 'دنیا' آدمی کے ہاتھ میں ہو نہ کہ دل میں، چاہے وہ کروڑوں کا مالک کیوں نہ ہو۔ اور یہ اسی وقت ہو گا جب اس دل میں کوئی ایسی برگزیدہ حقیقت بسا لی گئی ہو جس کے ہوتے ہوئے 'دنیا' کے لیے اور دنیا کے 'کروڑوں اربوں' کے لیے آدمی کے دل میں کوئی جگہ پائی ہی نہ جائے۔ اربوں کھربوں روپے بھی ہوں تو ان کو سمانے کے لیے 'دل' میں نہیں 'ہاتھ' ہی میں جگہ ملے!

چنانچہ حقیقی زہد جس چیز کا نام ہے وہ دراصل ایمان کے بنیادی حقائق پر محنت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ایک نعمت ہے۔ یہ درحقیقت دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ "زہد" کا کوئی تعلق آدمی کے 'غریب' یا 'مالدار' ہونے کے ساتھ سرے سے ہے ہی نہیں۔ ایک آدمی ارب پتی ہو کر زاہدِ دنیا اور طالبِ آخرت ہو سکتا ہے، جبکہ ایک دوسرا آدمی مفلس ہوتے ہوئے دنیا پرست اور آخرت سے غافل۔ کیونکہ 'زہد' اور 'دنیا پرستی' کا تعلق سراسر 'ہاتھ' یا 'جیب' کے ساتھ نہیں بلکہ 'دل' کے ساتھ ہے اور آدمی کے 'اہدافِ زندگی' کے ساتھ۔

پس 'زہد' ایسی نہایت اعلیٰ حقیقت کا قلب میں جاگزیں ہونا جس بات پر منحصر ہے وہ ہے خدا کی تعظیم۔ وہ ہے مالک الملک کی شان کو جاننا۔ وہ ہے زندگی اور رزق کے مالک سے آگہی پانے پر آدمی کی خوب محنت ہوئی ہونا اور پھر 'آخرت' سے آدمی کا شناسائی پا رکھنا اور آخرت ہی کی طلب کو دل میں بٹھایا ہونا۔

زہد اگر آدمی کی نگاہ میں 'دنیا کا حقیر ہو جانا' ہے، چاہے جتنی بھی ہو... زہد اگر دنیا کا 'دل' سے بے دخل کر دیا جانا ہے، چاہے 'ہاتھ' میں جتنی بھی ہو، اور 'دل' پر پڑنے والی اس کی گرد اور اس کے اثرات کو کھرچ دینا تا کہ اس دل پر خدا کا رنگ ہی گہرے سے گہرا ہوتا رہے، جیسا کہ جنید بغدادیؒ نے "زہد" کی تعریف کی ہے... تو پھر ایک چیز کا 'چھوٹا' اور حقیر ہو جانا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ کوئی اور چیز اس دل میں 'بڑی' اور 'عظیم' ہونے کا مرتبہ حاصل کر گئی ہو، جو کہ 'حقائقِ توحید' ہی کی دین ہو سکتی ہے۔ لہٰذا 'زہد' اگر 'توحید' پر محنت کا ایک طبعی نتیجہ نہیں تو وہ کسی بڑے انحراف کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اور عموماً 'ترکِ دنیا' اور 'رہبانیت' وغیرہ کا ہی کوئی مترادف۔

"زہد" دینی طبقے کو اور پھر پورے مسلم معاشرے کو ایک نہایت بامقصد، عملی، ایثار شعار اور فاعلیت dynamism سے پُر بنا ڈالنے والی ایک برگزیدہ حقیقت ہے نہ کہ دنیا میں 'خدا' کے نام پر پسماندگی، کم دلی، سستی اور کاہلی کا مارا ہوا ایک طبقہ یا ایک تھکا ہارا معاشرہ برآمد کرانے کے لیے وجود میں آنے والا کوئی 'مذہبی' طرزِ عمل!!!

ایمان کے حقائق کو دل میں بٹھانے پر بے تحاشا محنت ہوتی ہے تو تب ہی کہیں جا کر آدمی "زہد" کے معنیٰ تک سے واقف ہو سکتا ہے، درجۂ زہد کو پہنچنا تو اس سے بھی سوا ہے۔

چنانچہ درجۂ زہد یہ ہے، اور جس کو پہنچنے کے لیے آدمی کا بے پناہ زور لگتا ہے، کہ نہ تو دنیا کا آجانا اس کے لیے کوئی بہت بڑی بات رہے اور نہ دنیا کا ہاتھ سے چلی جانا۔ یعنی اس کے لیے 'دنیا' کسی بھی پہلو سے 'بڑی بات' نہ رہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ 'بڑی بات' اس کی نظر میں کوئی اور ہو جائے اور اس کے ہاں اشیاء کو 'ماپنے' کے پیمانے 'آخرت' والے ہوں نہ کہ 'دنیا' والے!

یہ 'پیمانے' بدل جانا ہی زہد کی اصل حقیقت ہے۔ دنیا جتنی بھی بڑی ہو اور جتنی بھی زیادہ حاصل ہو گئی ہو، پیمانہ آخرت کا ہو تو اس میں دنیا بھلا کیا حیثیت رکھے گی!؟

تم اگر ایک حلال پاکیزہ مال کی بابت 'زہد' برتتے ہو... ایک ایسے پاکیزہ مال کی بابت جس کو تم اپنے دین اور اپنی آخرت میں سرفرازی کا ذریعہ بنا سکتے ہو... تم اگر ایسے پاکیزہ مال پر پسینہ بہانے سے احتراز کرنے کو 'خدا کے تقرب کا ذریعہ' سمجھ بیٹھے ہو، تو نہ صرف یہ کہ تم زاہد نہیں ہو بلکہ حقیقی زہد سے آخری حد تک ناواقف بھی ہو۔

تم اگر ایک ایسے منصب اور عہدے کی بابت 'زہد' برتتے ہو جس پر فائز ہو کر معاشرے کے اندر تم حق کا احقاق اور باطل کا بطلان کر سکتے ہو اور اسلام کی قوت اور خلقِ خدا کے فائدہ کا ذریعہ بن سکتے ہو، مگر ایسے منصب یا سماجی مرتبے سے کنارہ کش رہنا ہی تم 'نیکی' سمجھتے ہو، تو تم نہ تو 'نیکی' کے مفہوم سے واقف ہو اور نہ 'زہد' کے معنیٰ و مطلب سے۔

"زہد" دنیا کو رد کر دینا نہیں بلکہ دنیا کو دل میں بٹھانے یا دنیا کو دنیا کے لیے لینے سے انکار کرنا ہے۔ ورنہ تم جانتے ہو ایک نبی اپنے دور کا سب سے بڑا زاہد ہوتا ہے اور تمہارے سامنے یہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے مویشی پوری ایک وادی میں آتے ہیں۔ مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، یہاں تک کہ آپؑ کا لقب ہی 'ابو الضیفان' پڑ جاتا ہے! یہ سلیمان علیہ السلام ہیں جن کے پاس مال دولت کے ڈھیر ہیں، بادشاہت کا منصب ہے اور حرم میں عورتوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ خدا کی پیدا کردہ پاکیزہ نعمتوں کو معیوب ٹھہرانے والا کون ہو سکتا ہے؟

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی زاہد نہیں ہو سکتا۔ مگر تم دیکھتے ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے نو گھر بسا رکھے ہیں اور نو گھروں کے حقوق بدرجۂ اتم ادا کر رہے ہیں۔ آپؐ کی ملکیت میں سو بکریاں ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بکریاں سو سے بڑھ جاتیں تو تب آپؐ ان میں سے کوئی ایک ذبح کر لیتے۔ آپؐ کے اخراجات کے لیے فدک میں زرعی زمین کا ایک قطعہ مختص ہے۔ گھر میں بڑی بڑی دیر تک کچھ نہیں پکتا تو یہ کوئی اس لئے تھوڑی ہے کہ 'ہاتھ' خالی ہے! بلکہ اس لئے کہ 'دل' بڑا ہے!!! النبی أولی بالمؤمنین من أنفسهم یہ خدا کا نبی ہے جس کو مومنوں کی اس سے کہیں بڑھ کر فکر ہے جتنی کہ خود ان کو اپنی یا اپنے

اہل خانہ کی فکر ہو سکتی ہے۔ یہ دنیا کی صالح ترین جمعیت کا قائد ہے اور جماعتوں، تحریکوں اور ’انقلابات‘ کی تاریخ میں سب سے بہتر اور سب سے روشن مثال پیش کر سکنے والا راہنما! لہٰذا اس کے گھر میں مہینوں چولہا نہیں جلتا تو یہ اس کی ان پہاڑ جیسی ذمہ داریوں کی وجہ سے، جن سے خود اس کے سوا کوئی واقف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے گھر میں بھوک بستی ہے تو اس لئے کہ یہ ایک ایسی قیادت کا گھر ہے جو سب کو کھلانے کے بعد کھانا گوارا کرتی ہے... ادھر جاہلوں نے سمجھ لیا کہ یہ ’مال دشمنی‘ اور ’دنیا بیزاری‘ ہے! اور یہ کہ اہلِ اسلام کا حصولِ رزقِ حلال کے محاذ پر جُتنا اور معیشت پر حاوی ہونا ’توکل‘ اور ’زہد‘ کے منافی ہے اور ’آخرت سے بے رغبتی‘!

یہ عبد الرحمن بن عوفؓ ہیں۔ یہ زبیر بن العوامؓ ہیں۔ یہ عثمان بن عفانؓ ہیں۔ یہ سعد بن ابی وقاصؓ ہیں۔ یہ خدیجہ بنت خویلدؓ ہیں۔ یہ ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ یہ عبد اللہ بن عمرؓ اور یہ عبد اللہ بن عباسؓ ہیں۔ لاتعداد صحابہؓ ہیں جو مارکیٹوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ مال و دولت کی ریل پیل ہے مگر دل میں خدا بستا ہے اور زبان پر سوال ہے تو آخرت کا۔ اللہم لا عیش الا عیش الآخرة، فاغفر للأنصار والمهاجرة!!!

امام احمدؒ سے سوال کیا گیا: کیا آدمی مالدار ہو کر زاہد ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، اگر مال کا بڑھنا اس کو خوشی سے بے قابو نہیں کرتا اور مال کا گھٹنا اس کے لیے حسرت کا باعث نہیں بنتا۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: زہد یہ نہیں کہ آدمی مال کو ہاتھ لگانے سے پرہیز کرے یا حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لے۔ زہد یہ ہے کہ جو خیر خدا کے ہاتھ میں ہے اس کا وثوق تمہیں زیادہ ہو بہ نسبت اس چیز کے جو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ کہ مصیبت میں بھی تم اپنے آپ کو خدا کی محبت و قربت کے احساس میں اسی طرح سرشار پاؤ جیسا کہ مصیبت نہ ہونے کے وقت۔ اور یہ کہ تمہاری ستائش کرنے والا شخص اور تمہاری مذمت کرنے والا شخص ہر دو تمہاری نظر میں ایک برابر ہو جائیں۔

(تفصیلی مطالعہ کے لیے ہماری کتاب: ایمان کا سبق)۔

’دنیا کی مذمت‘ سلف کے ہاں کس معنیٰ میں؟

ایمان کا سبق

حامد کمال الدین

جیسا کہ ابن جوزیؒ، ابن قیمؒ، ابن رجبؒ و دیگر سلف کے ترجمان ائمہ ٔعلم کی توضیحات سے واضح ہوتا ہے، سلف ومابعد کے ائمہ ٔ سنت کے ہاں ’دنیا کی مذمت‘ ہوتی ہے تو درحقیقت وہ اس سیاق میں ہوتی ہے:

١. دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا۔ دنیا کی طلب، آخرت کی طلب کی قیمت پر ہونا۔ اس سیاق میں دنیا کی جس قدر مذمت ہوئی، بیان سے باہر ہے۔

٢. دنیا کی طلب میں حرام حلال کا فرق ملیامیٹ کر دینا، جو کہ دنیا کے طلبگاروں کے ہاں اکثر ہوتا ہے۔ اس معنیٰ میں بھی دنیا کی مذمت اہل علم کے ہاں بکثرت ہوئی ہے۔

٣. دنیا کو دنیا کیلئے طلب کرنا، نہ کہ اسکو حق کی قوت اور آخرت میں سرخروئی پانے کیلئے حاصل کرنا۔ دنیا کو بس تکمیل خواہش کا ذریعہ جاننا نہ کہ خدا کی شکر و احسان مندی کا ذریعہ بنانا۔ پس اس معنیٰ میں کہ یہ فی نفسہ آدمی کی مقصود ہو جائے، دنیا سلف کے ہاں نہایت قابل مذمت جانی گئی ہے۔

٤. پھر دنیا میں آرزوؤں کا دراز ہو جانا، "مذمتِ دنیا" کا ایک اور پہلو ہے جو اس باب میں ائمہ ٔسلف کے کلام کی روحِ رواں رہا ہے... اس کا کچھ بیان نیچے کیا جاتا ہے:

’خلود‘ کی طلب انسان کی فطرت کا جزوِ لازم ہے۔ صحت، عافیت، آسودگی، رزق کی فراوانی، بیوی بچوں اور اصحاب احباب کے ساتھ اچھے سے اچھے لمحات، عزت، آبرو، حسن، خوبروئی.... سب نہ صرف یہ کہ اس انسانی مخلوق کے بنیادی ترین مطالب ہیں بلکہ ان چیزوں کا انسان کی دسترس میں رہنا اور کبھی ہاتھ سے نہ جانا اِس کیلئے بے انتہا اہم ہے۔ (خدا کی طلب گو ان سب پر فوقیت رکھتی ہے، دنیا کے اندر بھی اور آخرت کے اندر بھی۔) اسلام

نے چونکہ فطرت کی نفی نہیں کی ہے اس لئے ان چیزوں کی بھی نفی نہیں کی ہے۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ یہ چیزیں اس معنیٰ میں یہاں پائی ہی نہیں جاتیں کہ ان کے ملنے کی انسان کو کوئی ضمانت ہو اور پھر، خصوصاً، ایک ملی ہوئی چیز کے باقی رہنے کی کوئی ضمانت ہو۔ پس یہ چیز یہاں اس دنیا میں کہیں پائی ہی نہیں جاتی۔ نہ ایمان والوں کے لئے نہ ایمان کے منکروں کیلئے۔ جو اس کو یہاں ڈھونڈے وہ درحقیقت احمق ہے، علاوہ اس بات کے کہ وہ ایمان سے بھی محروم ہے۔ پس یہ چیز جس کی ائمۂ سلف کے ہاں 'درازیِ آرزو' کے عنوان کے تحت مذمت ہوتی ہے، یہ ایمان سے محرومیت تو ہے ہی خِرد سے بھی محرومیت ہے۔

پس اسلام نے نفس کے ان مطالب کا انکار نہیں کیا جنہیں خدا نے آپ ہی اِسکی فطرت کا حصہ بنا رکھا ہے۔ اسلام نے کچھ کیا تو وہ یہ کہ انسان کو اِنکے پائے جانے کا "اصل محل" دکھایا ہے اور اس حماقت سے باز رہنے کی تاکید کی ہے کہ وہ انہیں وہاں ڈھونڈے جہاں خدا نے یہ رکھے ہی نہیں۔ اس حماقت کو ہی سلف کی زبان میں طول الأمل یعنی 'درازیِ آرزو' کہا جاتا ہے۔

یہ وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے "زہد" کی تعریف ہی "آرزو کے مختصر ہو جانے" کے الفاظ سے کی ہے۔ کیونکہ جو چیز ابھی ملی نہیں اس کا تو ذکر ہی کیا، جو چیز مل چکی وہ بھی 'دینے والے' نے بڑے ہی وقتی طور پر تمہارے ہاتھ میں چھوڑ رکھی ہے اور یقینی طور پر وہ کسی بھی وقت تمہارے ہاتھ سے 'واپس' لے لینے والا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے تم کسی سے 'ذرا دیکھنے' کیلئے ایک چیز پکڑ کر ہاتھ میں لو، یا کسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اس سے وہ چیز عاریتاً لے رکھو۔ ایسی چیز پر 'دل آجانا' خِسّت اور کمینگی ہے، نیز حماقت اور چیز کے مالک کی نگاہ سے گر جانا.... کہ اُس کا اگر یہ ارادہ ہو بھی کہ یہ چیز وہ تمہیں ہی دے دے، تو تمہاری اس گھٹیا حرکت کو دیکھ کر وہ اپنا ارادہ ہمیشہ کیلئے بدل لے! تم خود کہو گے، ایسی چیز تو 'دل' میں نہیں 'ہاتھ' میں ہی اچھی لگتی ہے!!!

اب چونکہ غلط بات یہ نہیں کہ یہ چیزیں انسان کی ضرورت ہوں؛ اور نہ یہ غلط ہے کہ یہ

انسان کے 'ہاتھ' میں ہوں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے؛ اور نہ یہ غلط ہے کہ انسان ان چیزوں کو 'صاحبِ ملکیت' کی اجازت سے، اور پوری دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ، اپنے معقول مطالب کی تکمیل کیلئے استعمال کرتا ہو، خصوصاً جبکہ 'صاحبِ ملکیت' نہایت فیاض اور بے پرواہو اور خصوصاً جبکہ انسان اس 'صاحبِ ملکیت' سے جب بھی ملے اس پر اس کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولے، اُس کیلئے اپنی احسان مندی بار بار ظاہر کرے اور یہ تو ہر وقت اس کی زبان پر رہے کہ یہ چیز مالک ہی کی ہے اور یہ کہ وہ کبھی اتنا احمق اور کم ظرف ہونے والا نہیں کہ محض اس بات سے دھوکہ کھا کر کہ ایک چیز اس کے 'ہاتھ' میں ہے، جبکہ عنقریب واپس لے لی جانے والی ہے، اس پر وہ اپنا کوئی 'حق' بھی جاننے لگے؛ اور یہ تو کمال ہی کی بات ہے اگر وہ اس چیز کو مالک ہی کے کسی کام میں تندہی کے ساتھ برتتا ہے اور اس پر وہ مالک کا اور بھی شکر گزار ہوتا ہے کہ اُس نے اِسے اپنی خدمت کا ایک موقعہ دیا...!!!

اب چونکہ ان سب باتوں میں حرج کی کوئی بھی بات نہیں، لہٰذا دنیا کو 'ہاتھ' میں کرنے کے یہ سب پہلو ہرگز ہرگز قابلِ مذمت نہیں، بلکہ مستحسن ہیں۔ ائمۂ سنت وعلمائے زہد کے ہاں 'طلبِ دنیا' کو جو بکثرت معیوب ٹھہرایا گیا ہے اور جو کہ بالکل برحق ہے، تو وہ اُن چاروں میں سے کسی ایک لحاظ سے ہے جو پیچھے بیان ہوئے۔ رہا طلب یا حصولِ دنیا کا یہ صالح مفہوم جو اوپر کے پیرے میں بیان ہوا، تو اِس معنیٰ میں دنیا کے وسائل ہاتھ میں کرنا نہایت خوب ہے، مسلم فرد کیلئے بھی اور مسلم معاشرے کیلئے بھی:

عن موسیٰ بن علی عن أبیه، قال: سمعت عمرو بن العاص، یقول: بعث اِلَیَّ رسول الله ﷺ فقال: خذ علیک ثیابک وسلاحک، ثم ائتنی، فأتیته وهو یتوضأ، فصعد فِیَّ النظر ثم طأطأه، فقال: اِنی أرید أن أبعثک علی جیش، فیسلمک الله ویغنمک، و أرغب لک من المال رغبة صالحة۔ قال: قلت: یا رسول الله! ما أسلمت من أجل المال ولکنی أسلمت رغبة فی الاِسلام و أن أکون مع رسول الله ﷺ۔ فقال: یا عمرو، نِعمَ المَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرئِ الصَّالِحِ۔(مسند احمد، صحہ الالبانی)

موسیٰ بن علی اپنے والد سے بیان کرتے ہیں، کہا: میں نے عمروؓ بن العاص کو بیان کرتے سنا، کہا: میرے لئے رسول اللہ ﷺ نے پیغام روانہ فرمایا: اپنا (جنگی) لباس اور ہتھیار پہن کر میرے پاس پہنچو۔ میں آپ کے پاس حاضر ہوا تو آپ وضو کر رہے تھے۔ آپ نے مجھ پر اوپر سے لیکر نیچے تک نگاہ ڈالی، پھر فرمایا: میں تمہیں ایک لشکر کی کمان دے کر (مہم پر) روانہ کرنا چاہتا ہوں، کہ اللہ تمہیں (اس سے) صحیح سالم لائے اور نصرت وغنیمت دے، اور میں تمہارے مال پانے کیلئے بھی خوب طور پر خواہشمند ہوں۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں مال پانے کی خاطر اسلام نہیں لایا، بلکہ اس لئے اسلام لایا ہوں کہ اسلام ہی مجھے مرغوب ہے اور اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت ومعیت پاؤں۔ تب آپ نے فرمایا: یا عمرو، نِعمَ المَالُ الصَّالِحُ لِلمَرئِ الصَّالِحِ۔ اے عمرو! کیا ہی خوب ہے کہ صالح مال ہو اور صالح آدمی کے ہاتھ میں ہو"!!!

یہ حدیث اس صالح معنیٰ پر دلالت کیلئے صرف ایک مثال ہے ورنہ شرعی نصوص میں، اور علمائے سنت کے اقوال وآثار میں، اس کے بے پناہ شواہد موجود ہیں۔ یہاں آنحضرت ﷺ کے یہ الفاظ نہایت قابل توجہ ہیں: "کیا ہی خوب ہے کہ صالح مال ہو اور صالح آدمی کے ہاتھ میں ہو"۔ یہی بات ایک اچھے عہدے کی بابت کہی جائے گی کہ وہ صالح آدمی کے پاس ہو تو کیا ہی خوب ہے۔ یہی بات سماجی رتبے کے بارے میں کہی جائے گی اور یہی بات دنیا میں پائی جانے والی خدا کی اور بہت سی نعمتوں پر صادق آئے گی۔ 'صالحین' کے ہاتھ میں تو پوری دنیا آجائے تو یہ ایک بڑی نعمت ہے، صالحین کے حق میں بھی اور خود اس 'دنیا' کے حق میں بھی!

اب چونکہ غلط بات یہ نہیں کہ یہ چیزیں انسان کے 'ہاتھ' میں ہوں؛ غلط صرف یہ ہے کہ ان پر انسان کا 'دل' آجائے؛ کیونکہ بنانے والے نے دنیا کا نقشہ بنایا ہی کچھ اس طرح ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ 'دل' لگانے کی گنجائش نہیں؛ اس لئے ان چیزوں کو دل کا راستہ دکھانا سلف کے ہاں مذموم جانا گیا ہے اور اسی چیز کو 'درازیِ آرزو' یا 'خواہشِ دنیا' کا نام دیا گیا۔

دراصل انسان کے اندر 'نفس' کی کچھ ایسی ساخت کی گئی ہے کہ یہ ان فانی و وقتی اشیاء سے ہی چپک چپک جاتا ہے اور ان کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ یوں یہ نادان، 'دل' کیلئے اس کا سفر جاری رکھنا مشکل کر دیتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک لمبے سفر پر گامزن شخص کسی گھنے سائے کے نیچے دو ٹک آرام کرے اور 'منزلِ شوق' پر پہنچنے کیلئے اسے پھر آگے چل دینا ہو۔ 'دل' جانتا ہے 'منزل' کی کیا اہمیت ہے اور یہ 'سایہ' کتنا بھی سہانا اور خواب آور ہو، اس کے بیٹھ رہنے کیلئے قابل التفات نہیں۔ مگر 'نفس' ہے جو منزل کے حسن و اہمیت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے اور اس گھنے سائے کی جانب ہی کھنچا جاتا ہے۔ یہ 'تپتی دھوپ' میں سفر جاری رکھنے سے بھاگتا ہے اور اس 'آرام دہ پیڑ' کے نیچے ہی ہمیشہ کیلئے رہ جانا چاہتا ہے حالانکہ اس پیڑ کا سایہ مسلسل جگہ بدلتا جا رہا ہے اور چند ساعتوں میں بالکل روپوش ہو رہنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہاں اندھیری رات پڑ جانے والی ہے؛ اور یہ دشت ایسا کہ جس مسافر کو یہاں اس حالت میں رات پڑ جائے اسے اگلی صبح دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ بلکہ 'اگلی صبح' یہاں اس دشت کی قسمت میں ہے ہی نہیں صرف رات ہے، جس میں 'سائے' اپنی سب اہمیت کھو دیتے ہیں۔ بلکہ اپنی حقیقت کھو دیتے ہیں! کسی خردمند کو 'اگلی صبح' دیکھنے میں دلچسپی ہے تو اس کو آج ہی دِن دِن یہ دشت چل کر اُس 'پہاڑ' کے پار جانا ہے؛ جو کہ آدمی ذرا ہمت سے چل لے تو بہت دور نہیں۔ ہاں اُس پار نہایت خوب سبزہ اور آبشاریں ہیں، میٹھی شفاف نہریں ہیں، میووں سے لدے پیڑ ہیں، مخملیں نشستیں ہیں، لطف کے جام چلتے ہیں، سرود کی انتہا نہیں، کمال کے دوست احباب جمع ہیں، وہ بیٹھکیں ہیں جو اجڑتی نہیں، ایسے میلے ہیں جن کی شام نہیں، مِلن ہیں جن کے بچھڑنے کا نام نہیں؛ ہاں وہاں ہیں وہ سائے جو سمٹتے نہیں، اور وہ گھر جو اجڑتے نہیں، اور وہ ساتھ جو ٹوٹتے نہیں، اور وہ مزے جو ختم نہیں ہوتے۔

دل کے حق میں اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دشت میں بیٹھا، ایک سمٹتا سایہ دیکھ کر نفس کے چاؤ پورے کراتا رہے اور اسی میں سارا 'دن' پار کر دے، اور یوں اسی

اجاڑ بیابان میں اس کو وہ 'رات' آلے جس کی کوئی صبح نہیں۔ یہاں، دل اگر عقلمندی سے کام لیتا ہے؛ اور راستے کی سب سہولتوں کو، اپنے اس سفر کو نہایت خوشگوار اور کامیاب بنانے کے کام لے آتا ہے، البتہ 'سفر' کسی ایک لمحہ کیلئے بھی اسکی نظر سے روپوش نہیں ہوتا، تو اس کا راستے کی کسی چیز سے دل نہ لگانا اور نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی راہ چلتے چلے جانا "زہد" کہلائے گا۔ اور اگر وہ نادانی اور حماقت کا شکار ہوتا ہے اور راستے کی آسائشوں کو ہی دل دے بیٹھتا ہے؛ جس سے منزل پہ پہنچنے کا عمل متاثر ہوتا ہے، تو اس کو "درازیِ آرزو' اور 'خواہشِ دنیا' کہیں گے۔

یہ بھی جان لو کہ: تعلیم اور ارشاد کا معاملہ ہو تو اور بات ہے، ورنہ جو آدمی صحیح معنیٰ میں زاہد ہے وہ دنیا کی چاہت تو کیا کرے گا، دنیا کی مذمت کرنے اور اس کو برا بھلا کہنے میں بھی ہرگز وقت برباد نہیں کرے گا۔ وہ تو سیدھا اپنی راہ چلتا ہے اور اس کی نظر اپنی منزل پر ہوتی ہے۔ دائیں بائیں دیکھنے کیلئے اس کے پاس زیادہ وقت ہی نہیں ہوتا۔ وہ دنیا کو اپنے اس سفر آخرت کا توشہ بنانے کی تو ہر تدبیر کرتا ہے اور اس معنیٰ میں 'مقاصدِ خیر' کیلئے دنیا کے تمام تر ذرائع کو مسخر کر رکھنے کی بھی فکر میں رہتا ہے، کیونکہ یہ اس کے اس اخروی مشن ہی کا حصہ ہے۔ البتہ وہ اس دنیا کو فی نفسہ کسی قیمت کی نہیں جانتا۔ وہ اس کو اس قابل تک نہیں جانتا کہ وہ اس کو برا کہنے میں اپنا وقت صرف کرے۔

دنیا کو صبح شام دشنام دینا بھی دراصل انسان کے اندر کا ایک کھوکھلا پن ہے اور بسا اوقات 'محرومیت' کا ایک اظہار ہوتا ہے، گو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ 'زہد' کی راہ پر ہے!

یحیی بن معاذؒ کہتے ہیں: دنیا ایک بھدی دلہن ہے۔ جو اس کا 'طالب' ہے وہ احمق اس کی غزلیں کہنے اور اس کے بناؤ سنگھار کرانے میں لگا ہے۔ جو سطحی قسم کا 'زاہد' ہے وہ نادان گویا اس سے تنگ آیا ہوا ہے، بڑی تن دہی کے ساتھ اس کو کوسنے میں لگا ہے اور اس کا منہ کالا کرنے اور کھینچ کھینچ کر اس کے بال اکھاڑنے اور کپڑے پھاڑنے کے درپے ہے اور سمجھتا ہے کہ اصل نیکی یہی ہے۔ جبکہ وہ شخص جو اصل 'عارف' ہے اس کے پاس ان سب باتوں کیلئے

وقت ہی نہیں؛ اس کی کل توجہ اور مصروفیت خدا کے ساتھ ہے!

چنانچہ ''زہد'' کسی 'منفیت' یا کسی 'مردہ دلی' یا کسی 'محرومیت' کا نام نہیں۔ یہ ایک زبردست ''فاعلیت'' کا نام ہے جو پوری انسانی زندگی اور انسانی نشاط کو آخرت کے دھارے میں لا رکھنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ ''زہد'' دنیا کو ترک کرنے کا نام ہے اور نہ دنیا سے متنفر ہونے کا اور نہ دنیا سے فرار اختیار کرنے کا۔ ''زہد'' کا مطلب دنیا سے خالی رہنا نہیں۔ ''زہد'' تو درحقیقت دنیا سے آخرت کیلئے جھولیاں بھر بھر کر لے جانے کا نام ہے۔ کوئی سمجھے تو ''زہد'' دراصل دنیا کو ''آخرت کی کھیتی'' بناڈالنا ہے۔ بے انتہا محنت!

دنیا کی وقعت دیکھنا چاہتے ہو تو سید المرسلین ﷺ کی زندگی دیکھو۔ آخرت کے اندر مقامِ محمود پر جا پہنچنے والا اور بہشت میں سب سے اونچے محلات کا مالک، تاریخ کا یہ عظیم ترین انسان، یہاں دنیا کے اندر اپنے پھٹے ہوئے لبادے پر خود اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتا ہے اور پھر اس کو خدا کا شکر کرکے پہن لیتا ہے۔ اپنے جوتے کو جو ٹوٹ گیا ہے، خود ہی مرمت کر لیتا ہے۔ اپنی بکری کا دودھ خود دھوتا ہے۔ گندم تو گندم، جو کے آٹے سے مسلسل دو روز تک سیر ہونے کا واقعہ اس کی زندگی میں کبھی پیش آتا ہی نہیں، تا آنکہ الرفیق الاعلیٰ سے جا ملنے کا دن آجاتا ہے۔ ایک چاند گزرتا ہے، پھر دوسرا چاند گزر جاتا ہے، تیسرا چاند چڑھ آتا ہے، گھر میں چولہا نہیں جلتا۔ چند کھجوریں، کچھ گھونٹ پانی اور پھر خدا کی حمد اور تعریفیں!!! لمبے قیام، طویل سجدے!!! جہاد میں مشغول!!! غزوۂ خندق میں اِس کے پیروکار پیٹ پر پتھر باندھ کر نکلتے ہیں تو اِس کے اپنے پیٹ پر دو پتھر بندھے دیکھے جاتے ہیں!!! خندق کھودتے ہوئے اِس کے ساتھی پسینے میں شرابور ہیں تو یہ بھی گینتی پکڑ کر پتھریلی خندق میں اترا، خدا کی تکبیریں بلند کرتا دیکھا جاتا ہے۔ بھوک سے بے حال، طلبِ آخرت سے سرشار، خندق کھودتے گرد میں اٹے، اِس کے اصحابؓ نشید گاتے ہیں تو یہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے: ''خدایا! ہم عیش مانگیں تو آخرت کے عیش..''!

(تفصیلی مطالعہ کے لیے ہماری کتاب: ایمان کا سبق)

مطبوعات ایقاظ منگوانے اور دیگر مراسلت

کے لیے براہِ کرم

ای میل استعمال کیجئے: matbooateeqaz@gmail.com

فیس بک پر طلب فرمائیے: https://www.facebook.com/matbooat.eeqaz

ڈاک کا ذریعہ اختیار کیجئے: Post Box No. 10262. Lahore

البتہ فون اور ایس ایم ایس پر آپ کے آرڈر لینا ہمارے لیے کسی وقت مشکل ہو جاتا ہے؛ اور آپ کو شکایات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ پریشانی سے بچنے کے لیے ڈاک یا الیکٹرانک میل کا ذریعہ ہی اختیار کیجئے۔

سٹاک میں موجود کتب اور پمفلٹس:

مفہومات	دعوت کا منہج کیا ہو
مضامینِ رمضان	مسلم ہستی کا اِحیاء
فہمِ دین کا مصدر	شرکِ اکبر کا بیان
شروط لا الہ الا اللہ	شرکِ اصغر کا بیان
نواقض اسلام	توحید کے تین اساسی محور
ایمان کا سبق	دین کی ابجد (رسائلِ توحید)
اصولِ ثلاثہ	یہ گرد نہیں بیٹھے گی (ناموسِ رسالت)
مسجد اقصیٰ ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا مسئلہ	روبہ زوال امریکن ایمپائر
فتنۂ ہیومن ازم	الجماعۃ کا مفہوم
مسلم معاشرے پڑھے لکھے بھیڑیوں کے نرغے میں	شرح دعائے قنوت